بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تفسیر مظہری جلد ششم

تالیف

حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ عثمانی مجددی پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ متن

ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ

ترجمہ تفسیر

زیر اہتمام: ادارہ ضیاء المصنفین ۔ بھیرہ شریف

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور۔کراچی۔پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب	تفسیر مظہری (جلد ششم)
تالیف	حضرت علامہ قاضی محمد ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ
ترجمہ متن	ضیاء الامت حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری رحمۃ اللہ علیہ
مترجمین	الاستاذ مولانا ملک محمد بوستان، مولانا سید محمد اقبال شاہ
	مولانا محمد انور مگھالوی
	فضلاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ بھیرہ شریف
تعداد	ایک ہزار
اشاعت	دسمبر 2002ء (رمضان المبارک 1323 ہجری)
کمپیوٹر کوڈ	1Z348

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔7221953

9۔الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔7225085-7247350

فیکس:۔042-7238010

14۔انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون:۔021-2210212-2212011-2630411

e-mail:- zquran@brain.net.pk

Website:- www.ziaulquran.com

فہرست

سورۂ کہف
اصحاب رقیم کا قصہ (حدیث) 14
اصحاب کہف کا قصہ 15
حضرت معاویہ کا اصحاب کہف کے غار پر جانا 29
صوفی تمام میں موجود ہوتے ہوئے بھی ان سے الگ ہوتا ہے 31
مسئلہ: اولیاء کے مزارات کے قریب مساجد بنانا جائز ہے 32
مسئلہ: قبور کو پختہ کرنے کی ممانعت اور قبور پر بیٹھنے اور ان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھنے کی ممانعت 32
ان شاء اللہ کے بغیر یہ کہنا کہ کل یہ کام کروں گا مناسب نہیں 34
اگر شروع میں ان شاء اللہ کہنا یاد نہ رہا تو بعد میں ان شاء اللہ کہہ لینا چاہئے 35
جہنم کے پردوں کا ذکر 40
مآء کا لمھل کا بیان 40
حدیث: اہل جنت کے لباس اور زیورات کا بیان 41
حدیث: سبز رنگ حضور سید عالم ﷺ کا محبوب رنگ تھا 42
حدیث: اچھی چیز دیکھ کر (ماء شاء اللہ لا قوۃ الا باللہ) کہنے سے اسے نظر نہیں لگے گی 46
حدیث: باقیات صالحات سے کیا مراد ہے؟ 49
حدیث: حقیر گناہوں کو حقیر نہ سمجھنا چاہئے 52
حدیث: قیامت کے دن لوگوں کی تین پیشیاں ہوں گی پہلی دو پیشیاں جھگڑے کیلئے ہوں گی جبکہ تیسری پیشی پر اعمال نامے اڑ کر ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے 53
حدیث: تمام اعمال نامے عرش کے نیچے ہوں گے 53
حدیث: ابلیس کی اولاد اور وضو اور نماز میں بہکانے والے شیاطین کے نام 55
حدیث: نبی کریم ﷺ کا حضرت علی اور حضرت فاطمہ سے فرمانا کہ تم تہجد کی نماز نہیں پڑھتے 57
حضرت موسیٰ کا حضرت خضر کی تلاش میں نکلنا (قصہ) 61
مسئلہ: مفضول کو کبھی فاضل پر جزئی فضیلت ہوتی ہے 66
مسئلہ: فاضل کو چاہئے کہ مفضول سے فضل کو حاصل کرے اور اس میں شرم محسوس نہ کرے 66
حدیث: حکمت مومن کی گمشدہ میراث ہے جہاں پائے حاصل کرے 66
مسئلہ: استفادہ کیلئے ضروری ہے مسلک ایک ہو، اطاعت کاملہ ہو نیز مرشد پر اعتراض نہ کیا جائے۔ 67
مسئلہ: اگر کسی ولی سے امر غیر شرعی سرزد ہو تو اس کا رد کیا جائے گا مگر ولی کا انکار نہ کیا جائے گا 67
مسئلہ: جہاں تک ہو سکے اولیاء کے افعال کی شرعی تاویل کی جائے ورنہ اپنی ناقص فہم کا اعتراف کر لیا جائے 67
مسئلہ: اشیاء کے وجود سایہ اور ظل ہیں ان اعیان ثابتہ کا جو اللہ تعالیٰ کے مرتبہ علم میں ہیں۔ 76

حضرت خضر کی حیات اور موت میں بحث 81
یاجوج ماجوج کا بیان 87
یاجوج ماجوج کی اقسام 88
حدیث: یاجوج ماجوج کا خروج 91
حدیث: دجال کا خروج 92
حدیث: عقل مند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو قابو میں
کیا اور آخرت کیلئے توشہ تیار کیا اور بے وقوف ہے وہ
جوخواہشات نفسانیہ کے پیچھے پڑا رہا 96
قیامت کے دن کافروں کے اعمال ناموں کا وزن اور
ان کے متعلق علماء کے مختلف اقوال 97
حدیث: جنت فردوس کا بیان 97
حدیث: شرک اصغر یعنی ریا کا بیان 101
فصل: سورۂ کہف کے فضائل 103
سورۂ مریم
انبیاء کرام میراث میں مال نہیں چھوڑتے (حدیث) 107
صدیق کے مقام ومرتبہ کا بیان 127
حدیث: قرآن پڑھتے ہوئے رویا کرو اور اگر رونا نہ
آئے تو رونے والوں کی طرح بن جاؤ۔ 137
حدیث: غیّ جہنم کا ایک دریا ہے یا اس کی ایک وادی 138
حدیث: سب لوگ دوزخ میں آئیں گے پھر اللہ
متقین کو نجات عطا فرمائے گا۔ 148
دوزخ میں وارد ہونے کی تشریح 148
حدیث: متقی قیامت کے دن سوار ہوں گے جبکہ
کافروں کو منہ کے بل پیدل چلایا جائے گا 155
حدیث: میں جس کا مولیٰ ہوں، علی اس کا مولیٰ ہے 161
حدیث: علی کا ذکر اور ان کی محبت عبادت ہے 161
حدیث: جب اللہ تعالیٰ کسی بندہ سے محبت کرتا ہے تو
جبریل سے فرماتا ہے تو بھی اس سے محبت کر 161
سورۂ طٰہٰ
زمین مچھلی کی پشت پر ہے (تفصیل) 166
نماز کی فضیلت اور اہمیت 170
انا عند ظن عبدی بی کی تشریح 171
وحی اور اور نبوت تشریعی انبیاء کے ساتھ خاص ہے اور
اس نبوت کا خاتمہ خاتم النبیین پر ہوگیا
کمالات نبوت اولیاء کو حاصل ہوسکتے ہیں 181
اصالت طینت اور اصالۃ کبریٰ کا ذکر حضرت مجدد نے
کس کا دعویٰ کیا تھا 193
''نبوت سے ولایت افضل ہے'' غلط ہے 207
عروج ونزول کی تحقیق 207
قدر ضرورت سے زائد عمارت کا بوجھ انسان پر ہوگا 215
حضرت آدم کا قصہ 222
نسیان آدم کی وجہ سے اولاد آدم نسیان میں مبتلا ہے 224
حدیث: حضرت آدم اور حضرت موسیٰ کا مباحثہ 224
حدیث: میری امت سے بھول چوک اٹھالی گئی ہے 225
کافر کی تنگ زندگی کا بیان 227
مسئلہ: نماز میں سورۂ فاتحہ کی قرأت 231
مسئلہ: سورۂ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں 231
اللہ کو ماننا ہر عقل مند پر واجب ہے اور انکار مستحق
عذاب بناتا ہے 235

سورۂ انبیاء

ذکر الٰہی میں مستغرق بندہ کا فعل اللہ کا فعل ہوتا ہے 246

میزان سے کیا مراد ہے؟ 260

حضرت ابراہیم نے سوائے تین مقامات کے کبھی ظاہراً بھی جھوٹ نہیں بولا (حدیث) 267

حضرت ابراہیم کے آگ میں ڈالنے کا واقعہ 269

شام کی فضیلت اور برکات 273

حضرت داؤد اور سلیمان کا ایک کھیت کے بارے میں فیصلہ 277

مجتہد کیلئے دوہرا اجر ہے 280

حضرت سلیمان کا قصہ 282

حضرت ایوب کا قصہ 284

حضرت ایوب کتنی مدت دکھ میں رہے کب دعا کی اور کیوں کی 290

ذوالکفل پیغمبر تھے یا نہیں --علماء کا اختلاف 296

حضرت یونس کا قصہ 297

یاجوج ماجوج کا ذکر 304

تخلیق انسانی کی بحث 310

کیا گناہ گار مومن جنت میں داخل نہ ہوں گے 311

میں ہادی اور رحمت بنا کر بھیجا گیا ہوں عذاب بنا کر نہیں (حدیث) 312

فرقہ باطنیہ اور شیعہ کے قول تقیہ کی تردید 313

سورۃ الحج

زلزلہ قیامت کا بیان 315

بعث النار کا بیان 317

غزوۂ بدر کے دن حضرت علی اور حضرت حمزہ رضی اللہ عنہما کی مبارزت کا بیان 331

آگ کے لباس کا بیان 333

اہل جنت کے زیورات اور لباس کا بیان 336

مسئلہ: کیا مکہ مکرمہ کی زمین کو بیچنا جائز ہے؟ 340

کیا سرزمین مکہ اپنے باسیوں کی ملکیت ہے یا نہیں؟ 342

حرم پاک میں ظلم والحاد کا حکم؟ 344

حضرت مجدد الف ثانی نے فرمایا کعبہ معظمہ ایسی شئ کے مشابہ ہے جو بے کیف ہے 347

حدیث طیبہ: اے لوگو! اللہ تعالیٰ نے تم پر حج فرض کیا ہے لہٰذا تم حج کرو۔ الحدیث 348

مسئلہ:۔ پیدل چل کر حج کرنا افضل ہے 348

حدیث طیبہ: جس نے اللہ تعالیٰ کی رضا کیلئے حج کیا اسے چاہئے کہ وہ رفث نہ کرے 349

مسئلہ: کیا نفلی یا نذر مانی ہوئی قربانی کا جانور یوم نحر اور ایام تشریق میں ذبح کرنا شرط ہے؟ 350

مسئلہ: قربانی یا نفلی قربانی کا گوشت کھانا جائز ہے لیکن ایسے جانور کا گوشت کھانا جائز نہیں جو شکار کی جزاء، جنایت کی جزاء یا حج اور نذر کو فاسد کرنے کے سبب ذبح کرنا لازم ہو۔ نفلی اور حج قران کے دم کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے 350

مسئلہ: رمی، حج قران کرنے والے کی قربانی، حلق اور طواف کے درمیان ترتیب واجب ہے۔ 353

حج اور عمرہ کے دوران حلق کرانے کے مسائل کا بیان 355

نذر کی اقسام اور ان سے متعلق احادیث کا بیان 358

طواف کی اقسام، شرائط اور اس کے ارکان سے متعلق مسائل کا بیان 389
حدیث طیبہ: جھوٹی شہادت اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے کے مساوی ہے 404
مسئلہ: کیا قربانی کے جانور پر سوار ہونا یا اس کا دودھ دوہنا وغیرہ جائز ہے؟ 405
مسئلہ: حرم پاک میں جہاں چاہے قربانی کا جانور ذبح کرنا جائز ہے 406
مسئلہ: ذبح کرتے وقت اللہ تعالیٰ کا ذکر شرط ہے 408
مسئلہ: گائے اور اونٹ میں سے بدنہ کا بیان 409
مسئلہ: ذبح اور نحر کرتے وقت کیا کہا جائے گا؟ 410
مسئلہ: اہل حرب کی عورتوں، بوڑھوں، راہبوں، اندھوں، اور ذمیوں کو قتل کرنا جائز نہیں 414
مسئلہ: مرتدہ عورت کو قتل کرنا جائز نہیں 414
مسئلہ: اگر امام وقت نے کسی مصلحت کے تحت حربیہ یا مرتدہ کو قتل کرنے کا حکم دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں 416
حدیث طیبہ: فقراء اغنیاء سے پانچ سو سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے 423
حدیث طیبہ: میری اور اس دین کی مثال جس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے مجھے مبعوث فرمایا اس آدمی کی طرح ہے جو کسی قوم کے پاس آیا الحدیث 424
حدیث طیبہ: اسلام پہلے گناہوں کو مٹا دیتا ہے 425
حدیث طیبہ: میری مثال اس آدمی کی طرح ہے جس نے آگ روشن کر رکھی ہو۔ 425
انبیاء و رسل علیہم السلام کی تعداد کا بیان 427
اس کا بیان کہ جنت میں داخلہ اللہ تعالیٰ کے فضل کے ساتھ ہوگا نہ کہ اعمال کے ساتھ اور اعمال کے سبب اہل جنت کے درجات متفرق ہوں گے۔ 432
حدیث طیبہ: نبی علیہ السلام کی طرف وحی کی گئی کہ آپ اپنی امت کے اہل طاعت سے کہیں کہ وہ اپنے اعمال پر بھروسہ نہ کریں اور نہ ہی مایوس ہوں (الحدیث) 444
حدیث طیبہ: ابن آدم کیلئے تین دواوین نکالے جائیں گے (الحدیث) 444
مسئلہ: سورۂ حج کے دوسرے سجدہ میں علماء کا اختلاف 444
مسئلہ: جہاد اکبر کی تحقیق اور اس سے متعلقہ بیان 446
ریا اور سمعہ کا بیان 447
نبی کریم ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام کے مجتبیٰ ہونے کا بیان 448
مسئلہ: تکالیف کی کلفت کو دور کرنا اجتباء کے لوازم میں سے ہے 449
اس کا بیان کہ لوگ قریش کے تابع ہیں اور حدیث طیبہ میں تمہارے لئے والد کے قائم مقام ہوں 449
اس کا بیان کہ حضور نبی کریم ﷺ کی امت قیامت کے دن عام لوگوں کے خلاف شہادت دے گی 451
کتاب و سنت کو مضبوطی سے تھامنے اور بدعت سے اجتناب کرنے کا بیان 451
سورۃ المومنون
اس کا بیان کہ جنت نے کہا۔ قَدۡ اَفۡلَحَ الۡمُؤۡمِنُوۡنَ 454
نماز میں خشوع اختیار کرنے، اپنی نگاہ محل سجود پر رکھنے اور ادھر ادھر توجہ نہ کرنے کا بیان 455

متعۃ النساء کا بیان 458
حدیث طیبہ: قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کے بارے حساب لیا جائے گا اگر فرائض میں کمزوری ہوگی تو اسے نوافل کے سبب پورا کیا جائے گا پھر اسی طرح زکوٰۃ کا حساب لیا جائے گا۔ الحدیث 459
حدیث طیبہ: ہر انسان کیلئے ایک ٹھکانا جنت میں ہے اور ایک جہنم میں۔ جو جہنم میں داخل ہوگا تو اہل جنت کو اس کے گھر کا وارث بنا دیا جائے گا۔ 460
حدیث طیبہ: جس نے اپنے وارث کو میراث سے محروم کیا اللہ تعالیٰ جنت سے اس کی میراث کو ختم کر دے گا 460
حدیث طیبہ: تم میں سے ہر ایک خلقت کے وقت چالیس دن تک ماں کے پیٹ میں نطفہ کی صورت میں رہتا ہے۔ الحدیث 463
حدیث طیبہ: اللہ تعالیٰ نے پانچ دریا جنت سے نازل فرمائے یعنی سیحون اور جیحون۔ الحدیث 468
حدیث طیبہ: میرے نسب وصہر کے سوا تمام نسب وصہر کٹ جائیں گے 508
میزان کی تحقیق اور کیفیت وزن کا بیان 509
حدیث طیبہ: اہل جہنم کی پانچ دعائیں۔ الحدیث 514
سورۂ نور 521
مسئلہ: حد شرعی ایسے کوڑے سے لگائی جائے جو درمیانے سائز کا اور بغیر گھنڈی کے ہو 522
مسائل: زنا کی سزا کوڑے لگانا، جلاوطن کرنا اور سنگسار کرنا ہے 522
احصان کی شرائط کا بیان 531
امام کیلئے جائز ہے کہ زانی کو جلاوطن کر دے بلکہ ہر حاکم مصلحت کے پیش نظر کسی کو جلاوطن کر سکتا ہے 526
قید کرنا جلاوطن کرنے کی ایک صورت ہے 537
نفسانی قوت کے خاتمہ کیلئے مشائخ طریقت نے جلاوطن کو جائز قرار دیا ہے 527
زنا کسے کہتے ہیں؟ 533
ملکیت کے شبہ میں کیا زنا کا حکم لگایا جائے گا! 535
زنا شہادت یا اقرار سے ثابت ہوتا ہے 538
اقرار کرنے کے بعد رجوع کر لینے سے حد ساقط ہو جاتی ہے 540
مریض اور عورت کو حد کیسے لگائی جائے گی 540
کیا آقا اپنے غلام پر حد لگا سکتا ہے؟ 542
حد قذف کے مسائل 547
لعان کے مسائل 553
واقعہ افک 570
مسئلہ: مومنین کے متعلق حسن ظن رکھنا چاہئے 573
کون سی چیز دخول جنت کی موجب ہے۔ ابواب خیر کون سے ہیں 575
دین کی چوٹی اور ستون کیا ہے؟ ان تمام امور کا مدار زبان کو روکنے پر ہے 575
حدیث: برابر کا بدلہ لینے والے کو صلہ رحم کرنے والا نہیں کہا جا سکتا 579
حدیث: قیامت کے دن جسم کے اعضاء شہادت دیں گے 581

حدیث: اللہ نے منع فرمایا ہے کہ اہل جنت کے سوا کسی سے نکاح کروں یا کرواؤں۔	583
حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے فضائل احادیث کی روشنی میں	583
کسی کے گھر اجازت لے کر جانے اور سلام کرنے کا حکم	584
نظر نیچی رکھنے اور ستر عورت کا بیان	589
کیا عورت اجنبی مرد کو دیکھ سکتی ہے؟	591
مرد، مرد کے کون سے اعضاء دیکھ سکتا ہے	591
ناف سے گھٹنوں تک نہ عورت، عورت کو اور نہ مرد، مرد کو دیکھ سکتا ہے	591
آزاد عورت کی شرمگاہ کا بیان	592
شہوت سے امن کی صورت میں اجنبی مرد، عورت کے کن اعضاء کو دیکھ سکتا ہے	593
لونڈی کی شرمگاہ کا بیان	594
عورت اپنے محرم کے سامنے اپنے بدن کے کون سے حصے کھول سکتی ہے اور محرم مرد عورت کے بدن کے کسی حصے کو دیکھ یا چھو سکتا ہے بشرطیکہ شہوت نہ ہو	595
عورت کی آواز شرمگاہ ہے	599
مسئلہ: بعض حالات میں نکاح فرض یا واجب ہوتا ہے جبکہ بعض حالات میں حرام مکروہ ہوتا ہے اور اکثر حالات میں مستحب اور سنت ہے	600
مسئلہ: اچھی نیت سے نکاح کرنا عبادت ہے	604
حدیث: نکاح سے رزق تلاش کرو	606
آیت نور کی تفسیر	616
زینت سے کیا مراد ہے	619
فصل: ان معجزات کا بیان جو بعثت سے قبل ظاہر ہوئے	620
آیت نور کی صوفیانہ تاویل	623
حدیث: نماز مومن کی معراج ہے	631
ہدایت امر وہبی ہے	635
خلافت راشدہ پر استدلال	644
حدیث: خلافت 30 سال ہے	644
کھانا کھلانے، سلام کرنے، مریض کی عیادت اور نماز جنازہ پڑھنے کا بیان	651
مسئلہ: مطلق امر، وجوب کیلئے ہے۔	660

سورۂ کہف

آیاتہا ۱۱۰ سُوْرَةُ الْكَهْفِ مَكِّيَّةٌ ۱۸ رکوعاتہا ۱۲

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتٰبَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا ۞

"سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے ہیں ۱؎ جس نے نازل فرمائی اپنے (محبوب) بندے پر یہ کتاب ۲؎ اور نہیں پیدا ہونے دی اس میں ذرا کجی ۳؎۔

۱؎ ابن جریر نے اسحاق کے طریق سے اہل مصر کے ایک شیخ سے اور انہوں نے عکرمہ سے اور انہوں نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش مکہ نے نضر بن الحارث اور عقبہ بن ابی معیط کو یہودی علماء کی طرف مدینہ طیبہ بھیجا تا کہ وہ علماء یہود سے محمد ﷺ کے متعلق دریافت کریں کہ اس کی نبوت و رسالت کی حقیقت کیا ہے۔ اور ان کے سامنے محمد ﷺ کی صفات عالیہ، خصائل جمیلہ اور عادات جلیلہ کو بھی بیان کریں۔ قریش نے یہود سے اس لئے محمد ﷺ کے متعلق پوچھا کیونکہ وہ پہلے اہل کتاب ہیں اور ان کے پاس انبیاء کرام کا علم ہے جس سے قریش مگر محروم ہیں۔ وہ دونوں اپنی قوم کے مشورہ کے مطابق مدینہ طیبہ پہنچے اور یہود سے محمد ﷺ کے حسن اخلاق اور دعوت توحید کے متعلق بیان کیا۔ یہودیوں نے کہا اس سے تم تین چیزوں کے متعلق سوال کرو۔ اگر وہ ان کے متعلق صحیح صحیح جواب دے تو وہ یقیناً نبی اور رسول ہے اور اگر وہ ان چیزوں کے متعلق نہ بتا سکے تو اس کا دعویٰ نبوت من گھڑت اور افتراء عظیم ہے۔ ایک تو اس سے ان جوانوں کے متعلق پوچھو جو پہلے زمانہ میں اپنی بستی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ان کا معاملہ کیا تھا کیونکہ عربوں کے نزدیک ان جوانوں کا قصہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ دوسرا اس شخص کے متعلق پوچھو جس نے زمین کے مشرق و مغرب کا سفر کیا تھا، اس کا واقعہ کیا ہے۔ تیسرا اس سے روح کی حقیقت دریافت کرو۔

نضر بن حارث اور عقبہ بن معیط قریش کے پاس آئے تو انہیں بتایا کہ ہم ایسے تین سوال لائے ہیں جو محمد ﷺ اور ہمارے درمیان تنازعہ اور جھگڑے کو ختم کر دیں گے۔ قریش رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور یہ تین سوال پوچھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں ان کے جوابات کل بتاؤں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ وہ واپس چلے گئے۔ لیکن قدرت کی حکمت کا تقاضا تھا کہ پندرہ روز تک وحی کا سلسلہ منقطع ہو گیا، نہ کوئی پیام اور نہ پیامبر آیا۔ اہل مکہ کو زبان طعن دراز کرنے کا موقع مل گیا۔ وحی کے انقطاع سے آپ کو شدید پریشانی ہوئی اور اہل مکہ کی اذیت آمیز گفتگو سے آپ کا دل مضطرب مزید تکلیف میں مبتلا ہو گیا۔ پندرہ دن کے بعد جبریل امین سورۂ کہف کی یہ پہلی آیات لے کر تشریف لائے۔ ان آیات میں ان کی تکلیف دہ باتوں پر پریشانی کا اظہار کرنے پر عتاب بھی تھا اور جو انہوں نے تین سوالات پوچھے تھے ان کے جوابات بھی تھے (1)۔

۲؎ اللہ تبارک و تعالیٰ نے اپنی مخلوق پر جو سب سے بڑا انعام فرمایا ہے اس پر وہ اپنی تعریف خود فرما رہا ہے، وہ انعام عظیم قرآن حکیم ہے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 380 (العلمیۃ)

جو اس نے ان میں سے ایک شخص کے قلب مطہر پر نازل فرمایا۔ اور قرآن نعمت عظمٰی اسلئے ہے کیونکہ اس میں انسانیت کے کمال اور عروج تک پہنچنے والے راستوں کی راہنمائی کی گئی ہے۔ اور اس میں ان قوانین وفرامین کو بھی بیان کیا گیا ہے جن میں معاشرۂ انسانی کی دنیا وآخرت کی خیر اور بھلائی ہے۔ نیز اس آیت کریمہ میں بندوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے خالق و مالک بلکہ پوری کائنات کے خالق کی تعریف اور ثناء کیسے کریں۔

۳؎ حفص نے عوجا کو وصل کی صورت میں الف پر آواز کو توڑے بغیر لطیف سا سکتہ کر کے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء بغیر سکتہ کے وصل کرتے ہیں۔ اس کا مفہوم یہ ہے، کہ یہ کتاب رشد و ہدایت ہے جو اس نے اپنے حبیب کے قلب اطہر پر نازل فرمائی ہے۔ اس کے نہ تو الفاظ وعبارات میں کمی ہے اور نہ اس کے معانی میں باہم اختلاف ومنافات ہے اور اللہ تعالیٰ کی جناب سے جو اس میں دعوت آئی ہے اس میں کسی قسم کا انحراف اور تغیر نہیں اور نہ ہی اس کے ارشادات حکمت وموعظت سے خالی ہیں۔ عِوج اگر عین کے کسرہ کے ساتھ ہو تو معانی مخفی کجی کیلئے استعمال ہوتا ہے اور عوَج اگر بفتح عین ہو تو ظاہری ٹیڑھے پن کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ عرب کہتے ہیں فِیْ رَأیِهٖ عِوَجٌ وَّفِیْ عَصَاهُ عِوَجٌ (یعنی اس کی فکر اور سوچ میں کجی ہے اور اس کی چھڑی ٹیڑھی ہے) ابن عباس رضی اللہ عنہ سے عوجا کا معنی غیر مخلوق مروی ہے۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے اس کا معنی غیر مخلوق کیا ہے(1)۔

قَيِّمًا لِّيُنْذِرَ بَاْسًا شَدِيْدًا مِّنْ لَّدُنْهُ وَ يُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِيْنَ الَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ اَجْرًا حَسَنًا ﴿۲﴾

"(اور معاش ومعاد کو) درست کرنے والی ہے ۱؎ تا کہ ڈرائے سخت گرفت سے جو اللہ کی طرف سے ہوتی ہے ۲؎ اور یہ مژدہ سنائے ان اہل ایمان کو جو کرتے ہیں نیک اعمال کہ بیشک ان کے لئے بہت عمدہ جزاء ہے۔ ۳؎"

۱؎ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ قیما کا یہ معنی فرماتے ہیں کہ یہ بالکل کجی اور ٹیڑھے پن سے پاک ہے، اس میں کسی قسم کی افراط و تفریط نہیں ہے۔ فراء لکھتے ہیں یہ کتاب تمام الہامی کتابوں کی مؤید اور گواہ ہے اور ان کے بعض احکام کو منسوخ کرتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تکمیل انسانی کی صفت سے متصف ہے، بندوں کے مصالح درست کرنے والی ہے، یعنی یہ نورانی صحیفہ جس طرح اپنی صفت کمال سے موصوف ہے اسی طرح دوسروں کی اصلاح اور ان کو کمال عروج تک پہنچانے کی صفت سے بھی مزین ہے۔ قیمًا پر نصب مضمر فعل کی وجہ سے ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ وَلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا وَّلٰكِنْ جَعَلَهٗ قَيِّمًا یا یہ لهٗ کی ضمیر یا الکتاب سے حال ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی عاطفہ نہ ہوگی۔ اگر واؤ کو عاطفہ بنایا جائے تو معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان فاصلہ آ جائے گا۔ اسی وجہ سے بعض علماء نے تقدیم وتاخیر کا قول کیا ہے۔ یعنی اگر واؤ عاطفہ ہو تو تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اَنْزَلَ عَلٰى عَبْدِهِ الْكِتَابَ قَيِّمًا وَّلَمْ يَجْعَلْ لَّهٗ عِوَجًا۔

قرآن کی یہاں دو صفتوں کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ اس میں کوئی خامی اور کجی نہیں ہے اور دوسرا یہ کہ یہ کتاب دوسروں کی خامیوں کی بھی اصلاح کرنیوالی ہے۔ ان دونوں وصفوں کا فائدہ کلام میں تاکید ہے کیونکہ کئی ایسی چیزیں ہوتی ہیں جن کی صفت

1۔ تفسیر خازن، جلد 4، صفحہ 155 (التجاریہ)

استقامت (اصلاح) بیان کی جاتی ہے لیکن باریکی اور لطیف انداز سے دیکھا جائے تو اس میں کچھ نہ کچھ خامی اور کجی بھی نظر آ جاتی ہے لیکن قرآن میں یہ دونوں اوصاف جمع فرما کر اس کی جامعیت کو واضح فرما دیا۔

۲ لینذر کا فاعل عبد ہے، یعنی اس کتاب حکمت و موعظت کے ساتھ میرا عبد کامل ان لوگوں کو ڈرائے جو شرک وکفر میں ملوث ہیں۔ قرینہ کی وجہ سے پہلے مفعول کو حذف کیا گیا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس غرض پر اکتفا کیا گیا ہے جس کے لئے کلام کو ذکر کرنا مقصود تھا۔ باسا کا معنی عذاب ہے، یعنی عبد کامل، کتاب کامل کے ذریعے کفار کو اس عذاب سے ڈرائے جو بے نیاز ذات کی طرف سے جہنم کی آگ کی صورت میں ان پر ڈالا جائے گا۔ ابوبکر نے من لدنہ کو دال کے سکون اور ہونٹوں کو ملانے کے ساتھ ضمہ کی طرف اشمام دیکر پڑھا ہے۔ نیز انہوں نے نون اور ھا کو کسرہ دیا ہے اور ھا کو یاء کے ساتھ ملا دیا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے دال کے ضمہ اور نون کے اسکان اور ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ابن کثیر نے ھا کو واو کے ساتھ ملایا ہے۔

۳ حمزہ، کسائی نے باب افعال سے یبشر تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے باب تفعیل سے شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہاں یبشر کا مفعول اول ذکر فرمایا ہے تاکہ ایمان داروں کی عظمت کا اظہار ہو جائے۔ دوسرا یہ کہ ایمان اور اعمال صالحہ پر انہیں برانگیختہ کیا جائے۔ یعنی نیک اعمال کرنے والوں کو یہ کتاب لاریب جنت اور رضاء الٰہی کا مژدہ جانفزاء سناتی ہے۔

مَّاكِثِيْنَ فِيْهِ اَبَدًا ﴿۳﴾

''وہ ٹھہریں گے اس (جنت) میں تا ابد ۱؎''

۱؎ یہ جو انہیں نیک اعمال کا اجر ان کی شایان شان ملے گا اس میں وہ ہمیشہ مسرور و خورسند رہیں گے۔ اس اجر و انعام کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا یہ دائمی اور ابدی ہوگا۔

وَّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ﴿۴﴾

''اور تاکہ ڈرائے ان (نادانوں) کو جو یہ کہتے ہیں کہ بنا لیا ہے اللہ تعالیٰ نے (فلاں کو اپنا) بیٹا۔ ۱؎''

۱؎ یہاں ان لوگوں کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا جو اللہ کی اولاد کے قائل تھے۔ اور ڈرانے کو بھی ان کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کا شرک اور کفر بہت گھناؤنا اور قبیح تھا اور بڑا عجیب و غریب تھا۔ اور جس چیز سے ڈرانا تھا یہاں اس کا ذکر نہیں فرمایا کیونکہ پہلے اس (عذاب) کا ذکر ہو چکا ہے۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ وَّلَا لِاٰبَآئِهِمْ ؕ كَبُرَتْ كَلِمَةً تَخْرُجُ مِنْ اَفْوَاهِهِمْ ؕ اِنْ يَّقُوْلُوْنَ اِلَّا كَذِبًا ﴿۵﴾

''نہ انہیں اللہ تعالیٰ (کی ذات و صفات) کا کچھ علم ہے اور نہ ان کے باپ دادا ۱؎ کو کتنی بڑی ہے وہ بات ۲؎ جو نکلتی ہے ان کے مونہوں سے ۳؎ وہ نہیں کہتے ہیں مگر (سرتاسر) جھوٹ۔ ۴؎''

۱؎ بہ کی ضمیر کا مرجع الولد، یا اتخاذ یا القول ہے، یعنی ان احمقوں کو بیٹے کے متعلق، یا بیٹا بنانے یا ایسا قول کرنے کے (جرم) کے متعلق علم نہیں ہے، یہ سب کچھ اپنی انتہائی جہالت، باطل توہمات اور اندھی تقلید کی بناء پر کہتے ہیں (کہ اللہ نے فلاں کو اپنا بیٹا بنایا

ہے) جو کچھ اپنے بے عقل آباؤ اجداد سے سنا، بغیر سوچے سمجھے اس کی پیروی اور تقلید کر رہے ہیں اور جو کچھ کہتے ہیں اس کا بھی انہیں علم نہیں ہے۔ وہ اَبٌ اور ابن کا اطلاق موثر اور اثر کے معنی میں کرتے تھے، جبکہ انہیں اس کا علم ہی نہیں ہے۔ یا یہ معنی کہ ان عقل کے دشمنوں کو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کا علم وادراک ہی نہیں ہے ورنہ یہ اللہ تعالیٰ کی اولاد کی طرف نسبت نہ کرتے۔ یا کہا جاتا ہے کہ کسی چیز کا علم نہ ہونا اس کے عدم انکشاف کی وجہ سے ہوتا ہے حالانکہ وہ چیز موجود ہوتی ہے اور کبھی لاعلمی اس چیز کے معدوم اور محال ہونے کی وجہ سے ہوتی ہے اور یہاں یہی مفہوم مراد ہے۔ یہ موجودہ مشرک جس طرح بے علم تھے اس طرح ان کے پیشروان کے آباء واجداد بھی نادان اور ناسمجھ تھے کیونکہ وہ بھی خدا کی طرف بیٹے کی نسبت کرتے تھے۔

۲۔ ان کا یہ کفر یہ کلمہ کتنا قبیح اور نامعقول ہے کیونکہ انہوں اس ذات صمدیت کو ایک مخلوق سے تشبیہ دی، پتھر سے تراشے بتوں کو اس کا شریک ٹھہرایا، انہوں نے ایسی بات کہی ہے جس سے یہ وہم ہوتا ہے کہ اس ذات کو بیٹے اور خلیفہ کی احتیاج ہے حالانکہ وہ ذات ہر قسم کے ایسے نقص اور عیب سے منزہ اور مبرا ہے، کلمۃً پر نصب تمیز ہونے کی بنا پر ہے۔ اس قسم کا اسلوب بیان تعجب کیلئے استعمال ہوتا ہے۔ کبرت میں فاعل ھی ضمیر مبہم ہے جس کی تفسیر کلمۃً بیان کر رہا ہے یا ضمیر کا مرجع اتخذ اللہ ولدا کا قول ہے۔ کلمہ کا اطلاق مرکب کلام پر بھی ہوتا ہے کیونکہ عرب قصیدہ کو بھی کلمہ کہہ دیتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اصل میں من کلمۃ تھا اور فاعل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے اور من زائدہ ہے پھر من کو حذف کیا گیا اور کلمۃ کو منصوب پڑھا گیا۔

۳۔ یہ کلمۃ کی صفت ہے جو ان کے اپنے مونہوں سے ایسی بات نکالنے کی نامعقولیت کو بیان کر رہی ہے۔ حالانکہ نکلنے والی تو وہ ہوا تھی جو ایسی بات کی حامل تھی۔ بعض علماء فرماتے یہ جملہ محذوف مخصوص بالذم کی صفت ہے کیونکہ کَبُرَ یہاں بئس کے معنی میں ہے۔ تقدیر اس طرح ہے قول یخرج۔

۴۔ وہ سفید جھوٹ بک رہے ہیں کذبا مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی ان کی یہ بات (فلاں اللہ کا بیٹا ہے) کسی اعتبار سے بھی صداقت پر مبنی نہیں ہے۔

ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ عتبہ، شیبہ، ابوجھل بن ھشام، نضر بن الحارث، عاص بن وائل، اسود بن مطلب اور ابوالبختری قریش کی ایک مجلس میں جمع تھے۔ جب رسول اللہ ﷺ نے پوری دلسوزی اور خلوص کے ساتھ کفار کو دعوت توحید دی تو انہوں نے اس پیکر خلوص کی دعوت حق کو قبول کرنے کی بجائے اس کا مذاق اڑانا شروع کر دیا، اور صبح و شام تنقید وطعن ان کا مشغلہ بن گیا۔ اس غیر منصفانہ طرز عمل پر آپ ﷺ کے شفیق ورحیم دل کو بہت تکلیف ہوتی، خلوص آمیز تبلیغ کی تضحیک وانکار آپ کیلئے نہایت پریشانی اور قلق کا باعث بنتا تھا(1) تو اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب لبیب ﷺ کو تسلی دینے کیلئے ذیل کی آیت نازل فرمائی۔

فَلَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ اِنْ لَّمْ يُؤْمِنُوْا بِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَسَفًا ۝

''تو کیا آپ (فرط غم سے) تلف کر دیں گے اپنی جان کو ان کے پیچھے ۱؎ اگر وہ ایمان نہ لائے اس قرآن کریم پر افسوس کرتے ہوئے ۲؎''

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 382 (العلمیۃ)

ل اے پیارے حبیب ان ناہنجاروں اور ازلی بدبختوں کی ایمان سے بے رخی کرنے پر آپ اپنے نفس کو ہلاک کر دیں گے۔ جب انہوں نے آپ ﷺ کی دعوت کو قبول نہ کیا اور شتر بے مہارا کی طرح منہ موڑ گئے، آپ کو ان کی اس بے توجہی پر شدید دکھ اور پریشانی ہوئی تو آپ کی اس کیفیت کو اس شخص سے تشبیہ دی گئی ہے جس کو اپنے دوست و احباب چھوڑ گئے ہوں اور وہ ہجر و فراق کی طویل رات میں گھائل ہو رہا ہو۔ گویا آپ ﷺ بھی درد فراق میں مبتلا شخص کی طرح ان کے ایمان نہ لانے پر غم و اندوہ میں مبتلا ہیں۔

ؕ هذا الحديث سے قرآن حکیم مراد ہے۔ ان لم يؤمنوا شرط ہے اور سابقہ کلام کی وجہ سے جزاء سے مستغنی ہے۔ اسفاً یا تو علت کی بناء پر منصوب ہے یا حال کی حیثیت سے منصوب ہے، یعنی ان پر افسوس کرتے ہوئے اپنے آپ کو مار ڈالیں گے یا ان کے ایمان کی آرزو میں اپنے آپ کو قتل کر دیں گے۔ اسف کا معنی شدید غصہ اور انتہائی غم و اندوہ ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا ۝

”بیشک ہم نے بنایا ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں اس کے لئے باعث زینت و آرائش ل تا کہ ہم انہیں آزمائیں کہ ان میں سے کون عمل کے لحاظ سے بہتر ہے ؕ“

ل یعنی ہم نے حیوانات، نباتات اور معادن کو زمین اور زمین کے باسیوں کیلئے زینت و زیبائش کا باعث بنایا۔ اگر کوئی یہ کہے کہ سانپ، بچھو اور شیاطین میں کیا حسن و زیبائش ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ ساری چیزیں اس اعتبار سے زینت ہیں کہ یہ اپنے صانع کی قدرت کاملہ، اس کی یکتائی اور اس کی صفات کمالیہ پر دلالت کرتی ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ماعلى الارض سے مراد صرف مرد ہیں اور یہی زمین کی زینت و جمال ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد علماء اور صالحین ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں درختوں اور نہروں کی زینت مراد ہے جیسا کہ اللہ تعالی کا ارشاد ہے۔ حَتّٰى إِذَا أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ” یہاں تک کہ جب لے لیا زمین نے اپنا سنگار اور خوب آراستہ ہو گئی“

بعض علماء فرماتے ہیں ماعلى الارض سے مراد ہر وہ چیز ہے جو زمین کے حسن و خوبی کا باعث ہو سکتی ہے مثلاً دنیا کی ظاہری نفیس اشیاء۔ میں کہتا ہوں دنیا کی تمام اشیاء بھی مراد ہو سکتی ہیں جیسا کہ الفاظ کے عموم سے ظاہر ہے کیونکہ مجموعی نظام کے حسن پر سب چیزیں دلالت کرتی ہیں یا ہر چیز زینت میں داخل ہے کیونکہ جمیل و حسین صورتوں کا حسن ہمیشہ قبیح چیزوں کے ذریعہ سے ہی محسوس و معروف ہوتا ہے۔

ؕ هم ضمیر کا مرجع الناس ہے جو وَيُبَشِّرَ الْمُؤْمِنِينَ اور يُنذِرَ الَّذِينَ قَالُوا اتَّخَذَ اللَّهُ وَلَدًا کے ارشادات کے ضمن میں موجود و مفہوم ہے، یعنی اللہ تعالی انہیں آزمائے کہ عمل کے لحاظ سے کون اچھا اور بہتر ہے، کون ان فانی اور عارضی رنگینیوں سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے خالق کی طرف متوجہ رہتا ہے اور کون اس دنیا کے ظاہری حسن و جمال کی دلفریبیوں میں کھو جاتا ہے۔ بہتر عمل والا وہ ہو گا جو کفایت کرنے والے مال پر قناعت کرے اور پھر اس مال کو مناسب اور نیک جگہ پر صرف کرے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دنیا سرسبز و شاداب، بہت لذیذ اور میٹھی ہے۔ اللہ تعالی نے تمہیں اس میں پہلے لوگوں کا خلیفہ بنایا تا کہ وہ دیکھے کہ تم اس میں کیسے اعمال کرتے ہو۔

وَإِنَّا لَجَاعِلُونَ مَا عَلَيْهَا صَعِيدًا جُرُزًا ۝

”اور ہم ہی بنانے والے ہیں ان چیزوں کو جو زمین پر ہیں (ویران کر کے) چٹیل میدان غیر آباد ل“

ل یعنی جن چیزوں کو ہم نے اس زمین کی زیب و زینت کا باعث بنایا، ایک دن ہم ان سب کو خاکستر اور ریزہ ریزہ کر دیں گے۔

حیوانات و نباتات اور دوسری یہ حسین و جمیل اشیاء سب مٹی میں مل جائیں گی۔

أَمْ حَسِبْتَ أَنَّ أَصْحٰبَ الْكَهْفِ وَالرَّقِيمِ كَانُوا مِنْ اٰيٰتِنَا عَجَبًا ۞

''کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ غار والے اور رقیم والے ہماری ان نشانیوں میں سے ہیں جو تعجب خیز ہیں لہ''

لہ اس آیت میں استفہام تقریری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے ہیں۔ ان کا وصف مبالغہ کیلئے مصدر سے بیان کیا گیا ہے یا عجباً مصدر فاعل کے معنی میں ہے یا ذا عجب کے معنی میں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں استفہام انکاری ہے یعنی یہ لوگ ہماری تعجب خیز نشانیوں میں سے نہیں ہیں کیونکہ یہ بلند و بالا آسمان، یہ سرسبز و شاداب زمین اور پھر زمین کے دامن میں ان گنت دوسری مخلوق، ان لوگوں سے بھی حیرت انگیز ہے کیونکہ یہ سب اشیاء مختلف طبائع اور مختلف ہیئت پر پیدا کی گئی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ سب کو اپنی اصل یعنی مٹی کی طرف لوٹا دے گا۔ یہ گوناں گوں کائنات کی اشیاء، اصحاب کہف اور رقیم سے زیادہ حیران کن اور تعجب خیز ہیں۔ کہف اصل میں کھلی غار کو کہتے ہیں جو پہاڑ کے اندر ہو۔ الرقیم کے متعلق علماء کا اختلاف ہے سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس سے مراد وہ تختی ہے جس پر اصحاب کہف کے اسماء اور ان کا قصہ درج تھا (یہ قول تمام اقوال سے زیادہ ظاہر ہے) اس تختی کو لوگوں نے اس غار کے منہ پر رکھ دیا تھا اور وہ تختی تانبے کی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ پتھر کی تھی۔ اس تاویل پر رقیم بمعنی مرقوم ہوگا یعنی لکھا ہوا اور رقم کا معنی لکھنا ہے۔ ابن عباس سے حکایت ہے کہ رقیم ایک وادی کا نام ہے جس میں ان کی غار تھی۔ اس صورت میں رقیم رقمۃ الوادی سے مشتق ہوگا جس کا معنی وادی کا کنارہ ہے۔ کعب الاحبار فرماتے ہیں یہ اس دیہات کا نام ہے جس سے اصحاب کہف نکلے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ پہاڑ کا نام ہے جس میں غار تھی۔ بعض علماء فرماتے اصحاب رقم کوئی دوسرے افراد تھے جو اصحاب کہف کے علاوہ تھے۔ عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، طبرانی اور ابن مردویہ نے نعمان بن بشیر سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کو اصحاب رقیم کے متعلق بیان فرماتے ہوئے سنا کہ یہ تین افراد تھے جو غار میں داخل ہوئے تھے (1)۔ اسی حدیث کو احمد اور ابن منذر نے حضرت انس کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ یہ پہلے لوگوں میں سے تین افراد تھے جو اپنے گھر والوں کیلئے خوراک طلب کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ باہر تھے کہ بارش شروع ہوگئی۔ انہوں نے دوڑ کر ایک غار میں پناہ لی، اچانک ایک چٹان گری جس کے ساتھ غار کا منہ بند ہوگیا۔ ان میں سے ایک نے مشورہ دیا کہ اپنا اپنا نیک عمل یاد کرو (اور اس کے واسطہ سے دعا کرو) ہوسکتا ہے اللہ تعالیٰ اس نیک عمل کی برکت سے ہماری حالت زار پر رحم فرمائے۔ ان میں سے ایک نے کہا ایک دن میں نے مختلف مزدوروں کو کام پر لگایا تھا پھر ایک شخص دوپہر کو آیا اور بقیہ وقت اس نے ان کی طرح مزدوری کی، میں نے دوسرے مزدوروں کی طرح اس (نصف دن) کام کرنے والے کو بھی پورے دن کی مزدوری دے دی۔ ان مزدوروں میں سے ایک مزدور ناراض ہوگیا اور اپنی اجرت چھوڑ کر چلا گیا۔ میں نے اس کی اجرت کو گھر میں علیحدہ رکھ دیا پھر میرے پاس سے ایک گروہ گزرا تو میں نے اس سے اس مزدور کی اجرت کے بدلے ایک اونٹنی خرید لی۔ وہ اونٹنی مشیت الٰہی کے مطابق بڑھتی رہی۔ پھر وہی مزدور پیرانہ سالی کے عالم میں میرے پاس واپس آیا، میں تو اسے پہچان بھی نہ سکا۔ اس نے کہا میرا تیرے پاس کچھ حق باقی ہے۔ اس نے یاد دلایا تو مجھے یاد آگیا۔ میں نے اس کو اونٹنی اور اس کی اولاد سب پیش کر دیں، اس شخص نے دعا کی یا اللہ اگر میں نے یہ سب عمل تیری رضا کے لئے کیا تھا تو اس کے واسطہ سے ہمیں اس غار سے باہر نکال دے، چٹان تھوڑی سی اپنی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 156 (التجاریۃ)

جگہ سے ہٹ گئی حتی کہ انہیں کچھ روشنی نظر آنے لگی۔ دوسرے نے کہا میں مالدار تھا، جبکہ لوگ قحط اور تنگی میں مبتلا تھے۔ میرے پاس ایک عورت آئی، اس نے مجھ سے نیکی کرنے کا سوال کیا تو میں نے اسے کہا تم اپنا آپ میرے حوالے کرو تو میں تجھ سے نیکی کروں گا۔ اس نے انکار کیا پھر وہ تین مرتبہ آئی (لیکن ایسا ہی مطالبہ ہوا لیکن اس نے انکار کیا) پھر اس نے اپنے خاوند سے اس بات کا تذکرہ کیا، خاوند نے کہا اس کی بات مان لے اور اپنے بچوں کے سلسلہ میں میری معاونت کر پھر وہ لوٹ کر آئی اور اس نے اپنا آپ میرے حوالے کر دیا۔ جب میں نے اس کا ستر کھولا اور اس سے بدکاری کا ارادہ کیا تو اس پر لرزہ طاری ہوگیا۔ میں نے کہا تجھے کیا ہوا۔ اس عورت نے کہا مجھے اللہ تعالیٰ کے خوف کی وجہ سے کپکپی لاحق ہوگئی ہے میں نے کہا تو اس بھوک اور شدت کے عالم میں اپنے پروردگار سے ڈر رہی ہے اور میں اس خوشحالی کے حالات میں اس سے خوفزدہ نہیں ہوں۔ میں نے اس عورت کو چھوڑ دیا اور خواہش کے مطابق مال بھی دیا، یا اللہ اگر میں نے یہ بدکاری تیری وجہ سے چھوڑی تھی تو ہماری یہ مشکل دور فرما دے چٹان تھوڑی سی اور اپنی جگہ سے ہٹ گئی حتی کہ کے وہ ایک دوسرے کو پہچاننے لگے، تیسرے نے کہا، میرے بوڑھے والدین تھے اور میری بکریاں بھی تھیں میں پہلے اپنے والدین کو کھلاتا اور پلاتا تھا پھر اپنی بکریوں کے چارہ وغیرہ کا بندوبست کرتا تھا۔ ایک دن بکریوں کے سلسلہ میں میری اتنی مصروفیت ہوئی کہ میں شام کے وقت لوٹا، گھر پہنچا، دودھ دوہنے والا برتن لیا۔ پھر اس میں دودھ دوہا لیکن والدین کے پاس دودھ لے کر پہنچا تو وہ سو چکے تھے، میں نے انہیں بیدار کرنا آداب کے خلاف سمجھا، میں وہاں ہاتھ میں برتن لے کر بیٹھ گیا، حتی کہ صبح کے وقت وہ بیدار ہوئے تو میں نے انہیں دودھ پیش کیا۔ یا اللہ اگر میں نے یہ عمل فقط تیری رضا کیلئے کیا تھا تو ہم سے یہ تکلیف دور فرما۔ اللہ تعالیٰ نے اس چٹان کو ہٹا دیا اور وہ باہر نکل آئے۔

إِذْ أَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ فَقَالُوا رَبَّنَا آتِنَا مِن لَّدُنكَ رَحْمَةً وَهَيِّئْ لَنَا مِنْ أَمْرِنَا رَشَدًا ﴿١٠﴾

"(یاد کرو) جب پناہ لی ان جوانوں نے غار میں [1] پھر انہوں نے دعا مانگی اے ہمارے رب ہمیں مرحمت فرما اپنی جناب سے رحمت اور مہیا فرما ہمارے لیے اس کام میں ہدایت۔ [2]"

[1] اوی کا معنی پناہ لینا ہے، یعنی انہوں نے ایک جگہ کو اپنی منزل بنایا۔ امام بغوی فرماتے ہیں بنجلوس پہاڑ میں غار تھی جس کا نام جیرم تھا (1)۔ اس میں یہ نوجوان داخل ہوئے تھے، اور دعا کی تھی کہ اے ہمارے پروردگار دین متین کی طرف ہمیں ہدایت عطا فرما، اور ہماری خطاؤں کو معاف فرما دے اور ہمیں رزق بھی عطا فرما اور دشمن کے ظلم سے ہمیں محفوظ فرما۔

[2] امام بیضاوی فرماتے ہیں تھیئۃ کا اصل معنی کسی چیز کو نئے سرے سے تیار کرنا ہے (2) مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں جو تو نے اپنی جناب سے ایمان واطاعت کا نور عطا فرمایا اور کفار سے علیحدگی اور نفرت کی توفیق بخشی ہے، اس میں ہمیں استقامت اور ثبات عطا فرما۔ یا یہ معنی کہ ہمارے سارے امور کو باعث ہدایت بنا دے۔ جیسا کہ تیرا قول ہے راعت منک رشدا یعنی حق کے راستہ پر ہمیں پختگی اور استقامت عطا فرما۔ قاموس میں بھی اسی طرح ہے۔ نیز قاموس میں ہے کہ رشد رشدا اور شادا' باب نصر اور فرح میں استعمال ہوتا ہے اور اس کا معنی ہدایت پانا ہے۔ رشید جو اللہ تعالیٰ کا صفاتی اسم ہے اس کا معنی سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کرنے والا ہے اور جس کی ہر تقدیر اور انداز میں حسن وکمال ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 160 (التجاریۃ)
2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 387 (فراس)

علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ ان جوانوں کے غار میں جانے کے سبب میں اختلاف ہے۔محمد بن اسحاق لکھتے ہیں کہ عیسائیوں سے اپنا دین خلط ملط ہوگیا۔اور گناہوں میں ملوث ہوگئے اور ان میں بادشاہ سرکشی میں مبتلا ہوگئے۔حتیٰ کہ وہ لوگ بتوں کی پوجا پاٹ کرتے اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتے۔لیکن کچھ لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر مضبوطی سے قائم تھے۔اور اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ اس علاقہ کا بدکار و بت پرست روم کا بادشاہ دقیانوس بھی تھا۔یہ بتوں کی عبادت کرتا اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرتا اور اپنی اس غلط روش کا پرچار کرتا۔جو اس کی مخالفت کرتا اسے قتل کر دیتا تھا۔وہ روم کے جس شہر میں جاتا،وہ کسی عیسائی کو نہیں چھوڑتا تھا،وہ انہیں بتوں کی پرستش اور بتوں کیلئے جانور ذبح کرنے کا حکم دیتا۔وہ مان جاتا تو فبہا ورنہ اسے قتل کر دیتا۔حتیٰ کہ بادشاہ روم اس شہر میں جا پہنچا جو اصحاب کہف کا شہر تھا۔اس کا نام افسوس تھا جب دقیانوس کسی شہر میں آتا تو دین مسیح کے پیروکار بہت پریشان ہوتے،چھپ جاتے اور بھاگ جاتے۔دقیانوس اہل ایمان کو تلاش کرنے کا حکم دیتا۔لوگ اہل ایمان کو پکڑ کر لاتے تو وہ انہیں قتل یا بت پرستی کا اختیار دیتا۔کچھ لوگ عارضی زندگی کو ترجیح دیتے اور کچھ غیر کی عبادت سے انکار کر دیتے۔جو انکار کرتے وہ انہیں قتل کر دیتا۔جب اس ظالم بادشاہ اور اس کے جوانوں نے اہل ایمان کی پختگی دیکھی تو وہ اہل ایمان کو تکلیف دینے اور قتل کرنے کے درپے ہوگئے،وہ انہیں قتل کرتے اور پھر ان کے اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتے۔پھر ان کے کٹے ہوئے اعضاء کو دیواروں پر لٹکا دیتے۔جب اس بادشاہ کا فتنہ روز بروز بڑھتا گیا تو یہ نوجوان بہت پریشان ہوئے اور اپنی نماز،روزہ،صدقہ،تسبیح اور دعا میں مشغول ہوگئے۔یہ روم کے رئیسوں اور شرفاء کے بیٹے تھے۔ یہ آٹھ افراد تھے اس آزمائش کو دیکھ کر اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑائے۔

رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَا مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا اِنْ عَبَدْنَا غَيْرَهٗ

ترجمہ:۔اے ہمارے پروردگار،آسمانوں اور زمین کے مالک ہم اللہ کو چھوڑ کر کسی اور خدا کو پکاریں تو ہم حد سے تجاوز کرنے والے ہوں گے اگر ہم کسی غیر کی عبادت کریں،اپنے ایماندار بندوں سے یہ آزمائش دور فرمادے اور اس مصیبت کو دفعہ فرمادے تاکہ تیرے بندے اعلانیہ تیری عبادت کرسکیں۔وہ اپنی عبادت گاہ میں یہ دعائیں مانگ رہے تھے کہ پولیس پہنچ گئی۔انہوں نے انہیں مسجدوں کی حالت میں اللہ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرتے ہوئے پایا۔سپاہیوں نے کہا تم نے بادشاہ کے حکم سے کیوں سرتابی کی ہے؟ بادشاہ کے پاس چلو؟ وہ انہیں دقیانوس کے پاس لے گئے اور کہا بادشاہ سلامت آپ لوگوں کو بت پرستی اور بتوں پر جانور ذبح کرنے کیلئے جمع کرتے ہیں،جبکہ یہ نوجوان جو تمہارے خاندان سے ہیں،تیرے حکم کا مذاق اڑاتے ہیں اور تیرے فرمان کی نافرمانی کرتے ہیں۔جب بادشاہ نے یہ سنا تو انہیں بلایا۔وہ نوجوان آئے تو ان کی آنکھوں میں آنسو تھے اور چہروں پر گرد وغبار تھا۔بادشاہ نے پوچھا تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کیوں نہیں کرتے؟ جن بتوں کی سطح زمین پر پوجا کی جاتی ہے،تمہیں تو دوسرے لوگوں کیلئے نمونہ بننا چاہیے تھا۔میں تمہیں اختیار دیتا ہوں یا تو تم ہمارے بتوں کیلئے جانور ذبح کر دو یا میں تمہیں قتل کر دوں گا۔مکسلمینا جوان جوانوں سے بڑا تھا،اس نے کہا ہمارا ایک خدا ہے جس کی عظمت سے آسمان لبریز ہیں۔ہم اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہیں کرتے۔سب تعریفیں سب بڑائیاں اور سب عیوب ونقائص سے پاک ہونا اسی کو زیبا ہے۔ہم صرف اسی کی عبادت کرتے ہیں،اسی سے نجات وکامیابی کا سوال کرتے ہیں اور تمہارے یہ تراشے ہوئے بت ہم تو ان کی عبادت نہیں کرتے۔جو تیرے جی میں آئے کر (یہ وہ نشہ نہیں جسے ترشی اتار دے) مکسلمینا کے دوسرے ساتھیوں نے بھی اس کی طرح بادشاہ کو منہ پر کھری کھری سنا دیں۔جب انہوں نے اپنے عزم واستقلال کا مظاہرہ کیا تو

پہلے بادشاہ نے ان کے شاہی لباس اتروا دیے۔ پھر کہا میں دوسرے امور مملکت سے فارغ ہو کر تمہیں وہ سزا دونگا جس کا میں نے تمہارے متعلق فیصلہ کیا ہے، مجھے اس وقت سزا دینے سے کوئی چیز مانع نہیں ہے لیکن میں صرف تمہارا عنفوان شباب دیکھ کر تمہیں مہلت دے رہا ہوں۔ اس مہلت میں تم غور وفکر کرلو اور اپنی ناقص عقلوں کو ہماری باتوں کی طرف متوجہ کرلو۔ پھر اس نے ان کے زیوارت اتارنے کا حکم دیا اور باہر لے جانے کا فرمان جاری کیا۔ دقیانوس انہیں چھوڑ کر کسی کام کیلئے دوسرے شہر چلا گیا۔ ان نوجوانوں کو جب اس کے چلے جانے اور جلدی واپس آنے کا پتہ چلا تو انہیں خدشہ لاحق ہوا کہ وہ آئے گا تو ہمیں پھر بلا لے گا۔ نوجوانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ ہم میں سے ہر ایک اپنے باپ کے گھر سے کچھ خرچ لے آئے، جس میں سے کچھ صدقہ کرے اور کچھ سے سامان خورد ونوش خریدے۔ ایسا کرنے کے بعد وہ شہر کے قریب ایک غار تھی اس میں چلے جائیں گے جو بنجلوس پہاڑ میں تھی، وہ اس میں رہیں گے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف رہیں گے نیز مشورہ یہ ہے کہ جب دقیانوس واپس آئے گا تو ہم سب اس کے پاس جائیں گے اور اس کے سامنے کھڑے ہو جائیں گے، وہ جو چاہے کرے (ہم عقائد حقہ سے روگردانی نہیں کریں گے)

یہ مشورہ طے ہو گیا تو سب اپنے اپنے باپ کے گھر گئے، خرچ لیا۔ کچھ صدقہ کیا اور باقی ساتھ لے کر غار کی طرف چل پڑے۔ ان کا ایک کتا تھا وہ بھی ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا حتی کہ وہ غار میں پہنچ گئے اور اس میں ٹھہرنے لگے۔ کعب الاحبار کا بیان ہے وہ کتے کے قریب سے گذرے تو وہ ان کے پیچھے چل پڑا، انہوں نے اسے دھتکارا لیکن پھر وہ پیچھے مڑ آیا۔ کئی دفعہ انہوں نے اسے بھگایا لیکن وہ پھر واپس آ گیا (اللہ تعالیٰ نے کتے کو قوت گویائی عطا فرمائی) اس نے کہا، اے لوگو! تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، میرے متعلق تم کچھ اندیشہ نہ کرو میں اللہ کے محبوب بندوں سے پیار کرتا ہوں۔ تم سو جاؤ، میں تمہاری حفاظت کروں گا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نوجوان رات کے اندھیرے میں دقیانوس سے بھاگ گئے تھے اور ان کی تعداد سات تھی۔ یہ ایک چرواہے کے پاس سے گذرے جس کے ساتھ ایک کتا بھی تھا اس چرواہا نے ان نوجوانوں کا دین قبول کرلیا اور ان کے ساتھ چل پڑا اور اس کا کتا بھی ان کے پیچھے ہو گیا۔ وہ شہر سے نکل کر غار کی طرف چلے گئے جو شہر کے قریب تھی۔

ابن عباس فرماتے ہیں وہ اس غار میں نماز، روزہ۔ تسبیح۔ تکبیر۔ تحمید میں بھی مصروف رہے۔ انہوں نے اپنا خرچ تملیخا کے پاس جمع کرالیا۔ وہ ان کے لئے شہر سے خفیہ طور پر کھانا لاتا تھا۔ یہ سب سے خوبصورت اور مضبوط جسم والا تھا۔ جب وہ شہر میں جاتا تو اپنے عمدہ کپڑے اتار کر مساکین کا لباس پہن لیتا، جن میں مساکین کھانا طلب کرتے تھے۔ وہ ایک سکہ لے کر شہر کو جاتا، کھانے، پینے کی چیزیں خریدتا اور لوگوں سے حالات معلوم کرتا کہ ان کا ذکر شہر میں کچھ ہوا ہے یا نہیں۔ پھر وہ اپنے اصحاب کی طرف لوٹ جاتا۔ وہ غار میں کچھ مدت ٹھہرے رہے۔ دقیانوس شہر کو واپس آیا تو اس نے شہر کے سرداروں کو بلایا تو تمام نے بتوں کیلئے جانور ذبح کیے اہل ایمان بادشاہ کی آمد سے گھبرائے، تملیخا جو شہر میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانے، پینے کا سامان لینے آیا تھا وہ اپنے ساتھیوں کے پاس لوٹ کر گیا تو رو رہا تھا اور ساتھ کھانا بھی قلیل مقدار میں لے گیا تھا تملیخا نے اپنے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ ظالم بادشاہ شہر میں پہنچ چکا ہے اور وہ ہماری تلاش میں ہے۔ سب ساتھی غار میں ہی سربسجود ہو گئے اور اللہ تعالیٰ سے آہ وفغاں کرنے لگے اور فتنہ وآزمائش سے پناہ طلب کرنے لگے۔ پھر تملیخا نے کہا اے بھائیو! اپنے سر اٹھاؤ اور کھانا کھاؤ، اللہ تعالیٰ کی ذات پر توکل کرو۔ انہوں نے سجدوں سے سر اٹھائے، جبکہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے، انہوں نے کھانا، کھایا تقریباً یہ غروب آفتاب کا وقت تھا پھر وہ گفتگو کرنے بیٹھ گئے اور

ایک دوسرے کو تعلیم دینے لگے اور نصیحت آمیز باتیں کرنے لگے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ نے غار میں ان کے کانوں کو بند کر دیا۔ اور ان کا کتا ہاتھ پھیلائے غار کے دروازہ پر بیٹھ گیا۔ کتے پر بھی ایسی ہی غنودگی طاری ہوگئی جیسے ان پر طاری ہوئی تھی، وہ سب ایمان وایقان کی حالت میں سوگئے اور ان کا خرچ ان کے سروں کے قریب پڑا تھا۔ جب دوسرا دن ہوا تو دقیانوس نے انہیں تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے۔ بادشاہ نے اپنے کسی ساتھی سے کہا ان جوانوں کے معاملہ نے تو مجھے پریشان کر رکھا ہے، جو یہاں سے بھاگ گئے ہیں۔ انہوں نے یہ خیال کیا کہ مجھے ان پر بہت غصہ ہے، یہ ان کی میرے معاملات سے ناشناسی کی وجہ سے ہوا ہے ورنہ اگر وہ میرے خدا کی عبادت کرتے اور اپنے دین سے توبہ کرتے تو میں انہیں چھوڑ دیتا۔ شہر کے سرداروں نے کہا جناب یہ لوگ رحم کے قابل نہیں جنہوں نے آپ کے حکم سے سرتابی کی ہے اور فرامین شاہی کی نافرمانی کی ہے۔ جناب نے انہیں مہلت دی تھی اگر وہ چاہتے تو اس مہلت کو غنیمت سمجھ کر لوٹ آتے۔ لیکن انہوں نے اپنے دین کو نہیں چھوڑا۔ جب سرداروں نے بادشاہ سے یہ بات کی تو وہ پھر غصہ میں لال پیلا ہوگیا۔ اس نے ان نوجوانوں کے والدین کو بلایا اور ان سے ان جوانوں کے متعلق پوچھا، اور کہا مجھے ان نافرمان بیٹوں کے متعلق بتاؤ جنہوں نے میرے حکم کی سرتابی کی ہے۔ ان کے باپوں نے کہا ہم نے تو تیری نافرمانی نہیں کی ہمیں اس سرکش گروہ کی وجہ سے کیوں قتل کرتا ہے جو ہمارے مال بھی اٹھا کر لے گئے تھے اور بازاروں میں انہیں ہلاک کر دیا۔ اور پھر وہ بجلوس پہاڑ کی طرف چلے گئے تھے۔ جب انہوں نے یہ گفتگو کی تو بادشاہ دقیانوس نے ان کو آزاد کر دیا۔ اب اسے کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا کہ وہ ان جوانوں کے ساتھ کیا کرے۔ اللہ تعالیٰ نے بادشاہ کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ غار کا منہ بند کر دے۔ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے یہ ارادہ فرمایا تھا کہ ان نوجوانوں کو عزت و اکرام عطا فرمائے اور انہیں بعد میں آنے والے لوگوں کیلئے نشانی بنائے اور لوگوں پر ان کی زندگی اور موت سے یہ حقیقت کھل جائے کہ قیامت واقعی قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ قبروں سے مردوں کو اٹھائے گا۔ دقیانوس نے حکم دیا کہ غار کا منہ بند کر دیا جائے، اور کہا کہ اسی غار میں انہیں رہنے دو جو انہوں نے خود اپنے لئے پسند کی ہے، خود بخود اندر بھوکے اور پیاسے مر جائیں گے اور یہ غار جو انہوں نے پسند کی ہے ان کے لئے قبر بن جائے گی۔ بادشاہ کا خیال تھا کہ وہ بیدار ہیں اور جو کچھ ان کے ساتھ ہو رہا ہے وہ اس سے باخبر ہیں حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی روحوں کو اس طرح نکال لیا تھا جس طرح سونے والوں کی روحوں کو اپنے قبضہ میں لے لیتا ہے، اور ان کا کتا غار کے دہانے بازو پھیلائے بیٹھا تھا، اور اس پر بھی وہ غنودگی طاری ہوگئی تھی جو ان پر طاری تھی۔ وہ دائیں بائیں کروٹیں بدلتے رہے۔ بادشاہ، دقیانوس کے گھر دو آدمی ایسے تھے۔ جنہوں نے اپنا ایمان پوشیدہ رکھا ہوا تھا، ایک کا نام بیندروس اور دوسرے کا نام ایاش تھا۔ انہوں نے مشورہ کیا کہ ان نوجوانوں کے حالات، ان کے نسب، ان کے اسماء اور واقعات کو سکے کی تختیوں پر لکھ دیں اور پھر انہیں تانبے کے تابوت میں رکھ دیں اور تابوت کو پھر ایک عمارت میں نصب کر دیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ان نوجوانوں پر کسی مومن قوم کو قیامت سے پہلے مطلع فرما دے اور جب یہ کتبہ پڑھے گا تو ان کی غار کو کھودنے والا ان کے حالات سے باخبر ہو جائے گا۔ انہوں نے مشورہ کے مطابق تختیاں نصب کر دیں پھر دقیانوس اپنی عمر پوری کرنے کے بعد مر گئے۔ زمانہ گذرتا رہا، بادشاہ یکے بعد دیگرے آتے رہے، عبید بن عمیر فرماتے ہیں اصحاب کہف ایسے نوجوان تھے جن کے گلوں میں طوق تھے اور ہاتھوں میں کنگن، ان کے بال لمبے لمبے تھے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا وہ اپنے زرق برق لباس پہن کر ایک میلہ کی طرف گئے تھے، ان کے ساتھ ان کے وہ بت بھی تھے جن کی وہ پوجا کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں ایمان کا نور پیدا فرما دیا۔ ان میں سے ایک بادشاہ کا وزیر تھا، یہ لوگ سب مومن بن

گئے تھے لیکن ہر ایک اپنے ایمان کو پوشیدہ رکھے ہوئے تھا۔ انہوں نے سوچا کہ ہم اس قوم کے درمیان سے نکل جائیں تا کہ ان کافروں پر نازل ہونے والا عذاب ہم پر نہ آ جائے۔ ان میں سے ایک جوان نے پہل کی، وہ نکل کر ایک درخت کے نیچے علیحدہ جا بیٹھا پھر دوسرا نکلا، اس نے پہلے کو علیحدہ بیٹھے ہوئے دیکھا تو امید کی کہ شاید یہ بھی میری طرح ایمان قبول کر چکا ہو لیکن معاملہ کو ظاہر نہ کر رہا ہو پھر تیسرا نکلا، وہ ایک جگہ اکٹھے ہو گئے، ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ تم کیوں جمع ہوئے ہو ہر ایک خوف کی وجہ سے اپنے ایمان کو دوسرے سے چھپائے ہوئے تھا پھر وہ دو دو ہو کر نکلے اور ہر ایک نے اپنے ایمان کو دوسرے پر ظاہر کر دیا، وہ سب کے سب مسلمان ہو چکے تھے، اور ایک غار جو پہاڑ میں تھی وہ ان کے قریب تھی ایک دوسرے کو کہنے لگے کہ اس غار میں پناہ لو تمہارا پروردگار تمہارے اوپر اپنی رحمت کی چادر پھیلا دے گا۔ وہ غار میں داخل ہوئے اور ان کے ساتھ ایک شکاری کتا بھی تھا، وہ تین سو نو (309) سال سوئے رہے۔ وہ اپنی قوم سے ان کے اسماء، نسب اور تاریخ لکھی کہ فلاں بن فلاں اور فلاں ہمارے بادشاہوں کے بیٹے تھے اور ہم نے انہیں فلاں بن فلاں بادشاہ کے دور میں گم کیا تھا۔ پھر انہوں نے یہ تختی بادشاہ کے خزانہ میں رکھ دی تا کہ اس کی عظمت بڑھ جائے۔ وہ بادشاہ مر گیا، اور اس طرح زمانہ اپنی گردش میں رہا۔

وہب بن منبہ کہتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام کا ایک حواری اصحاب کہف کے شہر میں آیا، وہ اندر داخل ہونا چاہتا تھا کہ اسے کہا گیا کہ اس شہر کے گیٹ پر ایک بت ہے، اسے سجدہ کر کے داخل ہونا ضروری ہے۔ حواری نے بت کو سجدہ کرنا ناپسند کیا۔ وہ شہر کے قریب ایک حمام میں آیا اور وہاں مزدوری کرنے لگا، اس نے حمام میں کام شروع کیا تو حمام کے مالک کو بہت برکت ہوئی۔ اور اس حواری کے کچھ اور شہری نو جوان دوست بن گئے، حواری انہیں زمین و آسمان کی خبریں سناتا حتیٰ کہ وہ بھی مومن بن گئے اور اس کی تصدیق کی، حواری نے حمام کے مالک سے یہ شرط لگائی تھی کہ رات کو میری اپنی مصروفیت ہوگی۔ رات کے وقت میرے اور میری نماز کے درمیان کوئی حائل نہ ہوگا۔ حالات اسی طرح گذرتے گئے، ایک دن بادشاہ کا بیٹا ایک عورت کو لے کر حمام میں آیا، حمامی نے اسے شرم دلائی اور کہا تو شہزادہ ہے اور اس عورت کے ساتھ حمام میں داخل ہو رہا ہے۔ شہزادہ کو شرم محسوس ہوئی تو وہ واپس لوٹ گیا۔ ایک مرتبہ پھر شہزادہ ایک عورت لے کر آیا۔ حمامی نے پھر اسی طرح کہا تو شہزادے نے اسے گالیاں دیں اور اسے ڈانٹ دیا۔ اور حمامی کی بات کی طرف کوئی توجہ نہ دی اور اندر داخل ہو گیا۔ وہ شہزادہ اور عورت حمام کے اندر ہی مر گئے۔ بادشاہ آیا تو اسے خبر ہوئی کہ حمام والے نے تیرے بیٹے کو قتل کر دیا ہے۔ اس نے حمامی کو تلاش کیا لیکن وہ نہ مل سکا، وہ کہیں بھاگ کر چلا گیا تھا۔ بادشاہ نے پوچھا اس کے ساتھ کون رہتے تھے، اسے نو جوانوں کے نام بتائے گئے، ان نو جوانوں کو تلاش کیا گیا لیکن وہ شہر سے باہر نکل گئے تھے، راستہ میں ایک شخص کے پاس سے گذرے جو ان کی طرح ایمان لا چکا تھا وہ بھی ان کے ساتھ چل پڑا، اس کے ساتھ ایک کتا تھا وہ بھی ساتھ چل نکلا رات کے وقت وہ سب غار میں داخل ہوئے۔ آپس میں کہنے لگے ہم رات یہاں گزاریں گے، صبح ہوگی تو پھر آئندہ کا پروگرام سوچیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر غنودگی طاری فرما دی۔ بادشاہ اپنے ساتھیوں کی مدد سے ان کی تلاش میں نکلا، اسے پتہ چلا کہ وہ اس غار میں داخل ہوئے ہیں۔ بادشاہ کے اہلکاروں میں سے ایک نے غار کے اندر داخل ہونے کا ارادہ کیا تو اس پر ایسی دہشت اور رعب طاری ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر کوئی دوسرا داخل نہ ہوا۔ بادشاہ کو ایک ساتھی نے کہا کہ آپ انہیں قتل ہی کرنا چاہتے ہیں؟ بادشاہ نے کہا ہاں۔ اس نے کہا پھر غار کے دروازے پر دیوار بنا دو اور انہیں یہیں چھوڑ دو، خود بخود بھوکے پیاسے مر جائیں گے۔ بادشاہ نے اس کی تجویز پر عمل کرتے

ہوئے غار کا منہ بند کروا دیا۔ وہب فرماتے ہیں غار کا منہ بند ہوئے زمانہ بیت گیا۔ ایک دفعہ ایک چرواہا کو غار کے قریب بارش آ گئی، اس نے سوچا اگر میں اس غار کا منہ کھول دوں اور اپنی بکریاں اس میں داخل کر دوں تو بارش سے بچ جائیں گی۔ اس نے کوشش سے غار کا منہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے صبح کے وقت دوسرے دن اصحاب کہف کی روحیں ان کے جسموں میں لوٹا دیں۔

محمد بن اسحاق فرماتے ہیں پھر ان شہروں کا بادشاہ نیک نامی آدمی بنا جس کا نام بیدوسیس تھا، اس کی بادشاہی کو جب 68 سال گزر گئے تو لوگوں نے اس کے ملک میں تخریب کاری شروع کر دی۔ اور مختلف گروہوں میں بٹ گئے۔ کچھ لوگ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے تھے اور قیامت کو حق جانتے تھے اور کچھ اس کا انکار کرتے تھے، نیک صالح بادشاہ کے دل پر یہ چیز بہت گراں گذری۔ وہ رونے لگا اور اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تضرع وزاری کرنے لگا۔ اور بہت زیادہ پریشان ہوا۔ جب اس نے دیکھا کہ باطل کے پرستار زیادہ ہو رہے ہیں اور اہل حق پر دن بدن غالب آ رہے ہیں۔ منکرین حق کہتے ہیں کہ صرف یہی دنیوی زندگی ہے اور اس کے بعد ارواح کو اٹھایا جائے گا۔ اجسام کو دوبارہ نہیں اٹھایا جائے گا۔ بیدوسیس نے نیک اور حق کے علمبرداروں کو بلایا اور پوچھا تو وہ بھی قیامت کے منکر نکلے حتی کہ وہ بھی لوگوں کو حق اور حواریوں کی ملت سے برگشتہ کرنے والے تھے۔ بادشاہ نے جب نیکوکاروں اور حق کے ٹھیکیداروں کی یہ کیفیت دیکھی تو وہ پریشان ہو کر اپنے گھر داخل ہو گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ فقیرانہ لباس پہن لیا اور راکھ بچھا کر بیٹھ گیا۔ اتنی آہ وفغاں تضرع وزاری میں زمانہ بیت گیا، وہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عرض کرتا اے میرے پروردگار تو ان لوگوں کا اختلاف دیکھ رہا ہے، ان پر کوئی ایسی نشانی نازل فرما جو اس کے عقیدہ کے بطلان کو واضح کر دے۔ بیشک رحمٰن ورحیم اپنے بندوں کی ہلاکت کو پسند نہیں فرماتا۔ اس کی مراد یہ تھی کہ اصحاب کہف پر مطلع فرمادے اور لوگوں کے سامنے ان کی شان بیان کر دے اور ان پر حجت اور دلیل بنا دے کہ ان کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے اور اس میں ذرا برابر شک نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندے بیدوسیس کی دعا قبول فرمائی تاکہ اس پر اپنی نعمتوں کی تکمیل فرمادے اور بکھرے ہوئے اور تفرقہ میں مبتلا مومنین کو جمع فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے اس شہر کے اولیاس نامی شخص کے دل میں یہ ڈال دیا کہ وہ اس غار کے منہ پر کھڑی دیوار کو گرا دے اور اس غار میں بکریوں کا باڑا بنا دے، اس نے دو غلام اجرت پر لیے جنہوں نے پتھر ہٹانے شروع کر دیے۔ انہوں نے غار کا منہ صاف کر دیا اور دروازہ کھول دیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس غار میں سوئے ہوئے لوگوں کو رعب اور دہشت کی وجہ سے دوسرے لوگوں کی آنکھوں سے چھپا دیا تھا جب دونوں مزدوروں نے دروازہ کھولا تو اللہ جو ساری قدرتوں اور قوتوں کا مالک ہے اس نے مردہ نوجوانوں کو زندہ کر دیا اور وہ غار میں خوش وخرم نورانی چہروں اور پاکیزہ نفوس کے ساتھ بیٹھ گئے اور ایک دوسرے پر سلام کرنے لگے، یوں لگتا تھا گویا ابھی رات کی نیند سے بیدار ہوئے ہیں۔ انہوں نے اٹھ کر نماز ادا کی جس طرح وہ پہلے اٹھ کر نماز ادا کرتے تھے۔ ان کے چہروں اور رنگتوں میں کچھ فرق نہ آیا تھا بالکل اسی ہیئت پر تھے جس پر وہ سوئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دقیانوس ہماری طلب اور تلاش میں ہوگا۔ جب نماز سے فارغ ہوئے تو تملیخا سے کہا جو کھانے، پینے کا منتظم تھا کہ تم شہر جا کر خبر لے آؤ کہ لوگ بادشاہ کے پاس ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں؟ ان کا خیال یہ تھا کہ معمول کے مطابق سوئے ہیں۔ اور یہ ان کا خیال تھا کہ پہلے کی نسبت کچھ زیادہ سوئے ہیں حتی کہ ایک دوسرے سے اپنے سونے کے وقت کے متعلق پوچھنے لگے۔ بعض نے کہا بھائی تم کتنا وقت سوئے؟ دوسروں نے کہا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ پھر کہنے لگے تمہارا پروردگار بہتر جانتا ہے کہ تم کتنا وقت سوئے۔ ان کے ذہنوں میں یہ سونے کا وقت کچھ زیادہ نہ تھا۔ تملیخا نے کہا کیا تم اس شہر میں نہیں ہو۔ اس کی مراد یہ تھی کہ آج تمہیں بلایا جائے گا، تمہیں بتوں کیلئے

جانور ذبح کرنے ہوں گے یا تمہیں قتل کر دیا جائے گا۔ جو اللہ چاہے گا وہ ہو کر رہے گا۔ مکسلمینا نے کہا بھائیو! تمہارا مقصود و مدعا اللہ تعالیٰ کی ملاقات ہے تو اللہ کے دشمن کے کہنے پر ایمان کی روشنی حاصل کرنے کے بعد کفر کا اندھیرا قبول نہ کرنا۔ پھر انہوں نے تملیخا کو کہا کہ شہر جاؤ اور جا کر سنو کہ لوگ ہمارے متعلق کیا کہہ رہے ہیں اور دقیانوس کے پاس ہمارے بارے کیسا تذکرہ ہو رہا ہے اور بڑی ہوشیاری سے جانا تا کہ کسی کو تمہاری خبر نہ ہو۔ اور ہمارے لیے کھانا بھی لے آنا لیکن پہلے کی نسبت زیادہ لانا کیونکہ ہم صبح سے بھوکے ہیں۔ تملیخا نے ویسا ہی کیا جیسا کہ پہلے کرتا تھا، یعنی اچھا لباس اتار دیا اور اجنبی کپڑے لیے۔ پھر اپنے خرچ کے پیسوں سے ایک سکہ لیا جس پر دقیانوس کی مہر لگی ہوئی تھی۔ تملیخا غار سے باہر آیا اور دروازے سے گذرا تو غار کے دروازہ سے پتھر ہٹے ہوئے تھے، اسے بڑا تعجب ہوا۔ پھر وہ آگے گذر گیا اور کوئی خاص توجہ نہ دی جب چھپتے چھپاتے شہر کے دروازہ پر پہنچا تا کہ کوئی اسے دیکھ کر پہچان نہ لے۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ دقیانوس اور اس کی آل اولاد تین سو سال پہلے مر چکے ہیں۔ تملیخا گیٹ پر آیا تو دیکھا کہ اس پر ایسی علامات تھیں جو اہل ایمان کی ہوتی ہیں، جبکہ شہر میں اہل ایمان کا غلبہ ہو۔ وہ یہ سب کچھ دیکھ کر بہت حیران ہوا، وہ چھپ کر ادھر ادھر دیکھتا، کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھتا پھر اس نے یہ دروازہ چھوڑا اور دوسرے دروازے پر گیا وہاں بھی اسلامی علامات و نشانات پائے، وہ سوچتا شاید میں کسی دوسرے شہر میں آ گیا ہوں۔ اس نے کئی لوگوں کو دیکھا جو آپس میں محو گفتگو تھے لیکن یہ لوگ پہلے موجود نہ تھے۔ اب وہ حیران و ششدر چل رہا ہے کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔ پھر وہ اسی دروازہ کی طرف لوٹ گیا جس سے داخل ہوا تھا، وہ سوچتا یہ کیا ہوا ہے؟ لیکن کچھ پتہ نہیں چل رہا تھا۔ کل شام تک مسلمان ان اسلامی شعائر کو پسند کرتے تھے لیکن انہیں ظاہر نہیں کرتے تھے لیکن آج یہ سب کچھ ظاہر ہے، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا پھر کہتا خواب تو نہیں ہے۔ اس نے چادر لی اور اپنے سر پر ڈال دی۔ وہ سن رہا تھا کہ لوگ عیسیٰ بن مریم کے نام کی قسمیں کھا رہے ہیں۔ اس کا خوف و ہراس بڑھ گیا، وہ حیران و پریشان شہر کی فصیل سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا، دل میں سوچا کہ کل تک تو عیسیٰ علیہ کا سوائے چند افراد کے نام لینے والا کوئی نہیں تھا۔ آج میں سن رہا ہوں کہ ہر شخص بغیر کسی خوف و ہچکچاہٹ کے عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے رہا ہے۔ کہنے لگا شاید کوئی دوسرا شہر ہے جس میں میں پہنچ چکا ہوں لیکن قسم بخدا مجھے تو اس شہر کے قریب کسی دوسرے شہر کا علم ہی نہیں، وہ حیران و پریشان کھڑا ہو گیا۔ پھر ایک نوجوان سے پوچھا اس شہر کا نام کیا ہے جوان نے کہا اس کا نام افسوس ہے دل میں کہا شاید میرا دماغ اپنی جگہ پر نہیں ہے، مجھے اس شہر سے جلدی نکل جانا چاہئے کہیں ایسا نہ ہو کہ رسوائی ہو اور کسی مصیبت سے دو چار ہونا پڑے پھر کچھ ہوش سنبھالا اور کہنے لگا اس سے قبل کہ لوگ مجھے پہچان لیں میں اگر نکل جاؤں تو زیادہ بہتر ہے، پھر وہ کھانا فروخت کرنے والوں کے قریب گیا، وہ سکہ نکالا جو اسکے پاس تھا۔ دوکاندار کو دیکر کھانا طلب کیا۔ دکاندار نے وہ سکہ اور اس کی مہر دیکھ کر تعجب کیا اور پھر اسے دوسرے ساتھی کی طرف پھینک دیا، اس نے بھی اسی طرح اسے غور سے دیکھا اور اگلے دوست کی طرف پھینک دیا، وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے اس شخص کے ہاتھ پرانے زمانہ کا کوئی خزانہ لگا ہے۔ جب تملیخا نے ان کی یہ باتیں سنی تو انتہائی خوفزدہ ہوا، جسم پر کپکپی طاری ہو گئی، تملیخا کا خیال تھا کہ یہ مجھے پہچان چکے ہیں اور مجھے بادشاہ دقیانوس کے پاس لے جانا چاہتے ہیں۔ لوگ اکٹھا ہونا شروع ہو گئے، وہ اسے پہچاننے کی کوشش کرتے لیکن پہچان نہ سکتے۔ تملیخا نے انتہائی پریشانی کی کیفیت میں کہا تم مجھ پر مہربانی کرو، تم نے میرے پیسے بھی لے لئے اور واپس نہیں کیے اور کھانا بھی تم رکھ لو مجھے ضرورت نہیں ہے۔ لوگوں نے پوچھا تو ہے کون اور تیرا کام اور معاملہ کیا ہے، قسم بخدا تجھے پہلے لوگوں کا کوئی خزانہ ملا ہے تو اسے ہم سے چھپانا چاہتا ہے۔ ہمارے ساتھ چلو اور ہمیں وہ خزانہ دکھاؤ اور ہمیں اس میں شریک

کرو۔ ہم تیرا راز کسی کو نہیں بتائیں گے اگر تو نے ہمیں اپنا وہ خزانہ نہ دکھایا تو ہم تجھے بادشاہ کے پاس لے جائیں گے، ہم تجھے اس کے حوالہ کریں گے اور وہ تجھے قتل کرے گا۔ جب تملیخا نے ان کی یہ کرخت کلام سنی تو کہا جس بات کا مجھے خدشہ تھا وہ تو ہوگئی۔ لوگوں نے کہا اے جوان تو ہم سے اس خزانہ کو چھپا نہیں سکتا۔ تملیخا سوچ رہا تھا کہ اب انہیں کیا جواب دوں، خوف و ہراس طاری تھا اور کچھ بول نہیں رہا تھا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ بولتا نہیں ہے تو انہوں نے اس کی چادر اتار لی اور اسے اس کی گردن میں ڈال کر شہر کی گلیوں میں کھینچنے لگے، حتیٰ کہ سب لوگوں کو اس کی خبر ہوگئی۔ لوگوں نے پوچھا تو بتایا کہ اس شخص کے پاس خزانہ ہے۔ شہر کے بچے بوڑھے سب جمع ہوگئے، اسے گھور گھور کر دیکھنے لگے اور کہتے یہ اس شہر کا باشندہ نہیں ہے ہم نے تو اسے کبھی نہیں دیکھا ہے، تملیخا کو سمجھ نہیں آرہا تھا کہ انہیں کیا جواب دے، جب خوف زیادہ ہوا تو وہ ساکت و جامد کھڑا ہوگیا اسے یقین تھا کہ اس کا باپ اور اس کے بھائی اسی شہر میں ہیں اور اس کا تعلق شہر کے امراء سے ہے۔ جب وہ سنیں گے تو اسے چھڑا کر لے جائیں گے، وہ اسی انتظار میں تھا کہ ابھی میرے خاندان کا کوئی فرد آ جائے گا اور ان ظالم ہاتھوں سے مجھے رہائی دلائے گا۔ پھر انہوں نے اسے اٹھایا اور شہر کے ارباب بست و کشاد کے پاس لے گئے۔ وہ شہر کے دونوں رئیس بہت نیک صلاح فطرت تھے۔ ایک کا نام اریوس اور دوسرے کا نام اشطیوس تھا۔ جب تملیخا کو ان سرداروں کے پاس لے جارہے تھے تو وہ سوچ رہا تھا کہ اب یہ مجھے دقیانوس کے پاس لے جارہے ہیں، وہ بیچارہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا اور لوگ اس سے اس طرح مذاق کرتے جیسے پاگل سے مذاق کیا جاتا ہے۔ تملیخا رونے لگا پھر اس نے آسمان کی طرف سر اٹھا کر یہ دعا کی اے اللہ اے آسمان اور زمین کے معبود آج مجھے صبر کی دولت عطا فرما اور اپنی جناب سے روح کے ذریعے ظالم بادشاہ کے پاس میری مدد اور تائید فرما۔ دل میں سوچ رہا تھا کہ میری اور میرے بھائیوں کے درمیان اب جدائی ہوجائے گی، کاش انہیں معلوم ہوتا کہ میں کسی مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر انہیں میری اس گرفتاری کا علم ہوتا تو ضرور میرے پاس پہنچتے اور ہم اکٹھے جابر بادشاہ کے سامنے جاتے اور ہم کبھی زندگی اور موت میں ایک دوسرے سے جدا نہ ہوتے۔ تملیخا یہ ساری باتیں اپنے دل میں سوچ رہا تھا کہ کاش واپسی پر اپنے ساتھیوں کو یہ سب باتیں بتا سکتا۔ لوگ اسے دو نیک آدمیوں اریوس اور اشطیوس کے پاس لے گئے۔ تملیخا نے جب یہ دیکھا کہ اسے دقیانوس کے پاس تو نہیں لے جایا گیا۔ اسے کچھ ہوش آیا، حواس درست ہوگئے اور رونا بھی بند ہوگیا۔

اریوس اور اشطیوس نے وہ سکہ لیا، اسے غور سے دیکھا اور تعجب کا اظہار کیا پھر ایک نے تملیخا سے پوچھا یہ خزانہ کہاں کا ہے؟ جو تجھے ملا ہے تملیخا نے کہا مجھے کوئی خزانہ نہیں ملا بلکہ یہ تو وہ سکہ ہے جو مجھے اپنے آباء سے ملا ہے اور اس پر مہر بھی اسی شہر کی ہے لیکن قسم بخدا مجھے اپنے بارے میں بھی سمجھ نہیں آرہی میں تمہیں کیا بتاؤں۔ ایک نے پوچھا تو کون ہے؟ اس نے کہا تملیخا میں اسی شہر کا رہنے والا ہوں۔ انہوں نے پوچھا تیرے باپ کا نام کیا ہے اور تجھے یہاں کوئی جانتا ہے۔ تملیخا نے اپنے باپ کا نام بتایا لیکن اس نام کا کوئی آدمی اس شہر میں نہ تھا۔ اور کوئی آدمی ایسا نہ ملا جو اسے جانتا ہو۔ ایک سردار نے کہا تو جھوٹا ہے اور ہمیں سچی بات نہیں بتا رہا۔ تملیخا کچھ سمجھ نہیں رہا تھا کہ انہیں کیا کیوں اور کیسے تسلی دوں، اس نے خاموشی سے آنکھیں زمین کی طرف جھکا لیں۔ قریب بیٹھے ایک شخص نے کہا یہ تو پاگل ہے۔ بعض نے کہا مجنون نہیں ہے لیکن جان بوجھ کر پاگل بن رہا ہے تاکہ تم سے بھاگ جائے۔ ایک سردار نے کہا کیا تیرا یہ خیال ہے کہ ہم تجھے آزاد کردیں گے اور تیری تصدیق کردیں گے کہ یہ تجھے باپ کی میراث میں ملا ہے۔ اس پر تو مہر تین سو سال پہلے کی ہے، تو جوان لڑکا ہو کر ہمیں بھٹکانا چاہتا ہے اور ہمارا مذاق اڑاتا ہے۔ ہمارے بال سفید ہیں اور تیرے اردگرد شہر کے سردار اور نمبردار بیٹھے ہیں، اس شہر

کے خزانے ہمارے قبضہ میں ہیں، ہمارے پاس تو اس مہر کا کوئی درہم و دینار نہیں ہے۔ مجھے یہ خیال آرہا ہے کہ تجھے قید کرنے کا حکم صادر کروں تا کہ تجھے سخت سزا دی جائے اور پھر تجھے اس وقت تک محبوس رکھوں جب تک کہ تو خزانے کا اعتراف نہ کرے۔ جب حکام نے یہ دھمکی دی تو تملیخا نے انہیں کہا تم پہلے مجھے ایک سوال کا جواب دو۔ اگر وہ تم نے صحیح جواب دے دیا تو میں بھی تمہیں وہ بتا دوں گا جو میرے پاس ہے، انہوں نے کہا پوچھ کیا پوچھتا ہے ہم تجھ سے کچھ نہ چھپائیں گے۔ اس نے پوچھا دقیانوس بادشاہ کا کیا ہوا؟ امراء اور ولاة نے کہا سطح زمین پر اس نام کا بادشاہ ہم نہیں جانتے۔ یہ بادشاہ تو بہت زمانہ پہلے ہلاک ہو چکا ہے، اس کے بعد کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔ تملیخا نے کہا میں تبھی تو حیران ہوں کہ کوئی شخص بھی میری تصدیق نہیں کرے گا۔ ہم ایک جماعت تھے اور ایک دین کے پیروکار تھے اور وہ دین اسلام تھا۔ بادشاہ نے ہمیں بتوں کی عبادت اور ان کے لیے جانور ذبح کرنے پر مجبور کیا تو کل شام ہم اس سے بھاگ نکلے تھے۔ جب صبح ہم بیدار ہوئے تو میں اپنے ساتھیوں کیلئے کھانا لینے اور حالات کا جائزہ لینے کیلئے نکلا۔ بالکل ہم اسی طرح تھے جیسا تم دیکھ رہے ہو۔ تم میرے ساتھ بنجلوس پہاڑ کی غار کی طرف چلو میں تمہیں اپنے ساتھیوں سے ملاقات کراتا ہوں۔

اریوس نے جب تملیخا کی باتیں سنی تو کہا اے میری قوم شاید یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہو جو تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے اس نوجوان کے ہاتھوں ظاہر فرمائی ہو، تم بھی ہمارے ساتھ چلو تا کہ یہ شخص ہمیں اپنے ساتھیوں سے ملائے۔ تملیخا کے ساتھ اریوس، اسطیوس چل پڑے اور شہر کے بڑے چھوٹے سب نکل پڑے تا کہ اصحاب کہف کو دیکھیں۔ ادھر جب اصحاب کہف نے دیکھا کہ تملیخا نے کھانا لانے میں دیر لگا دی ہے تو کہنے لگے لگتا ہے وہ پکڑا گیا ہے اور اسے دقیانوس بادشاہ کے پاس پہنچا دیا گیا ہے۔ وہ یہی سوچ رہے تھے اور خوف کر رہے تھے کہ انہیں آوازیں اور ان کی طرف آتے ہوئے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ ان کا خیال تھا کہ ظالم دقیانوس نے ہمیں پکڑنے کیلئے اپنے سپاہیوں اور کارندوں کو بھیجا ہے۔ وہ نماز کیلئے کھڑے ہو گئے، ایک دوسرے پر سلام کہا اور وصیت فرمائی اور کہا ہم چلیں اور اپنے بھائی تملیخا کو لے آئیں۔ وہ اب ظالم دقیانوس کے سامنے منتظر ہوگا کہ ہم کب پہنچتے ہیں؟ یہ وہ ساری گفتگو غار کے اندر بیٹھ کر کر رہے تھے، انہوں نے اندر سے اریوس اور اس کے ساتھیوں کو غار کے دروازہ پر کھڑے ہوئے دیکھا، تملیخا اندر گیا تو رو رہا تھا۔ جب انہوں نے اسے روتے ہوئے دیکھا تو وہ بھی رونے لگے پھر انہوں نے اس کی تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے پورا واقعہ تفصیل سے بیان کیا۔ اس وقت وہ سب جان گئے کہ وہ اللہ کے حکم سے اتنا طویل زمانہ غار میں سوئے رہے اور پھر بیدار ہوئے تا کہ لوگوں کیلئے آیت (نشانی) الٰہی اور قیامت کی تصدیق کا باعث بن جائیں اور لوگوں کو یقین ہو جائے کہ قیامت آنے والی ہے، اس کے وقوع میں ذرا شک نہیں ہے پھر تملیخا کے پیچھے اریوس غار میں داخل ہوا تو اس نے (نحاس) تانبے کا صندوق دیکھا جس پر چاندی کی مہر لگائی گئی تھی۔ وہ غار کے دروازہ پر رک گیا اور شہر کے ایک امیر کو بلایا، اس نے تابوت کھولا تو اس میں رصاص کی دو تختیاں تھیں جن پر لکھا ہوا تھا کہ مکسلمینا، مخشلمینا، تملیخا، مرطونس، بشرطونس، بیریوس، دینومس، یطبومونس نوجوان تھے جو دقیانوس بادشاہ سے بھاگ گئے تھے تا کہ وہ ظالم بادشاہ انہیں اپنے دین سے برگشتہ نہ کر دے اور وہ اس غار میں داخل ہوئے تھے۔ جب ان کے ٹھکانے کا پتہ چلا تھا تو پتھروں سے غار کا منہ بند کر دیا گیا تھا۔ اور ہم نے یہ تحریر اس لیے لکھی ہے تا کہ بعد میں آنے والے ان لوگوں کو ان کی تاریخ و سیرت معلوم ہو جو انہیں پائیں۔ اور جب وہ اس تحریر کو پڑھیں تو تعجب کریں اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کریں۔

اس نعمت پر کہ اس نے اپنی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دکھائی پھر ان نوجوانوں نے ان لوگوں کے بارے بتلایا جو

دقیانوس بادشاہ کی ظلم کی چکی میں پس گئے تھے۔ پھر اریوس اور اس کے ساتھیوں نے ایک خط بیدوسیس بادشاہ کی طرف لکھا کہ وہ جلدی
جلدی پہنچ جائے تاکہ اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی دیکھ لے، جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے دربارشاہی میں ظاہر فرمایا ہے اور اس
نشانی کو تمام جہانوں کیلئے نشانی بتایا ہے تاکہ ان کے لیے نور اور روشنی کا باعث بنے اور قیامت پر یقین کا سبب بنے، ان نوجوانوں کے
پاس جلدی پہنچو جن کو اللہ تعالیٰ نے دوبارہ زندہ کیا ہے حالانکہ یہ تین سو سال قبل مر چکے تھے۔ بادشاہ کو جب یہ خبر پہنچی تو اس کے حواس
درست ہو گئے اور طبیعت سنبھل گئی اور کہا اے آسمانوں اور زمین کے مالک میں تیری تعریف کرتا ہوں اور تیری بندگی کرتا ہوں اور تجھے
ہر نقص اور عیب سے پاک جانتا ہوں، تو نے مجھ پر بڑا اکرم فرمایا اور رحم فرمایا۔ تو نے اس نور کو نہیں بجھایا جو تو نے میرے آباء و اجداد کیلئے
اور عبد صالح قسطیطینوس بادشاہ کیلئے روشن کیا تھا۔ جب ملک کے دوسرے باشندوں کو خبر ہوئی تو وہ بھی سوار ہو کر بادشاہ کے ساتھ نکل
پڑے حتیٰ کہ افسوس شہر میں پہنچے اور پھر غار کی طرف چڑھے۔ جب نوجوانوں نے بیدوسیس کو دیکھا تو خوش ہوئے اور سجدے میں گر
گئے۔ بیدوسیس ان کے سامنے کھڑا ہوا اور پھر دوزانو ہو کر انہیں گلے لگایا۔ وہ بھی حمد و ثنا کرتے ہوئے اس کے سامنے بیٹھ گئے پھر
نوجوانوں نے بیدوسیس سے کہا ہم تجھے اللہ کے سپرد کرتے ہیں، تجھ پر سلامتی اور اللہ کی رحمت ہو۔ اللہ تعالیٰ تیری اور تیرے ملک کی
حفاظت فرمائے، اور ہم تجھے جن و انس کے شر سے اللہ کی پناہ میں دیتے ہیں۔ بادشاہ ابھی وہیں کھڑا تھا کہ وہ اپنی خواب گاہوں کی طرف
لوٹے اور سو گئے، اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمالیں۔ بادشاہ ان کی طرف گیا اور ان پر ان کے کپڑے ڈال دیے اور حکم
دیا کہ ان میں سے ہر شخص کو سونے کے تابوت میں رکھا جائے، شام ہوئی تو بادشاہ سو گیا، خواب میں اسے اصحاب کہف کی زیارت ہوئی تو
انہوں نے کہا ہم سونے اور چاندی سے پیدا نہیں کیے گئے ہم مٹی سے پیدا کیے گئے، ہیں اور مٹی کی طرف ہی جائیں گے۔ ہمیں غار کے
اندر مٹی پر ہی چھوڑ دو، جس طرح ہم پہلے پڑے تھے حتیٰ کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ہمیں دوبارہ یہاں سے اٹھائے۔ بادشاہ نے اس
وقت شیشم کی لکڑی کے تابوت بنوانے کا حکم دیا۔ جب وہ ان کو چھوڑ کر چلے گئے تو اللہ تعالیٰ نے رعب و دہشت کے ذریعے ان کو لوگوں
سے محجوب کر دیا۔ رعب و خوف کی وجہ سے کوئی شخص اندر داخل ہونے کی طاقت نہیں رکھتا تھا۔ بادشاہ نے غار کے منہ پر مسجد بنانے کا حکم
دیا جس میں لوگ نماز ادا کریں اور ان کی یاد منانے کیلئے ایک اجتماع کیا اور پھر حکم دیا کہ ہر سال ان کی یاد میں ایک اجتماع کیا جائے۔

بعض مؤرخین نے لکھا ہے کہ تملیخا کو جب نیک بادشاہ کے سامنے لایا گیا تو بادشاہ نے پوچھا تو کون ہے۔ تملیخا نے کہا میں اس شہر کا
رہائشی ہوں اور اس نے بیان کیا کہ میں کل یا کچھ دنوں سے نکلا ہوں، اور بادشاہ نے پہلے سن رکھا تھا کہ ایک نوجوانوں کا گروہ پہلے زمانہ میں گم
ہو گیا تھا اور ان کے اسماء خزانہ میں ایک تختی کے اوپر لکھی ہوئے ہیں، اس نے وہ تختی منگوائی اور ان اسماء کو دیکھا تو ان میں تملیخا کا نام بھی تھا پھر
جب اس تختی سے دوسرے اسماء پڑھے تو تملیخا نے کہا یہ میرے ساتھی ہیں، بادشاہ نے جب یہ سنا تو وہ اور اس کے ساتھ قوم کے چند افراد سوار
ہوئے اور غار کے دروازے پر پہنچ گئے، اس تملیخا نے کہا مجھے چھوڑو تا کہ میں اپنے ساتھیوں کو خوشخبری سناؤں۔ کیونکہ اگر وہ تمہیں میرے
ساتھ دیکھیں گے تو ڈر جائیں گے۔ تملیخا اندر داخل ہوا اور انہیں بشارت دی تو اللہ تعالیٰ نے اسی وقت ان کی روحیں قبض فرمالیں اور ان کے
نشانات کو بھی مٹا دیا۔ باقی لوگ ان کو نہ دیکھ سکے (1)۔ ارشاد الٰہی اَوَى الْفِتْيَةُ إِلَى الْكَهْفِ اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

فَضَرَبْنَا عَلَىٰٓ اٰذَانِهِمْ فِي الْكَهْفِ سِنِيْنَ عَدَدًا ﴿۱۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 60-156 (التجاریۃ)

''پس ہم نے بند کردیئے ان کے کان (سننے سے) اس غار میں کئی سال تک جو گنے ہوئے تھے۔ ۱؎ ''

۱؎ یعنی ہم نے ان کے کانوں پر ایسے پردے ڈال دیے جو آواز سننے سے مانع تھے یعنی ہم نے انہیں ایسی نیند سلا دیا کہ کوئی آواز انہیں بیدار نہیں کر سکتی تھی۔ یہاں مفعول کو حذف کیا گیا ہے جیسے بَنٰی عَلٰی اِمْرَاَتِہٖ کے جملہ میں مفعول حذف کیا گیا ہے۔ فی الکھف ضربنا کی ظرف ہے اور سنین کی صفت عدداً اس لئے لگائی تاکہ کثرت پر دلالت کرے کیونکہ تھوڑی مقدار کو شمار نہیں کیا جاتا۔

ثُمَّ بَعَثْنٰهُمْ لِنَعْلَمَ اَیُّ الْحِزْبَیْنِ اَحْصٰى لِمَا لَبِثُوْۤا اَمَدًا ﴿۱۲﴾

''پھر ہم نے انہیں بیدار کردیا تاکہ ہم دیکھیں کہ ان دو گروہوں میں سے کون صحیح شمار کرسکتا ہے اس مدت کا جو وہ (غار میں) ٹھہرے تھے۔ ۱؎ ''

۱؎ لنعلم کا یہ مطلب نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی ذات کو پہلے علم نہیں تھا اور اس واقعہ کے بعد علم ہوگا بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ ہمارا علم اولاً جس کا تعلق اس واقعہ سے استقبالی تھا اب اس کا تعلق حالی بن جائے۔ اَمَدًا کا معنی غایت ہے۔ ای مبتدا ہے احصی فعل ماضی امداً مفعول اور لمالبثوا اس کا حال ہے اور ما مصدریہ ہے۔ ای میں استفہام کا معنی پایا جاتا ہے اس لئے لنعلم میں تعلیق کی صورت ہوگی۔ معنی یہ ہوگا کہ ان دو گروہوں میں سے کون زیادہ ان کے ٹھہرنے کے زمانہ کو صحیح ضبط میں لانے والا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لام زائدہ ہے اور ومالبثوا احصیٰ کا مفعول ہے۔ اور ماموصولہ ہے اور امداً تمیز ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں احصی الاحصاء سے زائدہ حروف کے حذف کے ساتھ اسم تفصیل ہے جیسے عرب کہتے ہیں احصیٰ للمال۔ و افلس من ابن المدلف اور امداً اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر یہ اسم خود دلالت کر رہا ہے۔ جیسا کہ کسی کا قول ہے۔ و اضرب بالسیوف القوانسا

نَحْنُ نَقُصُّ عَلَیْكَ نَبَاَهُمْ بِالْحَقِّ ؕ اِنَّهُمْ فِتْیَةٌ اٰمَنُوْا بِرَبِّهِمْ وَ زِدْنٰهُمْ هُدًى ﴿۱۳﴾

''(اے حبیب) ہم بیان کرتے ہیں آپ سے ان کی خبر ٹھیک ٹھیک بیشک وہ چند نوجوان تھے جو اپنے رب پر ایمان لائے اور ہم نے ان کے (نور) ہدایت میں اضافہ کردیا۔ ۱؎ ''

۱؎ نباھم میں ھم ضمیر کا مرجع اصحاب کہف ہیں۔ فتیٰ کی جمع فتیۃ ہے جیسے صبی کی جمع صبیۃ ہے اس کا معنی نوجوان ہے، یعنی جب وہ اپنے رب پر ایمان لائے تو ہم نے حقیقی ایمان عطا فرمایا جو نفس کی فناء کے بعد حاصل ہوتا ہے، اور اس ایمان کا مرتبہ اس ایمان مجازی سے کئی درجہ بلند ہوتا ہے جو اقرار باللسان اور تصدیق بالقلب کے ساتھ ہوتا ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے نفس سرکشی اور کفران نعمت کا ارتکاب کرتا رہتا ہے۔

وَّ رَبَطْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اِذْ قَامُوْا فَقَالُوْا رَبُّنَا رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ لَنْ نَّدْعُوَاۡ
مِنْ دُوْنِهٖۤ اِلٰهًا لَّقَدْ قُلْنَاۤ اِذًا شَطَطًا ﴿۱۴﴾

''اور ہم نے مضبوط کردیا ان کے دلوں کو جب وہ راہ حق میں کھڑے ہوگئے ۱؎ تو انہوں نے (برملا) کہہ دیا ہمارا پروردگار وہ ہے جو پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا ہم ہرگز نہیں پکاریں گے اس کے سوا کسی معبود کو (اگر ہم ایسا کریں) تو گویا ہم نے ایسی بات کہی جو حق سے دور ہے۔ ۲؎ ''

ل یعنی ترک وطن، مال واولاد کی جدائی پر ہم نے انہیں صبر کی دولت سے نوازا اور اظہار حق کی جرات کا جذبہ عطا فرمایا اور ظالم حکمران دقیانوس کے غلط عقائد اور فاسد نظریات کو برسر محفل رد کرنے کی ہمت عطا فرمائی اور ساری جراتیں، یہ ساری ہمتیں فناء قلب کے بعد ہوتی ہیں۔ جس وقت دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت، اس کی خشیت و ہیبت کے سوا کسی کی محبت اور خوف نہیں ہوتا اور عاشق دلفگار کسی غیر کی طرف نظر اٹھا کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا اور لوگ اس محب صادق کی نظر میں بے وقعت ہو جاتے ہیں۔

ع جب وہ دقیانوس کی کچہری میں کھڑے تھے اور ظالم و جابر دقیانوس بتوں کی عبادت نہ کرنے پر عتاب کر رہا تھا تو انہوں نے دوٹوک الفاظ میں فاتحانہ اور فاخرانہ لہجہ میں اعلان کیا (یہ بت جو تمہارے معماروں کے تراشے ہوئے ہیں ہماری تقدس مآب جبینوں کے سجدوں کے مستحق نہیں ہو سکتے) ہمارا پروردگار تو وہ ہے جو بلند و بالا آسمانوں اور گوناگوں نعمتوں سے مالا مال زمین کا پروردگار ہے۔ ہم اس کے سوا کسی کو معبود نہیں مانتے۔ اگر ہم اس قدرتوں کے مالک کے علاوہ کسی غیر کو خدا مانیں تو ہم حق سے تجاوز کرنے والے اور حد وقدر سے دور بات کرنے والے ہونگے اور انتہائی ظالم ہونگے۔

هٰٓؤُلَآءِ قَوْمُنَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اٰلِهَةً ؕ لَوْلَا یَاْتُوْنَ عَلَیْهِمْ بِسُلْطٰنٍۭ بَیِّنٍ ؕ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَی اللّٰهِ كَذِبًا ﴿۱۵﴾

''یہ ہماری قوم ہے جنہوں نے بنالیا ہے اس کے سوا غیروں کو (اپنے) خدا۔ کیوں نہیں پیش کرتے ان (کی خدائی) پر کوئی ایسی دلیل جو روشن ہو ل ورنہ پھر اس سے بڑا ظالم کون ہے جو اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان باندھتا ہے ع''

ل هولاء مبتداء ہے اور قومنا عطف بیان ہے هولاء کا۔ دونہ کی ضمیر کا مرجع اللہ ہے الهة سے مراد وہ بت اور مورتیاں ہیں جن کی وہ عبادت کرتے تھے۔ اتخذوا کا جملہ هولاء مبتدا کی خبر ہے۔ اور جملہ خبریہ انکار کے معنی میں ہے لولا بمعنی هلا ہے۔ علیهم سے مراد علی عبادتهم ہے مضاف حذف کیا گیا ہے۔ سلطان بین، ظاہر دلیل یعنی یہ ہماری احمق قوم جو بتوں کو خدا مانتی ہے کوئی واضح دلیل کیوں نہیں پیش کرتے کیونکہ عقیدہ ہمیشہ دلیل اور برہان پر مبنی ہوتا ہے، عقائد میں ظن اور تقلید کی اتباع جائز نہیں ہے۔ اس جملہ میں کفار کا منہ بند کرنا مقصود ہے کیونکہ بتوں کی عبادت پر دلیل قائم کرنا محال ہے۔

ع اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جو اللہ کا کسی مخلوق کو شریک ٹھہراتا ہے اور اس کا بیٹا ہونے کا قول کرتا ہے۔ بہتان لگانا کسی پر بھی ایک ظلم اور ناقابل معافی جرم ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کی ذات پر بہتان لگانے والا کتنا ظالم اور بڑا مجرم ہوگا۔

وَ اِذِ اعْتَزَلْتُمُوْهُمْ وَ مَا یَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ فَاْوٗٓا اِلَی الْكَهْفِ یَنْشُرْ لَكُمْ رَبُّكُمْ مِّنْ رَّحْمَتِهٖ وَ یُهَیِّئْ لَكُمْ مِّنْ اَمْرِكُمْ مِّرْفَقًا ﴿۱۶﴾

''اور جب تم الگ ہو گئے ہو ان (کفار) سے اور ان معبودوں سے جن کی یہ پوجا کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کے سوا ل تو اب پناہ لو غار میں پھیلا دے گا تمہارے لیے تمہارا رب اپنی رحمت (کا دامن) اور مہیا کر دے گا تمہارے لیے تمہارے اس کام میں آسانیاں ع''

ل هم ضمیر کا مرجع قوم ہے اور وَمَا يَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ کا عطف هم ضمیر منصوب پر ہے، یعنی جب قوم اور ان کے معبودوں سے تنہائی کر لی ہے۔ تو غار کو اپنا مسکن اور رہائش گاہ بنالو تاکہ کفار تمہارے پڑوس میں بھی نہ ہوں۔ ان کی ساری قوم اللہ کی بھی عبادت کرتی تھی اور

بتوں کے سامنے بھی سربسجود ہوتی تھی جس طرح سارے مشرک کرتے ہیں۔ وما یعبدون میں ما مصدر یہ بھی ہوسکتا ہے، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ جب تم نے قوم اور اللہ کی عبادت کے سوا ان کی عبادت سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ یہ بھی ہوسکتا کہ ما نافیہ ہو اور یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ان نوجوانوں کے توحید پر ثابت قدم رہنے کی خبر دے رہے ہوں اور معترض کلام ہو جو اذ اور اس کے جواب کے درمیان ان کے اعتزال اور جدائی کے تحقق پر دلالت کرنے کیلئے ذکر کی گئی ہو۔

ے کفار سے الگ غار کو اپنا مسکن بناؤ۔ اللہ تبارک وتعالیٰ تمہارے لیے اپنے غیب کے خزانہ سے رزق کے دروازے کھول دے گا اور دنیا وآخرت میں تمہارے اس ایمان اور اظہار حق اور ترک وطن کے عمل کی بناء پر تم پر اپنی وسیع عنایات فرمائے گا اور تمہارے لیے ہر قدم پر آسانیاں پیدا فرمائے گا، مرفقا میم کے کسرہ اور فاء کے فتحہ کے ساتھ اسم آلہ ہے، یعنی جس چیز سے نفع اور فائدہ اٹھایا جائے، اللہ کے فضل پر کامل یقین کی بناء پر انہوں نے یہ پختہ ارادہ کیا۔ ابوجعفر، نافع اور ابن عامر نے میم کے فتحہ اور فاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک یہ مصدر ہے اور شاذ اوزان میں سے ہے جیسے مرجع المحیض قیاس تو یہ تھا کہ بفتحہ عین ہوتا۔

وَ تَرَى الشَّمْسَ إِذَا طَلَعَتْ تَّزٰوَرُ عَنْ كَهْفِهِمْ ذَاتَ الْيَمِيْنِ وَ إِذَا غَرَبَتْ تَّقْرِضُهُمْ ذَاتَ الشِّمَالِ وَهُمْ فِيْ فَجْوَةٍ مِّنْهُ ۗ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ ۗ مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ وَلِيًّا مُّرْشِدًا ﴿۱۷﴾

''اور تو دیکھے گا سورج کو جب وہ ابھرتا ہے تو وہ ہٹ کر گزرتا ہے ان کی غار سے دائیں جانب اور جب وہ ڈوبتا ہے تو بائیں طرف کتراتا ہوا ڈوبتا ہے اور وہ (سو رہے) ہیں ایک کشادہ جگہ غار میں لے (سورج کا) یوں (طلوع وغروب) اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے ۲ (حقیقت یہ ہے) کہ جسے اللہ تعالیٰ ہدایت دے وہی ہدایت یافتہ ہے ۳ اور جسے وہ گمراہ کردے تو تو نہیں پائیگا اس کے لیے کوئی مددگار (اور) راہنما ۴''

لے وَتَرَى میں خطاب رسول ﷺ کو ہے یا ہر شخص کو ہے۔ ابن عامر اور یعقوب نے تزور یعنی زاء کے سکون اور راء کے تشدید کے ساتھ تحمر کے وزن پر باب افعلال سے پڑھا ہے اور کوفیوں نے تاء کے فتحہ۔ زاء مخففہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے زاء مشددہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے، اصل میں تتزاور تھا۔ کوفیوں نے ایک تاء کو حذف کیا اور باقی قراء نے تاء کو زاء میں ادغام کر دیا اور یہ سارے صیغے زور سے مشتق ہیں جس کا معنی مائل ہونا ہے۔ یعنی سورج ہٹ کر گزرتا ہے، ان پر اس کی شعاعیں نہیں پڑتیں۔ اور جب غروب ہوتا ہے تو بھی ان سے ہٹ کر گزرتا ہے اور ایک کھلی، وسیع غار کے وسط میں سوئے پڑے ہیں جہاں انہیں ہوا کی تازگی اور راحت تو پہنچتی ہے لیکن غار کی تکلیف یا سورج کی گرمی کا اثر وہاں نہیں پہنچتا۔

ابن قتیبہ فرماتے ہیں ان کی غار بنات النعش کے سامنے تھی (1) پس اس طرح ہے کہ غار کے سامنے قریب ترین مشرق ومغرب راس سرطان کا مشرق اور مغرب ہے، جب سورج کا مدار اور راس سرطان کا مدار ایک ہوتا ہے تو سورج راس سرطان کی دائیں جانب طلوع ہوتا ہے، یہ وہ جانب ہے جو مغرب سے متصل ہے اور بائیں جانب سرطان کے مقابل غروب ہوتا ہے۔ پس سورج کی شعاعیں غار کی دونوں طرفوں پر پڑتی تھیں جس کی وجہ سے عفونت اور بدبو کم ہوتی تھی، ہوا معتدل رہتی تھی اور ان پاکبازوں پر سورج کی شعاعیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ)

نہ پڑتی تھیں تا کہ ان کو کسی قسم کی تکلیف نہ ہو اور ان کی نیند میں خلل نہ آئے اور ان کے کپڑے بھی بوسیدہ نہ ہوں۔

بعض علماء فرماتے ہیں ابن قتیبہ کا یہ قول غلط ہے کیونکہ غار اگر بنات النعش کی طرف بھی ہو اور اس وجہ سے ان پر دھوپ نہ بھی پڑتی ہو۔ تب بھی یہ درست نہیں ہے(1) کیونکہ حقیقت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے ذریعہ سے سورج کو ان سے پھیر دیا تھا اور سورج ان کے درمیان خود ہی یہ بندوبست فرمایا تھا کہ ان پر سورج کی کرنیں نہ پڑتی تھیں۔ آئندہ ارشاد بھی قدرت الٰہیہ ہونے کی دلیل ہے۔

۴۔ یہ اللہ تعالیٰ کی صنعت گری اور کرشمہ سازی ہے جس سے عبرت حاصل کی جاسکتی ہے، یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے، کہ ان توحید کے پرستاروں کی شان، ان کا غار کو پناہ گاہ بنانا اور آپ کا ان کے واقعہ کو بیان کرنا یہ سب اللہ تعالیٰ نشانیوں میں سے ہیں۔

۵۔ نافع اور ابوعمرو نے وصل کی صورت میں المھتدی یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء وصل و وقف دونوں صورتوں میں یاء کو حذف کرتے ہیں۔ مھتد سے مراد وہ ہے جسے دنیا و آخرت دونوں جہاں کی فلاح و کامیابی مل جائے۔ اور اس جملہ سے مراد یا تو اصحاب کہف کی تعریف و ثناء ہے یا اس بات پر تنبیہ مقصود ہے کہ اس قسم کی ان گنت آیات موجود ہیں لیکن ان سے فائدہ اور بصیرت اسے حاصل ہوتی ہے جسے اللہ تعالیٰ ان آیات میں غور و فکر کی توفیق مرحمت فرماتا ہے اور ان سے عبرت حاصل کرنے کا ذوق بخشتا ہے۔

۶۔ اور جسے اللہ تعالیٰ گمراہ کرتا ہے اور اس کی راہنمائی نہیں فرماتا اس کا کوئی مرشد و راہنما تجھے نہیں ملے گا۔

وَتَحْسَبُهُمْ أَيْقَاظًا وَّهُمْ رُقُودٌ ۖ وَّنُقَلِّبُهُمْ ذَاتَ الْيَمِينِ وَذَاتَ الشِّمَالِ ۖ وَكَلْبُهُم بَاسِطٌ ذِرَاعَيْهِ بِالْوَصِيدِ ۚ لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا وَّلَمُلِئْتَ مِنْهُمْ رُعْبًا ﴿١٨﴾

"(اور اگر تو دیکھے تو) تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں ۱ اور ہم ان کی کروٹ بدلتے رہتے ہیں (کبھی) دائیں جانب اور (کبھی) بائیں جانب ۲ اور ان کا کتا پھیلائے بیٹھا ہے اپنے دونوں بازو ان کی دہلیز پر ۳ اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو اور تو بھر جائے ان کے (منظر) کو دیکھ کر ہیبت سے ۴"

۱۔ ایقاظ جمع ہے یقظ کی چونکہ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں یا کثرت سے کروٹیں بدلتے تھے اس لئے تو انہیں بیدار خیال کرے گا حالانکہ وہ سو رہے ہیں۔ رقود جمع ہے راقد کی جیسے قاعد کی جمع قعود آئی ہے۔

۲۔ ہم ان کے ارادہ کے بغیر ان کے سونے کی حالت میں ان کی کروٹیں بدلتے ہیں کبھی دائیں جانب اور کبھی بائیں جانب۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ سال میں ایک مرتبہ کروٹ بدلتے تھے تا کہ ان کے گوشت کو مٹی نہ کھا جائے۔ بعض علماء فرماتے ہیں دسویں محرم کا دن ان کی کروٹ بدلنے کا دن تھا۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں ہر سال ایک کروٹ بدلتے تھے(2)۔

۳۔ یہ حالت ماضیہ کی حکایت ہے، اسی وجہ سے اسم فاعل عامل بھی ہے لیکن کوفی علماء اسم فاعل کو مطلقاً عمل کراتے ہیں۔ مجاہد اور ضحاک فرماتے ہیں وصید کا معنی غار کا صحن ہے اور عطا فرماتے ہیں دہلیز ہے۔ سدی فرماتے ہیں دروازہ ہے۔ ابن عباس سے عکرمہ نے ایک روایت یہی نقل کی ہے۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں وہ کتوں کی جنس سے ایک کتا تھا(3) ابن جریج سے مروی ہے کہ وہ شیر تھا، شیر کو بھی کتا کہا جاتا ہے جیسا کہ نبی کریم ﷺ نے عتبہ بن ابی لہب کے حق میں بددعا فرمائی تو یہ الفاظ فرمائے اَللّٰهُمَّ سَلِّطْ عَلَيْهِ كَلْبًا مِّنْ كِلَابِكَ تو عتبہ کو شیر نے پھاڑ ڈالا تھا۔ پہلا قول معروف ہے کہ وہ عام کتا ہی تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ چتکبرا کتا تھا۔ آپ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ)   2۔ ایضاً   3۔ ایضاً

ایک قول یہ بھی مروی ہے کہ وہ قلطی سے بڑا اور کردی (کتے) سے چھوٹا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں وہ زرد رنگ کا تھا۔ قرطبی فرماتے ہیں وہ سرخی مائل شدید زرد رنگ کا تھا۔ کلبی کہتے ہیں اس کا رنگ خلیج کی طرح تھا۔ بعض فرماتے ہیں۔ چھت کی طرح تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں اس کا نام قطمیر تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے اس کا نام زبان تھا۔ اوزاعی نے اس کا نام تقود، سعدی نے ثور، کعب نے صہبا ذکر کیا ہے، خالد بن معدان فرماتے ہیں جنت میں اصحاب کہف کے کتے اور بلغام کے گدھے کے علاوہ کوئی جانور نہ ہوگا، سدی فرماتے ہیں اصحاب کہف جب کروٹ بدلتے تو کتا بھی ان کے ساتھ کروٹ بدلتا، جب وہ دائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا اپنا دایاں کان موڑ کر اس پر سو جاتا اور جب وہ بائیں جانب کروٹ بدلتے تو کتا اپنا بایاں کان موڑ کر اس پر سو جاتا (1)۔

اطلعت کا خطاب محمد ﷺ کو ہے فِرارًا لولیت کا مفعول مطلق ہے کیونکہ یہ اس کے مصدر کی ایک نوع ہے یا مفعول لہ کے اعتبار سے منصوب ہے یا حال کی بنا پر منصوب ہے ملئت کو نافع اور ابن کثیر نے لام کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ باقی قراء نے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ رعب کا معنی خوف ہے۔ کلبی لکھتے ہیں دل خوف سے اس لئے بھر جائے گا کیونکہ ان کی آنکھیں اس بیدار شخص کی طرح کھلی ہوتی ہیں جو بات کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور بعض نے خوف کی وجہ یہ لکھی ہے کہ ان کے بال لمبے اور ناخن بہت طویل تھے اور بغیر کسی حس اور شعور کے پہلو بدل رہے تھے۔ بعض علماء نے رعب اور ہیبت کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سارے ماحول کو اتنا بھیانک بنا دیا تھا کہ کوئی شخص اندر داخل ہونے کی جرأت نہیں کرتا تھا۔ صحیح اور مختار وجہ یہی ہے۔ اس توجیہ پر سعید بن جبیر کی روایت دلالت کرتی ہے جو انہوں نے ابن عباس سے روایت کی ہے، فرماتے ہیں ہم حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی معیت میں روم کی طرف غزوہ مضیق پر گئے تو ہمارا گذر اس غار سے ہوا جس میں اصحاب کہف تھے۔ امیر معاویہ نے فرمایا اگر ہمارے لیے ان لوگوں سے پردہ ہٹایا جاتا تو ہم انہیں دیکھ لیتے۔ ابن عباس نے فرمایا جب اسے دیکھنے سے روکا گیا جو آپ سے بہتر تھے (آپ کس باغ کی مولی ہیں) انہیں اللہ تعالیٰ نے فرمایا لَوِ اطَّلَعْتَ عَلَيْهِمْ لَوَلَّيْتَ مِنْهُمْ فِرَارًا۔ (اگر تو جھانک کر انہیں دیکھے تو ان سے منہ پھیر کر بھاگ کھڑا ہو۔) حضرت امیر معاویہ نے ان کی بات نہ سنی اور کچھ افراد کو بھیجا کہ تم جا کر دیکھو۔ جب وہ غار میں داخل ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے ان پر ایسی ہوا چلائی جس نے انہیں جلا دیا (2)۔ اس روایت کو ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے نقل کیا ہے۔

وَكَذٰلِكَ بَعَثْنٰهُمْ لِيَتَسَآءَلُوْا بَيْنَهُمْ ۭ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ كَمْ لَبِثْتُمْ ۭ قَالُوْا لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ۭ قَالُوْا رَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثْتُمْ ۭ فَابْعَثُوْٓا اَحَدَكُمْ بِوَرِقِكُمْ هٰذِهٖٓ اِلَى الْمَدِيْنَةِ فَلْيَنْظُرْ اَيُّهَآ اَزْكٰى طَعَامًا فَلْيَاْتِكُمْ بِرِزْقٍ مِّنْهُ وَلْيَتَلَطَّفْ وَلَا يُشْعِرَنَّ بِكُمْ اَحَدًا ﴿۱۹﴾

"اور اسی طرح ہم نے انہیں بیدار کر دیا تاکہ وہ ایک دوسرے سے آپس میں پوچھیں کہنے لگا ایک کہنے والا ان سے کہ تم یہاں کتنی مدت ٹھہرے ہو؟ بعض نے کہا ہم ٹھہرے ہوں گے ایک دن یا دن کا کچھ حصہ دوسروں نے کہا تمہارا رب بہتر جانتا ہے جتنی مدت تم ٹھہرے ہو پس بھیجو کسی کو اپنے ساتھیوں سے اپنے ایک سکہ کے ساتھ شہر کی طرف پس وہ دیکھے کہ کس کے ہاں عمدہ پاکیزہ کھانا ملتا ہے پس وہ لے آئے تمہارے پاس کھانا وہاں سے اسے چاہیے کہ وہ خوش خلقی سے کام لے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 166 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 167

اور کسی کو تمہاری خبر نہ ہونے دے لہ''

لہ ہم نے انہیں اتنا طویل زمانہ غار میں سلائے رکھا اور ان کے جسموں کو بوسیدہ ہونے سے بھی بچائے رکھا۔ یہ اتنی طویل نیند جو موت کے مشابہ تھی ہماری قدرت کی نشانیوں سے ایک نشانی تھی اور انہیں بیدار کرنے سے مقصود یہ تھا کہ وہ ایک دوسرے سے نیند کی مدت کا سوال کریں، اپنے احوال اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا عرفان حاصل کریں پس اس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ پر یقین بڑھ جائے گا اور وہ قیامت کے وقوع پر اسی منظر سے دلیل پکڑیں گے اور اللہ کے انعام پر شکر ادا کریں گے۔ اس صورت میں لام لام علت ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ لام عاقبت ہے کیونکہ سوال کرنے کی خاطر تو انہیں بیدار نہیں کیا گیا تھا(1)۔ مکسلمینا نے پوچھا تم کتنی مدت سوئے رہے، چونکہ وہ معمول سے کچھ زیادہ سوگئے تھے اس لئے پوچھ رہے تھے۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ان کی نمازیں جو فوت ہوگئیں تھی ان کی تعداد شمار کرنے کیلئے پوچھ رہے تھے۔ ہم جب غار میں داخل ہوئے تھے تو صبح کا وقت تھا اور جب بیدار ہوئے تو شام کا وقت تھا یہ مدت پورا ایک دن بنتی ہے۔ انہوں نے غور سے دیکھا تو سورج کا کچھ حصہ باقی تھا تو انہوں نے کہا دن کا کچھ حصہ ہم سوئے رہے۔ یہ جواب ظن غالب پر مبنی ہے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ ظن غالب کے مطابق بات کرنا جائز ہے اور پھر جب انہوں نے اپنے بالوں اور ناخنوں کو دیکھا تو سوچنے لگے کہ ہم تو طویل وقت سے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کے رئیس مکسلمینا نے جب یہ اختلاف سنا تو کہا اختلاف کو چھوڑو تملیخا کو بھیجو وہ یہ سکہ لے جائے اور شہر میں دیکھے کہ پاکیزہ کھانا کسی کے پاس ہے۔ المدینہ سے مراد بعض کے نزدیک طرطوس کا شہر ہے اور زمانہ جاہلیت میں اس کا نام افسوس تھا پھر اسلام آیا تو اس کا نام طرطوس رکھا گیا۔ ان کا سکے ساتھ لے جانا دلیل ہے کہ زادراہ ساتھ لینا متوکلین کی رائے ہے ورقکم کو ابو عمر، حمزہ اور ابو بکر نے راء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، معنی دونوں کا ایک ہی ہے، مراد چاندی کا سکہ ہے جس پر مہر ہو یا نہ ہو، پاکیزہ کھانے سے مراد پاک اور حلال کھانا ہے جو غصب یا حرام طریقہ سے حاصل نہ کیا گیا ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں تملیخا کو انہوں نے کہا کہ یہ تلاش کرنا کہ اللہ کا نام لے کر جس نے ذبح کیا ہو اس سے گوشت خریدنا۔ کیونکہ شہر میں ایماندار لوگ موجود تھے جو اپنے ایمان کو مخفی رکھتے تھے۔ ضحاک نے ازکی کا معنی اطیب (پاکیزہ) مقاتل بن حیان نے اجود، عکرمہ نے اکثر (زیادہ) لکھا ہے، زکوٰۃ کا اصل معنی زیادتی ہے اور بعض علماء نے اس کا معنی سستا کھانا کیا ہے(2) فرمایا ولیتلطف کا معنی یہ ہے کہ وہ معاملہ میں خوش خلقی کا مظاہرہ کرے تاکہ اسے دھوکا نہ دیا جائے یا لطیف طریقہ اپنائے تاکہ پہچانا نہ جائے اور کوئی ایسا عمل نہ کرے جو ہماری پہچان کا باعث بنے۔ اشعار کے فعل سے تعبیر اس لئے فرمایا کیونکہ وہ فعل اشعار کا سبب بنے گا۔

إِنَّهُمْ إِن يَظْهَرُوا عَلَيْكُمْ يَرْجُمُوكُمْ أَوْ يُعِيدُوكُمْ فِي مِلَّتِهِمْ وَلَن تُفْلِحُوا إِذًا أَبَدًا ⑳

''وہ لوگ اگر آگاہ ہو گئے تم پر تو وہ تمہیں پتھر مار مار کر ہلاک کر دیں گے یا تمہیں (جبراً) لوٹا دیں گے اپنے (جھوٹے) مذہب میں اور (اگر تم نے ایسا کیا) تو تم کبھی بھی فلاح نہیں پا سکو گے لہ''

لہ یہاں یعیدوا جو عود سے مشتق ہے صیرورۃ کے معنی میں ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ اپنے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَكَذَٰلِكَ أَعْثَرْنَا عَلَيْهِمْ لِيَعْلَمُوا أَنَّ وَعْدَ اللَّهِ حَقٌّ وَأَنَّ السَّاعَةَ لَا رَيْبَ فِيهَا ۚ إِذْ يَتَنَازَعُونَ بَيْنَهُمْ أَمْرَهُمْ ۖ فَقَالُوا ابْنُوا عَلَيْهِم بُنْيَانًا ۖ رَّبُّهُمْ أَعْلَمُ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 167 (التجاریۃ)
2۔ ایضاً

بِهِمْ ۭ قَالَ الَّذِيْنَ غَلَبُوْا عَلٰٓي اَمْرِهِمْ لَنَتَّخِذَنَّ عَلَيْهِمْ مَّسْجِدًا ۝21

''اوراسی طرح بستی والوں کو ہم نے اچانک آگاہ کر دیا ان (اصحاب کہف) پر تا کہ وہ جان لیں بلاشبہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ سچا ہے اور بلاشبہ قیامت کے آنے میں کوئی شبہ نہیں [1] جب وہ بستی والے جھگڑ رہے تھے آپس میں ان کے معاملہ میں تو بعض نے کہا کہ (بطور یادگار) تعمیر کرو ان کے غار پر کوئی عمارت ان کا رب ان کے احوال سے خوب واقف ہے کہنے لگے وہ لوگ جو غالب تھے اپنے کام پر کہ بخدا ہم تو ضرور ان پر ایک مسجد بنائیں گے [2]''

[1] یعنی جس طرح ہم نے ان کو اتنی طویل مدت سلایا بھی اور پھر بیدار کیا تا کہ بصیرت میں اضافہ ہو تو اسی طرح ہم نے لوگوں کو اصحاب کہف پر مطلع کر دیا۔ عثر علی الشیئ کا معنی ہے کسی چیز کو اچانک پالینا۔ اس اطلاع کا مقصود یہ تھا کہ وہ لوگ جو ان کے حالات سے باخبر ہوں انہیں یقین ہو جائے کہ مرنے کے بعد اٹھنے کا وعدہ الٰہی حق ہے کیونکہ سونا اور جاگنا بالکل مرنے اور اٹھنے کی طرح ہے۔ اور وہ قیامت جس کا وعدہ کیا گیا ہے اس کے امکان میں کوئی شک وشبہ نہیں ہے کیونکہ جس نے ان کی روحیں نکالیں اور تین سو سال تک انہیں روکے رکھا اور پھر جسموں کو پھٹنے اور بکھرنے سے محفوظ رکھا پھر تین سو سال بعد ان روحوں کو جسموں میں لوٹا دیا، ایسی ذات یقیناً اس بات پر بھی قادر ہے کہ تمام لوگوں کو مار ڈالے پھر ان کی روحوں کو جس وقت تک چاہے قبضہ میں رکھے اور پھر قیامت کے روز ان روحوں کو جسموں کی طرف لوٹا دے۔

[2] اذ یہ اعثرنا کی ظرف ہے، یعنی جب لوگ جھگڑ رہے تھے تو اس وقت ہم نے مطلع کیا۔ وہ اپنے دین کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔ عکرمہ فرماتے ہیں وہ دوبارہ اٹھنے کے بارے جھگڑ رہے تھے۔ بعض لوگ کہتے تھے کہ اٹھنا صرف روحانی ہوگا، جسمانی نہ ہوگی۔ مسلمان کہتے روح اور بدن دونوں کو اٹھنا ہوگا پس اللہ تعالیٰ نے اصحاب کہف کو بیدار کر کے انہیں دکھا دیا کہ جسم اور روح دونوں کیلئے اٹھنا ہوگا(1)۔ یا وہ نوجوانوں کے متعلق جھگڑ رہے تھے جب اللہ تعالیٰ نے دوبارہ طبعی موت عطا فرمائی تھی۔ بعض نے کہا اب بالکل مر چکے، ہیں بعض نے کہا پہلے کی طرح سوئے ہوئے ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ عمارت بنانے کے متعلق جھگڑ رہے تھے۔ مسلمان کہتے کہ ہم ان کے قریب مسجد بنائیں گے(2) کیونکہ وہ ہمارے دین کے پیروکار تھے اور مسلمان ہو کر فوت ہوئے ہیں۔ مشرکوں نے کہا ہم ان پر ایک عمارت بنائیں گے جس میں لوگ رہیں گے اور اس کو ایک دیہات کی صورت بنالیں گے یا انہوں نے کہا کہ ہم غار کے دروازے پر ایک عمارت بنائیں گے تا کہ لوگ اندر نہ جاسکیں، ان کی مٹی کی حفاظت کا حق ہمیں حاصل ہے کیونکہ وہ ہمارے نسب سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن جن کو دولت وثروت، حکومت وسیاست کی وجہ سے غلبہ تھا یعنی بیدوسیس اور اس کے ساتھیوں نے کہا ہم ان کے قریب مسجد تعمیر کریں گے جس میں مسلمان نماز پڑھیں گے اور ان بزرگوں کی برکت حاصل کریں گے رَبُّهُمْ اَعْلَمُ بِهِمْ اللہ کی طرف سے جملہ معترضہ ہے اور اس معاملہ میں زیادہ غور وخوض کرنے والوں کا رد فرمایا جا رہا ہے کیونکہ دونوں فریق (مشرک اور مسلمان) اصحاب کہف کو اپنی طرف منسوب کرتے تھے۔ حالانکہ وہ کفر اور کفار سے بری تھے اور وہ عام مؤمنین میں سے بھی نہ تھے (بلکہ اولیاء کاملین میں سے تھے) اگرچہ ایمانداروں میں سے تھے کیونکہ صوفی متصل بھی ہوتا ہے اور جدا بھی۔ اس کی مولانا روم نے کتنی عمدہ تصویر کشی کی ہے۔

ہر کسے در ظن خود شد یار من	واز درون من نجست اسرار من

بعض علماء فرماتے ہیں ربھم اعلم بھم جھگڑنے والوں کا کلام ہے گویا انہوں نے ان کے معاملہ کا ذکر کیا، ان کے نسب پر کلام کی، ان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

کے احوال پر بحث کی اوران کے ٹھہرنے کی موت پر گفتگو کی لیکن جب کوئی حقیقی اورحتمی رائے قائم نہ کر سکے تو کہنے لگے **ربهم اعلم بهم**۔ مسئلہ۔ یہ آیت کریمہ اولیاء کرام کے مزارات کے قریب ان سے تبرک حاصل کرنے کیلئے مسجد بنانے کے جواز پر دلیل ہے، جبکہ شیخ استاد محمد فاخر محدث رحمۃ اللہ علیہ مزارات کے قریب مسجد بنانے کو مکروہ جانتے تھے اور کراہیت کی پہلی دلیل امام مسلم کی روایت کو بناتے تھے جو ابی الہیاج الاسدی سے مروی ہے، فرماتے ہیں مجھے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کیا میں تجھے اس کام کیلئے نہ بھیجوں جس کیلئے مجھے رسول ﷺ نے بھیجا تھا کہ جو بھی بت دیکھو اسے مٹا دو اور جو قبر اٹھی ہوئی دیکھو اسے برابر کر دو۔ اسی طرح دوسری دلیل امام مسلم کی ہی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے پکی قبر بنانے اور اس پر عمارت بنانے اور قبر پر بیٹھنے سے منع فرمایا۔ شیخ کی تیسری دلیل شیخین کی روایت ہے جو حضرت عائشہ اور ابن عباس نے روایت کی ہے، فرماتے ہیں جب رسول ﷺ کو شدید مرض لاحق ہوئی تو آپ محمد ﷺ نے اپنے چہرے پر چادر ڈالی اور پھر جب گھٹن محسوس ہوئی تو چادر چہرے سے ہٹادی اور اس حالت میں یہ فرمارہے تھے معاملہ اسی طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہود ونصاریٰ پر لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے انبیاء کرام کی قبروں کو سجدہ گاہیں بنالیا۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں آپ ﷺ نے یہود ونصاریٰ جیسا عمل کرنے سے ڈرایا۔

میں (مفسر) کہتا ہوں یہ احادیث پکی قبر بنانے، قبر پر عمارت بنانے اور اونچی قبریں بنانے کی کراہت پر دلالت کرتی ہیں۔ مزارات کے قریب مسجد بنانے کی کراہیت پر دلالت نہیں کرتی ہیں اور **اتخذ وا قبور انبياء هم مساجد** کا مفہوم یہ ہے کہ وہ قبروں کی طرف سجدے کرتے تھے۔ حضرت ابومرثد الغنوی کی حدیث میں اس مفہوم کی صراحت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نہ قبروں کے اوپر بیٹھو اور نہ ان کی طرف نماز پڑھو۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

سَيَقُوْلُوْنَ ثَلٰثَةٌ رَّابِعُهُمْ كَلْبُهُمْ ۚ وَ يَقُوْلُوْنَ خَمْسَةٌ سَادِسُهُمْ كَلْبُهُمْ رَجْمًۢا بِالْغَيْبِ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ سَبْعَةٌ وَّ ثَامِنُهُمْ كَلْبُهُمْ ؕ قُلْ رَّبِّيْۤ اَعْلَمُ بِعِدَّتِهِمْ مَّا يَعْلَمُهُمْ اِلَّا قَلِيْلٌ ۫ فَلَا تُمَارِ فِيْهِمْ اِلَّا مِرَآءً ظَاهِرًا ۪ وَّ لَا تَسْتَفْتِ فِيْهِمْ مِّنْهُمْ اَحَدًا ﴿۲۲﴾

"کچھ لوگ کہیں گے کہ اصحاب کہف تین تھے چوتھا ان کا کتا تھا کچھ کہیں گے وہ پانچ تھے چھٹا ان کا کتا تھا یہ سب تخمینے ہیں بن دیکھے [1] اور کچھ کہیں گے وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا [2] آپ فرمایئے (اس بحث کو رہنے دو) میرا رب بہتر جانتا ہے ان کی تعداد کو (اور) نہیں جانتے ان (کی صحیح تعداد) کو مگر چند آدمی [3] سو بحث نہ کرو ان کے بارے میں بجز اس کے کہ سرسری سی گفتگو ہو جائے اور نہ دریافت کرو ان کے متعلق (اہل کتاب) میں سے کسی اور سے [4]"

[1] نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں ان اصحاب کہف کے متعلق جھگڑنے والے بعض کہتے کہ وہ تین تھے اور کتا ان کو چار بنانے والا تھا۔ ثلاثة مبتدا محذوف هم کی خبر ہے اور رابعهم کلبهم کا جملہ ثلاثة کی صفت ہے۔ بعد والی تراکیب بھی اسی طرح ہیں۔ یقولون سے پہلے سین ذکر نہیں فرمایا کیونکہ معطوف علیہ پر سین کا ذکر ہو چکا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں نجران کے عیسائیوں میں سے سید اور عاقب اور ان کے ساتھی نبی کریم ﷺ کے پاس بیٹھے تھے کہ اصحاب کہف کا ذکر چل پڑا۔ السید جس کا تعلق یعقوبیہ فرقہ سے تھا اس نے کہا تین تھے اور چوتھا کتا تھا۔ العاقب جس کا تعلق نسطوریہ فرقہ سے تھا اس نے کہا پانچ تھے اور چھٹا ان کا کتا تھا(1)۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریۃ)

گروہوں کا رد کرتے ہوئے فرمایا یہ محض قیاس آرائیاں اور تخمینے ہیں بن دیکھے۔ رجماً پر نصب فعل مقدر کے مصدر کی بناء پر ہے، یعنی یرجمون رجماً یعنی ان کے پاس علمی دلیل نہیں ہے۔ یہ فقط ظن و تخمین سے کام لے رہے ہیں، غیب کی خبر دے رہے ہیں یا رجماً علت کی بناء منصوب ہے اور یقولون کے متعلق ہے اور رجما کا معنی ظنا ہے۔ ظن کی جگہ رجم اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ عرب اکثر ظن کی جگہ رجم استعمال کرتے تھے حتی کہ ان کے نزدیک رجم اور ظن میں کوئی فرق نہیں رہا تھا۔ تفسیر مدارک میں اسی طرح ہے، یعنی دونوں فریقوں کے پاس کوئی مستند علم نہیں ہے جو واقعہ کے مطابق ہو۔

۲۔ اور مسلمان حضور ﷺ کے بتانے سے کہتے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ ثامنھم کا جملہ سبعة کی صفت ہے لیکن درمیان میں واو ذکر کی گئی ہے گویا اسے اس جملہ سے تشبیہ دی گئی ہے جو معرفہ اسم سے حال واقع ہوتا ہے اور اس کی وجہ صفت سے موصوف کے تعلق کی تاکید اور موصوف کے صفت سے متصف ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ آٹھویں چیز سے پہلے ذکر کی جانے والی واؤ ہے مثلاً عرب جب گنتی کرتے ہیں تو واحد اثنان ثلاثة اربعة خمسة ستة سبعه وثمانية کیونکہ ان کے نزدیک آٹھ ایک عقد ہے جس طرح آج کل ہمارے نزدیک (10) ایک عقد ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کے ارشاد میں بھی آٹھویں صفت سے پہلے واؤ ذکر کی گئی ہے اَلتَّآىِٕبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ ...... وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ۔ اسی طرح ازواج مطہرات کے بارے فرمایا طَلَّقَكُنَّ اَنْ یُّبْدِلَهٗۤ اَزْوَاجًا خَیْرًا مِّنْكُنَّ مُسْلِمٰتٍ مُّؤْمِنٰتٍ قٰنِتٰتٍ تٰٓىِٕبٰتٍ عٰبِدٰتٍ سٰٓىِٕحٰتٍ ثَیِّبٰتٍ وَّ اَبْكَارًا (آٹھویں صفت سے پہلے یہاں بھی واؤ ذکر فرمائی ہے)۔

۳۔ قل ربی میں نافع، ابن کثیر اور ابوعمرو نے یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اے محبوب تم کہو کہ میرا رب ان اصحاب کہف کی تعداد کو خوب جانتا ہے، ان کی صحیح تعداد لوگوں میں سے بہت کم جانتے ہیں وہ قلیل یا تو نصاری میں سے تھے یا ان لوگوں میں سے تھے جو وہ مسلمان تھے۔ ابن عباس فرماتے ہیں۔ قلیل لوگوں میں میں بھی شامل ہوں وہ اصحاب کہف سات تھے(1)۔ ابن جریر اور فریابی نے ابن عباس کا یہی قول نقل کیا ہے۔ ابن مسعود کا قول ابن ابی حاتم نے اسی طرح روایت کیا ہے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں ان کا کتا تھا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں مذکورہ تین اقوال کے حصر کے بعد اللہ تعالیٰ نے ایک طائفہ کیلئے علم کو ثابت فرمایا ہے کیونکہ اس مقام پر چوتھے قول کو ذکر نہ کرنا اس کے عدم (نہ ہونے) کی دلیل ہے کیونکہ اصل نفی ہے(2) اور پہلے دو قولوں کو رجما بالغیب فرما کر رد کر دیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حق اور سچ تیسرا قول ہے (کیونکہ اس کے ساتھ رجما بالغیب نہیں فرمایا) امام بغوی نے ابن عباس سے ان کے یہ نام روایت کیے ہیں مکسلمینا، تملیخا، مرطونس، سنونس، ساربنونس، ذونواس۔ کعسططیونس یہ آخری چرواہا تھا(3)۔ یہ نام طبرانی نے المعجم الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ ابن عباس سے روایت کیے ہیں۔ علامہ ابن حجر شرح بخاری میں لکھتے ہیں کہ ان ناموں کے تلفظ میں بہت بڑا اختلاف ہے۔ وثوق اور اعتماد کسی تلفظ پر نہیں ہے۔

۴۔ پیارے حبیب نوجوانوں کی شان اور ان کی تعداد کے متعلق بحث نہ کرو مگر سرسری گفتگو کرو جیسا کہ ہم نے آپ کے سامنے بیان کی ہے۔ ان کے متعلق اتنی گہرائی اور تعمق سے بحث کرنے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اور اہل کتاب سے بھی ان کے متعلق مت پوچھو جتنا ہم نے وحی کیا ہے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ دوسرا یہ کہ ان اہل کتاب کے پاس اصحاب کہف کا علم ہے بھی نہیں۔ اس لیے ایک سوال کرنے والے کی طرح ان سے سوال نہ کرو۔ کیونکہ ان کے احوال کے متعلق علم کی زیادتی کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اور نہ تم ایک ہٹ دھرم کی طرح سوال کرو جس کا ارادہ مسئول عنہ کو رسوا کرنا اور اس کے پاس جو علم ہے اسے حقیر ظاہر کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس نیت سے کسی سے سوال کرنا

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 393 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی، صفحہ 390 (فراس) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 168 (التجاریۃ)

مکارم اخلاق کے منافی ہے۔

وَلَا تَقُوْلَنَّ لِشَایْءٍ اِنِّیْ فَاعِلٌ ذٰلِكَ غَدًا ﴿۲۳﴾ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِیْتَ وَقُلْ عَسٰٓى اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا ﴿۲۴﴾

''ہرگز نہ کہنا کسی چیز کے متعلق کہ میں اسے کرنیوالا ہوں کل مگر (یہ کہ ساتھ یہ بھی کہو) اگر چاہا اللہ تعالیٰ نے ۱ اور یاد کرا اپنے رب کو جب تو بھول جائے ۲ (یہ بھی) کہو کہ مجھے امید ہے کہ دکھادے گا مجھے میرا رب اس سے بھی قریب تر ہدایت کی راہ ۳ ''

۱ ابن مردویہ نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے کسی کام کے کرنے کی قسم اٹھائی لیکن چالیس دن گزر گئے (اور کام نہ کر سکے) تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے اس (کہف:23-24) کا ارشاد نازل فرمایا(1)۔ ابن المنذر نے مجاہد سے روایت کیا ہے کہ یہود نے قریش سے کہا کہ محمد ﷺ سے روح۔ اصحاب کہف اور ذی القرنین کے متعلق پوچھو انہوں نے پوچھا تو آپ ﷺ نے فرمایا میں کل تمہیں بتاؤں گا لیکن آپ نے ان شاء اللہ ساتھ نہ کہا، وحی کا سلسلہ پندرہ دن تک منقطع ہو گیا۔ حتی کہ آپ پر یہ کیفیت بہت تکلیف دہ تھی۔ قریش کو بھی جھٹلانے کا موقع مل گیا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت کریمہ نازل فرمائی، ابن جریر کے حوالہ سے سورت کے آغاز میں ایسی ہی روایت نقل ہو چکی ہے اسی طرح ہم نے سورۂ بنی اسرائیل میں یسئلونک عن الروح کی تفسیر کے تحت بھی ذکر کیا ہے۔ یہ استثناء نہی سے استثناء ہے، یعنی کسی حال میں بھی مشیت الٰہی سے کام کو معلق کیے بغیر کسی کام کا پختہ عزم نہ کرو یا کسی وقت میں کسی کام کے کرنے کے متعلق کچھ نہ کہو مگر ساتھ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کا اذن ہوا تو ایسا کروں گا۔

استثناء کا تعلق فاعل سے نہیں ہے کیونکہ اس کے متعلق ہو تو معنی یہ ہوگا کہ میں ایسا کرنے والا ہوں مگر مشیت الٰہی میرے کام میں آڑ ہے۔ اس معنی کی نہی کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے اس آیت کریمہ میں اللہ نے اپنے محبوب نبی ﷺ کو یہ ادب سکھایا ہے (کہ جب تک کام اللہ تعالیٰ کی مشیت سے متعلق نہ کرلیں اس کام پر پختہ عزم نہ کریں)۔

۲ تسبیح اور استغفار کے ساتھ اپنے پروردگار کو یاد کر جب تو بھول جائے۔ اس جملہ میں ہر عزم میں ان شاء اللہ کہنے کے اہتمام پر تاکید اور برانگیختہ کرنا ہے یا یہ معنی کہ جب تجھ سے کوئی امر الٰہی رہ جائے تو اپنے رب کریم اور اس کے عقاب وعتاب کو یاد کرتا کہ تدارک پر یہ یاد تیری معاون ثابت ہو یا یہ معنی کہ جب تجھے کوئی چیز بھول جائے تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر، وہ تجھے بھولی ہوئی چیز یاد دلا دے گا۔ عکرمہ فرماتے ہیں آیت کا معنی یہ ہے کہ جب تو غصہ میں ہو تو اللہ تعالیٰ کو یاد کر۔ وہب فرماتے ہیں انجیل میں ہے کہ اے ابن آدم غصہ کے وقت تو مجھے یاد کیا کر۔ میں جب غصہ میں ہوں گا تو تجھے یاد کروں گا۔ الضحاک اور سدی فرماتے ہیں ہر نماز کے متعلق ہے، یعنی نماز قضاء ہو جائے تو اسے ادا کرو(2) حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جسے نماز بھول جائے تو جب اسے یاد آئے، ادا کرے(3)۔ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے۔ صحیحین، مسند امام احمد، ترمذی اور نسائی میں اس طرح ہے کہ جو نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سویا رہے تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جب اسے نماز یاد آئے تو فوراً ادا کرے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو وتر نماز سے سو جائے یا بھول جائے تو جب اسے یاد آئے تو ادا کرے۔ اس حدیث کو احمد، حاکم نے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 394 (العلمیہ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 69-168 (التجاریہ)
3۔ جامع ترمذی، جلد 1، صفحہ 25 (وزارت تعلیم)

روایت کیا اور حاکم نے اسے صحیح بھی کہا ہے۔ابن عباس، مجاہد اور الحسن فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تم ان شاءاللہ کہنا بھول جاؤ تو جب یاد آئے کہہ دیا کرو ان شاءاللہ۔اسی قول کی بناء پر بعض علماء استثناء کی تاخیر کے جواز کے قائل ہیں اگرچہ سال بعد بھی ہو بشرطیکہ وہ قسم سے حانث نہ ہوا ہو (یعنی قسم توڑی نہ ہو) اس تاخیر کے جواز کے قول کو سعید بن منصور، ابن جریر، طبرانی اور حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس قول کی تائید ابن مردویہ کی روایت سے ہوئی ہے کہ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو آپ ﷺ نے فرمایا ان شاءاللہ لیکن عام فقہاء ایسی تاخیر کے قائل نہیں ہیں کیونکہ کلام غیر مستقل جب دوسری کلام کے معنی کو تبدیل کرنے والی ہو تو وہ شرط، استثناء غایت اور بدل بعض کی طرح ہوتی ہے، اس لئے اس کا متصل ہونا ضروری ہے۔اگر استثناء منفصل بھی جائز ہو تو اقرار، طلاق، اعتاق کا ثبوت کبھی بھی نہ ہو اور نہ صدق و کذب معلوم ہو۔

حکایت۔خلیفہ منصور کو یہ خبر پہنچی کہ امام ابو حنیفہ حضرت ابن عباس کی استثناء منفصل میں مخالفت کرتے ہیں۔خلیفہ نے امام صاحب کو بلایا تا کہ ڈانٹ ڈپٹ کرے۔امام ابو حنیفہ نے فرمایا یہ چیز تیرے خلاف جاتی ہے۔کیا تو یہ پسند کرتا ہے کہ تو لوگوں سے طاعت کی بیعت لے پھر جب وہ باہر نکلیں تو ان شاءاللہ کہہ دیں اور وہ تیری اطاعت سے نکل جائیں۔اس نے امام صاحب کی کلام کو داد تحسین دی اور جس نے امام صاحب پر طعن کیا تھا، اسے محفل سے نکال دیا۔اور جو یہ روایت کیا گیا ہے کہ آپ ﷺ نے آیت کے نزول کے وقت ان شاءاللہ کہا تھا، یہ استثناء اس پہلی کلام سے متعلق ہے جس میں آپ نے کہا تھا کہ کل آنا، میں تمہیں ان سوالوں کے جواب دوں گا بلکہ یہ استثناء مقدر کلام کے متعلق ہے جس کی تقدیر اس طرح ہے کہ آئندہ کبھی میں ان شاءاللہ کو ترک نہیں کروں گا جب بھی کبھی کسی فعل کے کرنے کے متعلق ارادہ کروں گا۔

صوفیاء کرام فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ جب تو سب کچھ بھول جائے تو اس وقت اپنے پروردگار کو یاد کر۔صوفیاء فرماتے ہیں دائمی ذکر اس وقت تک متصور ہی نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز کو بھول نہ جائے کیونکہ انسان کے دل کو ہر کام دوسرے کام سے غافل کر دیتا ہے اور اللہ تعالیٰ نے ایک سینہ میں دو دل بنائے نہیں ہیں (کہ ایک اللہ کا ذکر کرے اور دوسرا دنیوی معاملات میں الجھا رہے) پس دائمی ذکر جس میں کبھی سستی اور کمزوری نہیں آتی وہ اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتا جب تک کہ دل ہمیشہ ہمیشہ کیلئے دوسری چیزوں سے مستغنی نہ ہو جائے اور ان کا خیال دل سے بالکل مٹ نہ جائے۔اسی کیفیت کو فناء القلب سے تعبیر کیا جاتا ہے۔وہ ذکر جس کے پیچھے غفلت ہو اس کو صوفیاء شمار ہی نہیں کرتے جو دل کبھی اللہ تعالیٰ کو یاد کرے اور کبھی غیر کا تصور کرے اسے صوفیاء موحد نہیں کہتے۔صوفیاء کی یہ تاویل کتاب کے الفاظ کے زیادہ مناسب ہے، قواعد عربیہ کے بھی موافق ہے اور مجاز سے بھی بہت دور ہے کیونکہ اذا نسیت اذکر کی ظرف ہے اور ظرفیت حقیقیہ تب ہو سکتی ہے جب نسیان کے وقت ذکر کیا جائے اور اس میں کوئی شک نہیں کہ ذکر کا وقت سابقہ تمام تاویلات کے مطابق نسیان کے وقت کے مغائر ہے، یعنی وہ علیحدہ وقت ہیں پس سابقہ تاویلات کی صورت میں ظرفیت حقیقیہ نہ ہوگی بلکہ مجازی ہوگی اور حقیقت پر محمول کرنا اولیٰ ہوتا ہے۔

سے نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یھدین کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے اور ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقف اور وصل) میں یاء کے حذف کے ساتھ پڑھا ہے ھذا کا مشار الیہ بھولا ہوا اذکر یا حکم ہے، اس کا عطف اذکر پر ہے۔مطلب یہ ہوگا کہ جب تم استثناء (ان شاءاللہ) بھول جاؤ یا اس کام کا کرنا بھول جاؤ جس کا اللہ نے حکم دیا

ہے تو اللہ تعالیٰ کا تسبیح۔ استغفار کے ساتھ ذکر کرو اور اس سے مدد طلب کرو اور یہ کہو کہ مجھے امید ہے کہ میرا رب مجھے اس بھولی ہوئی چیز سے قریب تر ہدایت کی راہ دکھائے گا۔ یا اس طرح ذکر کرے کہ انسان کو احساس ندامت ہو۔ توبہ و استغفار کرے اور فوت شدہ امر کی قضا بھی کرے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ قریش نے جب عناد کی بناء پر اصحاب کہف کے متعلق سوال کیا تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ آپ انہیں فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی حجتیں اور دلائل عطا فرمائے گا جو اصحاب کہف کے واقعہ کی نسبت میری نبوت پر زیادہ دلالت کرنے والے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے واقعی آپ کی نبوت پر بڑی دلیل پیش فرمائی کہ آپ ﷺ کو رسولوں کا علم غیب اور ما کان وما یکون (ماضی اور مستقبل) کا علم عطا فرما دیا۔ یہ علم غیب کا ملنا اصحاب کہف کی خبر سے کہیں زیادہ نبوت کی صداقت کی واضح دلیل ہے اور ہدایت کے زیادہ قریب ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ایک حکم ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو دیا کہ ان شاء اللہ کے قول کے ساتھ وقل عسی ان یھدین الآیۃ کہا کریں۔ میں انشاء اللہ کو کبھی ترک نہیں کروں گا جب بھولنے کے بعد مجھے یاد آئے گا۔ یعنی جب کوئی انسان انشاء اللہ بھول کر چھوڑ دے اور پھر اسے یاد آئے تو اس کی توبہ یہ ہے کہ وہ کہے عَسٰٓی اَنْ یَّهْدِیَنِ رَبِّیْ لِاَقْرَبَ مِنْ هٰذَا رَشَدًا۔ صوفیاء کی تاویل پر آیت کا معنی یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ مجھے ایسی چیز سے ملائے گا جو اس ذکر سے بھی زیادہ باعث ہدایت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔

وَلَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ ثَلٰثَ مِائَةٍ سِنِیْنَ وَازْدَادُوْا تِسْعًا ﴿۲۵﴾

"اور (اہل کتاب کہتے ہیں کہ) وہ ٹھہرے رہے اپنے غار میں ۱ تین سو سال اور زیادہ کیے انہوں نے (اس پر) نو (9) سال ۲"

۱ یعنی اصحاب کہف غار میں زندہ ٹھہرے رہے اور سوئے رہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے پہلے مجمل کلام کا بیان ہے جس میں فرمایا فَضَرَبْنَا عَلٰٓی اٰذَانِهِمْ فِی الْكَهْفِ سِنِیْنَ عَدَدًا بعض علماء فرماتے ہیں یہ اہل کتاب کا قول ہے، وہ کہتے تھے کہ اصحاب کہف تین سو نو سال غار میں ٹھہرے رہے۔ اگر یہ مدت اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی تو قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ذکر کرنے کی کوئی وجہ نہ تھی۔ یہ حضرت قتادہ کا قول ہے اور حضرت قتادہ کے اس قول کی تائید حضرت ابن مسعود کی قرأت سے بھی ہوتی ہے، وَقَالُوْا لَبِثُوْا فِیْ كَهْفِهِمْ (اس میں صراحت ہے کہ یہ مدت اہل کتاب کی بیان کردہ ہے قرآن کی نہیں) پھر اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کا رد فرماتے ہوئے فرمایا قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا کا مطلب یہ ہے کہ ان کے غار میں ٹھہرنے کی مدت وہی ہے جو ہم نے بیان کی ہے۔ پس اب اگر یہ آپ میں اس کے متعلق جھگڑیں تو آپ فرمائیں تم سے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ وہ کتنی مدت ٹھہرے اور اس نے تو تین سو نو سال مدت بیان نہیں فرمائی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل کتاب نے کہا کہ ان کے غار میں داخل ہونے کے وقت سے نبی کریم ﷺ کے زمانہ تک یہی مدت بنتی ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کا رد فرمایا۔ قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا یعنی ان کی روحوں کے قبض ہونے کے بعد آج تک ایک زمانہ گزر چکا ہے جسے اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔

۲ حمزہ اور کسائی نے مائۃ کو سنین کی طرف مضاف کر کے بغیر تنوین کے پڑھا ہے کیونکہ یہاں تمیز مفرد کی جگہ جمع ذکر کی گئی ہے جیسا کہ بِالْاَخْسَرِیْنَ اَعْمَالًا میں ہے۔ فراء کہتے ہیں بعض عرب سنۃ کی جگہ سنین استعمال کرتے ہیں۔ باقی قراء کے نزدیک بدل یا عطف بیان ہوگا۔ ابن مردویہ نے ابن عباس سے اور ابن جریر نے ضحاک سے روایت کیا ہے کہ جب ولبثوا فی کھفھم ثلث

مائة نازل ہوا تو عرض کی گئی یا رسول اللہ یہ تین سو سال ہیں یا مہینے تو اس وقت اللہ تعالیٰ نے سنین نازل فرمایا(1)۔ کلبی لکھتے ہیں نجراں کے نصاریٰ نے کہا تین سو تو ہم جانتے ہیں لیکن نو کا ہمیں علم نہیں ہے تو اسی وقت قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا نازل ہوا۔

قُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا لَبِثُوْا ۚ لَهٗ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ اَبْصِرْ بِهٖ وَاَسْمِعْ ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ مِنْ وَّلِيٍّ ۡ وَّلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ۝

''آپ فرمائیے اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے جتنی مدت وہ ٹھہرے ۱؎ اسی کیلئے (علم) غیب ہے آسمانوں اور زمین کا وہ بڑا دیکھنے والا ہے اور سب باتیں سننے والا ہے نہیں ان کا اس کے سوا کوئی دوست ۲؎ اور وہ نہیں شریک کرتا اپنے حکم میں کسی کو ۳؎ ''

۱؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے اہل کتاب کی مجلس میں فرمایا کہ اصحاب کہف تین سو شمسی سال غار میں رہے اور اللہ تعالیٰ نے تین سو سال قمری کا ذکر فرمایا ہے اور شمسی اور قمری سالوں کے درمیان فرق ہر سو سال میں تین سال کا ہوتا ہے۔ پس قمری سال تین سو نو ہونگے اس لئے فرمایا وازدادو تسعاً(2)۔

۲؎ زمین و آسمان کا غائب اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے پھر کمال بصارت اور کمال سماعت پر دلالت کرنے کیلئے فعل تعجب کے صیغے ذکر فرمائے تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سننے اور دیکھنے کی کیفیت دوسرے سننے اور دیکھنے والوں کی کیفیت سے وراء ہے کیونکہ اس ذات ہمہ بیں اور ہمہ داں سے کوئی چیز مخفی نہیں ہے لطیف و کثیف کا اس کے سامنے کوئی فرق نہیں ہے، چھوٹی بڑی، خفی اور جلی سب چیزیں اس کے ادراک کیلئے برابر ہیں۔

۳؎ علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ ابن التیسیر میں ابن عامر کا خلاف ذکر نہیں کیا۔ اور جمہور علماء نے لا یشرک یعنی یاء کیساتھ پڑھا ہے(3) یعنی اللہ تعالیٰ اپنے فیصلہ یا اپنے امر و نہی میں کسی کو شریک نہیں کرتا، کسی کو اپنے فیصلہ میں دخل اندازی کا حق نہیں دیتا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں حکم بمعنی علم غیب ہے یعنی اپنے علم غیب میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔

قرآن چونکہ اصحاب کہف کے واقعہ پر مشتمل ہے اور یہ نبی کریم ﷺ کیلئے ایک غیب کی خبر ہے تو یہ اللہ کی طرف سے اپنے نبی کریم ﷺ کی جانب وحی ہے اور بطور معجزہ عطا کیا گیا۔ اور پھر حکم دیا کہ ہمیشہ اس قرآن معجز کی تلاوت کرتے رہو اور قرآن پڑھنے والوں کی سنگت میں رہو۔ فرمایا

وَاتْلُ مَآ اُوْحِيَ اِلَيْكَ مِنْ كِتَابِ رَبِّكَ ړ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ڟ وَلَنْ تَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝

''اور پڑھ سنائیے (انہیں) جو وحی کیا جاتا ہے آپ کی طرف آپ کے رب کی کتاب سے۔ کوئی بدلنے والا نہیں اس کے ارشادات کا ۱؎ اور نہیں پائیں گے آپ اس کے سوا کوئی پناہ گاہ ۲؎ ''

۱؎ کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے، یعنی قرآن کی تلاوت کرو اور اس کے احکام کی اتباع کرو اور ان کے لایعنی سوالوں ''اس قرآن کے علاوہ قرآن لاؤ یا اس کو بدل دو'' کی طرف کبھی توجہ نہ کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی اس میں تغیر و تبدل کرنے پر قادر نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل معصیت کو جن کلمات کے ساتھ اس نے وعید سنائی ہے انہیں کوئی بدلنے والا نہیں ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 396 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 169 (التجاریہ) 3۔ ایضاً، صفحہ 170

۲؎ اے پیارے محمد ﷺ اگر آپ قرآن کی اتباع نہ کریں گے تو آپ اس کے سوا کوئی قرار گاہ نہیں پائیں گے۔ ابن عباس نے ملتحدا کا معنی حرزاً (حفاظت گاہ) کیا ہے۔ حسن نے مدخلاً (داخل ہونے کی جگہ) کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں بھاگنے کی جگہ۔ التحد کا اصل معنی میلان ہے۔

وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ وَلَا تَعْدُ عَيْنٰكَ عَنْهُمْ ۚ تُرِيْدُ زِيْنَةَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَا تُطِعْ مَنْ اَغْفَلْنَا قَلْبَهٗ عَنْ ذِكْرِنَا وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ وَكَانَ اَمْرُهٗ فُرُطًا ﴿۲۸﴾

''اور روکے رکھئے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ ۱؎ جو پکارتے ہیں اپنے رب کو صبح وشام طلب گار ہیں اس کی رضا کے ۲؎ اور نہ ہٹیں آپ کی نگاہیں ان سے ۳؎ کیا آپ چاہتے ہیں دنیوی زندگی کی زینت اور نہ پیروی کیجئے اس (بد نصیب) کی غافل کر دیا ہے ہم نے جس کے دل کو اپنی یاد سے ۴؎ اور وہ اتباع کرتا ہے اپنی خواہش کا ۵؎ اور اس کا معاملہ حد سے گزر گیا ہے ۶؎''

۱؎ اے پیارے محمد آپ اپنے نفس کو ان اپنے عاشقان دلفگار کے ساتھ روکے رکھئے جو صبح وشام اپنے پروردگار کی تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے ہیں، جن کی ساری ریاضتوں، سجدہ ریزیوں اور شب خیزیوں کا مقصود صرف اور صرف رضاء الٰہی ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ عیینہ بن حصین الفزاری کے متعلق نازل ہوئی جو اسلام لانے سے پہلے نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا تھا۔ اس وقت آپ ﷺ کی مجلس میں فقراء صحابہ کی جماعت بیٹھی تھی جن میں سلمان فارسی بھی تھے۔ حضرت سلیمان فارسی نے ایک چادر اوڑھی ہوئی تھی، جس میں آپ کو پسینہ آ رہا تھا اور ان کے ہاتھ میں کھجور کے پتے تھے جن کو چیر کر آپ کچھ بُن رہے تھے۔ عیینہ کہنے لگا اے محمد ﷺ ان لوگوں کی بدبو آپ کو تکلیف نہیں دیتی، ہم مضر قبیلہ کے سردار ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ اسلام قبول کر لیں گے۔ ہم ان بدبودار اور فقراء لوگوں کی وجہ سے آپ کی اتباع نہیں کرتے۔ آپ ان کو مجلس سے اٹھا دیں تو ہم آپ کی اتباع کریں گے یا آپ اس طرح کریں کہ ان کیلئے ایک الگ مجلس کا اہتمام کریں اور ہمارے لیے علیحدہ محفل کا انتظام کیا کریں۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی واصبر نفسک الایۃ۔

۲؎ ابن عاصم نے بالغداۃ کو غین کے ضمہ دال، کے سکون اور واو کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء غین اور دال کے فتحہ اور اس کے بعد الف پڑھا ہے۔ غدوۃ اور عشی سے مراد یا تو تمام اوقات ہیں یا دن کی دو اطراف ہیں۔ وجھہ میں وجہ کا لفظ زائد ہے جیسا کہ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ میں وجہ مقحم ہے۔ مطلب یہ کہ یہ درویش صفت لوگ صرف اور صرف اللہ کیلئے عبادت کرتے ہیں، دنیا و آخرت کی کوئی چیز ان کے پیش نظر نہیں ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ اصحاب صفہ کے بارے نازل ہوئی، ان کی تعداد سات سو تھی جو نبی کریم ﷺ کی مسجد میں رہتے تھے کھیتی، مال مویشی، تجارت وغیرہ سے بالکل مستغنی تھے۔ فقط یہی کام تھا کہ ایک نماز محبوب کریم ﷺ کی معیت میں ادا کر لیتے تو دوسری نماز کے انتظار میں ہو جاتے۔ جب یہ آیت کریمہ نازل ہوئی تو نبی کریم ﷺ نے فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِیْ مَنْ اَمَرَنِیْ رَبِّیْ اَنْ اَصْبِرَ مَعَهُمْ. سب تعریف اس ذات کیلئے جس نے میری امت میں ایسے پاکباز اور حسین سیرت لوگ پیدا فرمائے جن کی ہم نشینی کا میرے رب نے مجھے حکم فرمایا ہے۔ ہم نے سورۂ انعام میں وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ

یدعون ربھم کی تفسیر کے تحت اس آیت کے سبب نزول کے متعلق بعض روایات نقل کی ہیں (وہاں سے ملاحظہ فرمائیں)

۳ے آپ کی آنکھیں انہیں چھوڑ کر اغنیاء و مالداروں کی مجلس کی طلبگار نہ ہوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ والوں کی مصاحبت و محفل کی متلاشی نہ ہوں۔ترید زینة الدنیا الحیاة الدنیا ک ضمیر سے حال ہے۔

۴ے آپ ان کی پیروی نہ کریں جن کے دل کو ہم نے اپنی یاد سے غافل کر دیا۔امام بغوی فرماتے ہیں جن کی اتباع سے روکا گیا ہے عیینہ بن حصین ہے۔بعض فرماتے ہیں امیہ بن خلف مراد ہے۔ابن مردویہ نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ یہ امیہ بن خلف الجمحی کے حق میں نازل ہوئی ہے۔کیونکہ اس نے نبی کریم ﷺ سے ایک ایسا مطالبہ کیا تھا جو اللہ تعالیٰ کو ناپسند تھا۔اس نے کہا تھا کہ آپ ان درویشوں کو اپنی مجلس سے اٹھا دیں اور اہل مکہ کے سرداروں کو اپنا ہم نشین بنائیں۔ابن ابی حاتم نے ربیع سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کو امیہ بن خلف کی پیروی سے روکا گیا ہے کیونکہ امیہ ہی ہر اس بات سے غافل اور بھولنے والا تھا جو اسے کہی جاتی تھی۔ابن بریدہ نے ذکر کیا ہے کہ عیینہ بن حصین نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں آیا اور وہاں سلمان فارسی بھی تشریف فرما تھے،عیینہ نے کہا جب ہم تیرے پاس آئیں تو ان کو نکال دیا کرو تو اس وقت یہ آیت نازل ہوئی و لا تطع من اغفلنا قلبه۔

۵ے اس نے فقراء کو مجلس سے نکالنے اور قریش کے سردار کو قریب بٹھانے کی استدعا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں کی تھی۔اس جملہ میں اس بات پر تنبیہ کی گئی ہے کہ ایسی غیر اخلاقی بات کرنے پر برانگیختہ کرنے والی چیز ذکر الٰہی سے محرومی ہے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک ہونا ہے حتیٰ کہ دنیا کا غبار اس کے دل پر اس طرح چھا گیا ہے کہ نفس کی پاکیزگی،دل کی صفائی اور نور معرفت سے منور ہونے کا شرف اس کی مادیت آلود نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ہے۔پس جو ایسے شخص کی پیروی کرے گا وہ غفلت اور غباوت میں اس جیسا ہو گا۔معتزلہ چونکہ غافل کرنے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کرنے کو جائز قرار نہیں دیتے،اس لئے وہ اس کا یہ معنی کرتے ہیں کہ ہم نے اسے غافل پایا یا ہم نے اس کو غفلت کی طرف منسوب کیا یا یہ اغفل ابله کے قبیل سے ہے،یعنی اس نے اس کو بغیر نشانی کے چھوڑ دیا اہل سنت و جماعت ان دونوں نسبتوں اغفلنا اور واتبع هواه کو دو امروں کی دلیل بناتے ہیں (1) انسان پر جبر نہیں ہے (2) اور انسان کلی طور پر مختار نہیں ہے۔

۶ے امام بغوی لکھتے ہیں حضرت قتادہ اور مجاہد نے فرطا کا معنی ضیاعا کہا ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے اپنے معاملہ کو ضائع کر دیا اور کام کے دنوں کو معطل کر دیا۔بعض نے اس کا معنی شرمندگی کیا ہے۔مقاتل بن حبان نے سرفا (حد سے تجاوز) کیا ہے۔فراء نے متروکا چھوڑا ہوا (حد سے تجاوز کرنے والا) معنی بیان کیا ہے(1)،امام بیضاوی لکھتے ہیں جو حق کو پیٹھ کے پیچھے چھوڑ کر آگے نکل گیا ہو۔عرب کہتے ہیں فرط فرس وہ گھوڑا جو بقیہ گھوڑوں سے آگے نکل جائے،اسی سے الفرط ہے جس کا معنی پیش رو ہے(2)۔

وَ قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۫ فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّ مَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۙ اِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلظّٰلِمِيْنَ نَارًا ۙ اَحَاطَ بِهِمْ سُرَادِقُهَا ؕ وَ اِنْ يَّسْتَغِيْثُوْا يُغَاثُوْا بِمَآءٍ كَالْمُهْلِ يَشْوِي الْوُجُوْهَ ؕ بِئْسَ الشَّرَابُ ؕ وَ سَآءَتْ مُرْتَفَقًا ۝۲۹

''اور فرمائیے حق تمہارے رب کی طرف سے ہے ۱ے پس جس کا جی چاہے وہ ایمان لے آئے اور جس کا جی چاہے کفر کرتا رہے ۲ے بیشک ہم نے تیار کر رکھی ہے ظالموں کے لیے آگ گھیر لیا ہے انہیں اس آگ کی دیوارنے ۳ے اور اگر فریاد کریں

1۔تفسیر بغوی،جلد 3،صفحہ 563 (الفکر)
2۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب،جلد 6،صفحہ 168 (العلمیہ)

گے تو ان کی فریاد رسی کی جائے گی ایسے پانی کے ساتھ جو پیپ کی طرح (غلیظ) ہے (اور اتنا گرم کہ) بھون ڈالتا ہے
چہروں کو ۔ یہ مشروب بڑا ناگوار ہے اور یہ قرار گاہ بڑی تکلیف دہ ہے ۞ ''

۱ الحق مبتدا اور من ربکم خبر ہے یعنی حق وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ حق فرمائے، وہ حق نہیں جسے نفس کی خواہش اچھا کہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ الحق مبتدا محذوف کی خبر ہو اور من ربکم حال ہو یعنی اسلام یا قرآن حق ہے جو تمہارے رب کی طرف سے ہے۔

۲ یہ تخییر کا صیغہ تہدید اور وعید کیلئے استعمال کیا گیا ہے۔ گویا یہ جواب ہے جب عیینہ نے نبی کریم ﷺ کو کہا تھا کہ تمہیں ان کی بدبو تنگ نہیں کرتی ہم تو قبیلہ مضر کے سردار اور معزز لوگ ہیں اگر ہم اسلام قبول کریں گے تو سب لوگ بھی اسلام قبول کرلیں گے اور ہمیں آپ کی اتباع اور پیروی سے صرف یہی لوگ مانع ہیں۔ ان کو مجلس سے اٹھا دو تو ہم آپ کی اتباع کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ حق تمہارے رب کی طرف سے ہے اور اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ ان مسکینوں و فقیروں کی مجلس و سنگت پر اپنے آپ کو روکے رکھو اور وہ تمہیں منع کرتا ہے کہ کبھی ان پاکیزہ نفوس کو اپنی مجلس سے اٹھا دو چاہیں تو یہ کافر ایمان کی روشنی قبول کرلیں اگر چاہیں تو کفر کے اندھیرے میں بھٹکتے رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں مجھے ایمان لانے والے کے ایمان کی اور کفر کرنے والے کے کفر کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کیونکہ اگر ایمان قبول کرو گے تو اس کا نفع تمہاری طرف لوٹے گا اور اگر کفر کرو گے تو کفر کا وبال بھی تم پر ہی پڑے گا۔

۳ سرادق وہ حجرہ جس کو قناتوں کے ساتھ گھیرا گیا ہو۔ نہایہ میں ہے ہر وہ چیز جو کسی دوسری چیز کو اپنے گھیرے میں لے لے خواہ وہ دیوار ہو یا خیمہ۔ علماء فرماتے ہیں یہ لفظ مفرد ہے اور عربی نہیں، عربی میں داخل کیا گیا ہے کیونکہ عرب کلام میں کوئی مفرد لفظ ایسا نہیں جس کا تیسرا لفظ الف ہو اور الف کے بعد دو حرف ہوں۔ ہو سکتا ہے یہ سر دق کی جمع ہو۔ امام احمد ترمذی اور حاکم نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا آگ کے سرادق چار ہیں۔ یعنی دوزخ کی چار دیواریں ہیں۔ ہر دیوار کی موٹائی اتنی ہے کہ اسے طے کرنے کے لیے چالیس سال درکار ہوں گے (1)۔ حاکم نے اس حدیث کو صحیح کہا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا سرادق سے مراد آگ کی دیواریں ہیں۔ کلبی کہتے ہیں یہ آگ کی لپیٹ ہے جو کفار کو باڑا کی طرح گھیر لے گی۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد دھواں ہے جو کفار کو گھیر لے گا۔ اس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ایک اور جگہ اس طرح فرمایا اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِیْ ثَلٰثِ شُعَبٍ۔ چلو اس سایہ کیطرف جو تین شاخوں والا ہے (2)۔

۴ امام احمد ترمذی، ابن ابی حاتم، ابن حبان، الحاکم اور بیہقی نے حضرت ابوسعید الخدری سے نقل کیا ہے کہ مھل سے مراد وہ تلچھٹ ہے جب وہ انسان کے قریب کیا جائے گا تو اس کے چہرے کی کھال (گل کر) اس میں گر جائے گی (3)۔ امام احمد، نسائی، حاکم۔ ابن جریر، ابن ابی حاتم، ابن المنذر، ابن ابی الدنیا اور بیہقی نے ابی امام سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے یسقی من ماء صدید یتجرعه کے متعلق فرمایا جب وہ پیپ والا پانی اس کو قریب کیا جائے گا تو وہ (کافر) اسے ناپسند کرے گا اور جب زیادہ قریب کیا جائے گا تو اس کا چہرہ جلا دے گا اور اس کے سر کی کھال اس میں (سڑ کر) گر جائے گی اور جب وہ اس کو پیئے گا تو وہ اس کی انتڑیوں کو کاٹ دے گا حتی کہ وہ اس کی دبر سے نیچے بہہ جائے گا۔ ابن ابی حاتم نے ابی طلحہ کے واسطہ سے ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ المھل سے مراد سیاہ تلچھٹ ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں ابن عباس نے فرمایا مہل سے مراد وہ غلیظ پانی ہے جو تیل کے تلچھٹ کی مانند ہوگا۔ مجاہد فرماتے ہیں

1۔ مصابیح السنۃ، جلد 2، صفحہ 379 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 65-564 (الفکر)
3۔ کنز العمال، حدیث: 39500 (التراث الاسلامی)

پیپ اور خون مراد ہے۔ ابن مسعود سے المھل کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے سونا اور چاندی منگوائے پھر ان کو آگ پر گرم کیا جب وہ پگھل گئے تو فرمایا مھل اس کے مشابہ چیز ہے۔ وہ پانی جو پیپ جیسا غلیظ ہوگا جونہی چہروں کے قریب ہوگا تو اس کی تپش سے چہرے جل جائیں گے۔ یہ جملہ ماء کی صفت ثانیہ ہے یا المھل سے حال ہے یا کاف تشبیہ جو ضمیر ہے اس سے حال ہے(1)۔

۵ بئس کا مخصوص بالذم المھل ہے اور ساء ت کا مخصوص بالذم النار ہے۔ ابن عباس سے مرتفقا کا معنی منزل، مجاہد نے مجمع، عطاء نے قرار گاہ اور قتیبی نے مجلس کیا ہے(2) ارتفاق کا اصل معنی رخسار کے نیچے اپنی کہنی رکھنا ہے، معنی آرام کرنا اور سہارا لینا ہے یہ حسنت مرتفقاً کے مقابلہ میں استعمال کیا گیا ہے ورنہ دوزخیوں کیلئے کب کوئی آرام اور سکون ہوگا۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ مَنْ اَحْسَنَ عَمَلًا ۝۳۰

”بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے (تو ہمارا یہ دستور ہے کہ) ہم ضائع نہیں کرتے کسی کا اجر جو عمدہ اور (مفید) کام کرتا ہے ۱۔“

۱۔ پہلے انّ کی خبر دوسرا انّ اور اس کے اسم خبر ہیں اور خبر میں ضمیر راجع محذوف ہے، تقدیر کلام اس طرح ہے مَنْ اَحْسَنَ عَمَلاً مِنْهُمْ یا مَنْ اَحْسَنَ عَمَلاً کے عموم کی وجہ سے راجع ضمیر کی ضرورت ہی نہیں ہے جیسا کہ نعم الرجل زید میں ضمیر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی یا ضمیر کی جگہ یہ اسم ظاہر ہے کیونکہ من احسن عملاً کا اطلاق ہوتا ہی الذین امنوا و عملوا الصالحت پر ہے۔

اُولٰٓئِكَ لَهُمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّ يَلْبَسُوْنَ ثِيَابًا خُضْرًا مِّنْ سُنْدُسٍ وَّ اِسْتَبْرَقٍ مُّتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا عَلَى الْاَرَآئِكِ ؕ نِعْمَ الثَّوَابُ ؕ وَحَسُنَتْ مُرْتَفَقًا ۝۳۱

”یہی وہ (خوش نصیب) ہیں جن کے لیے ہمیشگی کے جنت ہیں رواں ہیں جن کے نیچے ندیاں ۱۔ انہیں پہنائے جائیں گے ان جنتوں میں کنگن سونے کے ۲۔ اور پہنیں گے سبز رنگ کا لباس جو باریک ریشمی کپڑے اور موٹے ریشمی کپڑے کا بنا ہوا ہوگا ۳۔ تکیہ لگائے بیٹھے ہونگے وہاں مرصع پلنگوں پر ۴۔ کتنا اچھا ہے یہ اجر اور کتنی عمدہ ہے یہ آرام گاہ ۵۔“

۱۔ عدن کا معنی ٹھہرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں عَدَنَ الْمَاءُ بِالْمَكَان (پانی ٹھہر گیا) عدن اسلئے فرمایا ہے کہ اس میں مؤمنین ہمیشہ ٹھہرے رہیں گے۔ اولئک کا جملہ اجر کے بیان کیلئے علیحدہ مستقل کلام کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ یہ جملہ (اولئک الخ) پہلے انّ کی خبر ہو اور دوسرا انّ اپنے اسم خبر سے ملکر جملہ معترضہ ہو یا یہ جملہ دوسری خبر بھی ہو سکتا ہے۔

۲۔ اساور جمع ہے اسورة کی یا یہ اسوا کی جمع ہے جو سوار کی جمع ہے (یعنی یہ جمع الجمع ہے) من ابتدائیہ ہے۔ من ذھب اساور کی صفت ہے اور اس سے پہلے من بیانیہ ہے اساور اور ذھب پر تنکیر ان کنگنوں کے حسن و خوبصورتی کی بڑائی کیلئے ہے، طبرانی نے الاوسط میں اور امام بیہقی نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اگر اہل جنت کے ادنیٰ زیور کا دنیا والوں کے تمام زیورات سے مقابلہ کیا جائے تو آخرت میں اللہ جو جنتیوں کو زیور عطا فرمائیں گے وہ اہل دنیا کے تمام زیورات سے افضل اور بہتر ہو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الفکر) 2۔ ایضاً

گا(1)، ابوالشیخ نے العظمہ میں کعب الاحبار سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک فرشتہ پیدا فرمایا ہے جو پیدائش سے لے کر قیامت تک جنتیوں کے زیور تیار کرتا رہے گا۔ اگر جنتیوں کے زیوروں میں سے ایک زیور بھی (دنیا) میں لایا جائے تو سورج کی روشنی ختم ہو جائے۔

سے جنتیوں کے لباس سبز رنگ کے ہونگے۔ ابن السنی اور ابونعیم نے طب النبی ﷺ میں حضرت انس روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ رنگ سبز تھا(2)۔ سندس وہ کپڑا جو باریک ریشم سے بنا ہوا ہو اور استبرق وہ کپڑا جو موٹے ریشم سے بنا ہوا ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنتیوں کے کپڑوں میں موٹائی سے مراد اس کی پختگی ہے(3) عمر الحربی سے مروی ہے کہ سندس وہ ریشم کا کپڑا ہے جو سونے سے بُنا گیا ہو۔ نسائی، طیالسی، بزار اور بیہقی نے حسن سند سے حضرت عمر سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول ہمیں جنتیوں کے لباس کے متعلق بتائیے کیا بنے بنائے پیدا ہونگے یا ان بنے ہوئے ہونگے جن کو بعد میں بنایا گیا ہوگا، ایک شخص یہ سوال سن کر ہنس پڑا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ایک ناواقف آدمی عالم سے سوال کرتا ہے تو تم ہنستے کیوں ہو۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا جنت کے پھل دو مرتبہ ان کپڑوں سے پھٹیں گے(4)۔ (یعنی جنتیوں کے لباس درختوں کے پھلوں سے پیدا ہوں گے) بزار، ابویعلیٰ اور طبرانی نے ابوالخیر مرثد بن عبداللہ سے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا جنت میں ایک درخت ہے جس سے ریشم پیدا ہوتا ہے جو اہل جنت کا لباس ہوگا(5)۔

ہے جنتی جنت میں ٹیک لگا کر بیٹھے ہونگے۔ ٹیک لگا کر بیٹھنے کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ کیفیت خوشحال اور بادشاہوں کی ہوتی ہے جو صوفوں پر بیٹھتے ہیں۔ وہ نشست گاہ جو حجلہ عروسی میں ہوتی ہے، اسے اریکہ کہتے ہیں۔ اس کی جمع ارائک ہے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اریکہ وہ تخت ہوتا ہے جو حجلہ عروسی میں سجایا گیا ہوتا ہے اور تخت بغیر حجلہ کے ہو تو اسے اریکہ نہیں کہتے۔ اسی طرح حجلہ کو بغیر تخت کے اریکہ نہیں کہتے۔ جب حجلہ اور تخت دونوں ہوں تو اس مجموعہ کو اریکہ کہتے ہیں۔ بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے فرمایا ارائک موتیوں اور یاقوت سے بنے ہونگے(6)۔

ھ جنت کتنی عمدہ جزاء ہے اور کتنی بہتر قرار گاہ اور عمدہ مجلس ہے یا یہ معنی کہ صوفے کتنے آرام دہ ہیں۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِأَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ أَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا ﴿٣٢﴾

''اور بیان فرمائیے ان کیلئے مثال دو آدمیوں کی ہم نے دیے تھے ان دونوں میں سے ایک کو لے دو باغ انگوروں کے اور ہم نے باڑ بنادی ان دونوں کے اردگرد کھجور (کے درختوں) کی ۲ اور اگادی ان دونوں کے درمیان کھیتی ۳ ''

لے علامہ بغوی لکھتے ہیں کہ بعض علماء نے فرمایا یہ آیت دو بھائیوں کے بارے نازل ہوئی جو اہل مکہ میں سے بنی مخزوم سے تعلق رکھتے تھے۔ ان میں سے ایک بھائی ابوسلمہ عبداللہ بن عبدالاسود بن عبد یالیل (یہ نبی کریم ﷺ کے نکاح سے پہلے ام سلمہ کے خاوند بنے تھے۔ بعد میں ام سلمہ حضور ﷺ کے عقد نکاح میں آئیں تھیں) ابوسلمہ مومن تھا اور دوسرا بھائی اسود بن عبدالاسود بن عبد یالیل کافر تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عیینہ اور اس کے ساتھیوں کا حضرت سلمان فارسی اور اپنے جیسے درویشوں کے ساتھ جو طرز عمل تھا اس کی مثال ہے، ان

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 401 (العلمیہ) 2۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 118 (التراث الاسلامی)
3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 565 (الفکر) 4۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 401 (العلمیہ) 5۔ ایضاً 6۔ ایضاً صفحہ 402

دونوں کو بنی اسرائیل کے دو شخصوں کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ جن میں سے ایک مومن تھا، جس کا نام یہودا تھا، یہ حضرت ابن عباس کا قول ہے اور بقول مقاتل اس کا نام تملیخا تھا اور دوسرا کافر تھا جس کا نام قطروس تھا۔ وہب نے اس کا نام قطفیر لکھا ہے۔ ان دونوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے سورۃ الصافات میں فرمایا ہے۔ ان کا قصہ عبداللہ بن المبارک نے معمر کے حوالہ سے عطاء الخراسانی سے نقل کیا ہے، فرماتے ہیں دو آدمی آپس میں شریک تھے، جن کے پاس آٹھ ہزار دینار تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ دونوں بھائی تھے، انہیں وراثت سے آٹھ ہزار دینار ملے تھے ان دونوں نے انہیں تقسیم کرلیا، ان میں ایک نے ہزار دینار سے زمین خریدی، دوسرے نے اللہ سے عرض کی فلاں نے ہزار دینار کے عوض زمین خریدی ہے میں تجھ سے جنت میں ہزار دینار کے بدلے زمین خریدتا ہوں، اس نے ہزار دینار صدقہ کر دیئے پھر اس کے ساتھی نے ہزار دینار خرچ کر کے ایک گھر بنایا۔ مومن نے کہا یا اللہ فلاں نے ہزار دینار سے گھر بنایا ہے میں تجھ سے ہزار دینار کے عوض جنت میں گھر خریدتا ہوں اور ہزار صدقہ کر دیے پھر اس کے ساتھی نے ایک عورت سے شادی کی اور اس پر ہزار دینار خرچ کر دیے۔ مومن نے کہا اے اللہ میں تجھ سے جنت کی عورتوں سے نکاح کرنے کا سوال کرتا ہوں۔ ہزار دینار کے بدلے میں اس نے ہزار دینار صدقہ کر دیے پھر کافر نے ہزار کے بدلے میں غلام اور سامان خریدا۔ مومن نے کہا یا اللہ میں تجھ سے ہزار کے عوض غلام اور سامان خریدتا ہوں پھر اس نے ہزار صدقہ کر دیا۔ پھر مومن کو کسی ضرورت سے واسطہ پڑا تو وہ اپنے کافر ساتھی کے پاس آیا کہ شاید وہ مجھ سے نیکی کر دے، وہ اس کے راستہ پر بیٹھ گیا حتیٰ کہ کافر اس کے پاس خدام کی معیت میں پورے کروفر سے گزرا۔ کافر نے اسے پہچان لیا اور پوچھا تو فلاں ہے۔ مومن نے کہا ہاں فلاں ہوں۔ پوچھا کیا کام ہے؟ مومن نے اپنی تکلیف کا اظہار کیا اور کہا میں تیرے پاس آیا ہوں تاکہ تو میرے ساتھ نیکی کردے۔ کافر نے پوچھا تیرا وہ مال کہاں گیا جو ہم نے آپس میں تقسیم کیا تھا اور تجھے نصف حصہ ملا تھا۔ مومن نے اپنا سارا واقعہ بیان کر دیا (کہ وہ میں نے صدقہ کر دیا ہے) کافر نے کہا تو مال کو فقیروں، درویشوں پر صدقہ کر دیتا ہے چل نکل جا میں تجھے کچھ نہیں دے سکتا پس کافر نے مومن کو ترش لہجہ میں زجر و توبیخ کر کے نکال دیا پھر وہ دونوں مر گئے تو ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّىْ كَانَ لِىْ قَرِيْنٌ ۝ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ترجمہ:۔ پس وہ ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو نگے (اور) سوال جواب کریں گے کہے گا ان میں سے ایک کہ میرا ایک جگری دوست ہوا کرتا تھا(1)۔

روایت ہے کہ جب مومن اس کے پاس آیا تو وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر گھومنے لگا اور اسے اپنا مال و متاع اسے دکھانے لگا۔ اس وقت ان کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں، یعنی کافروں اور مومنین کیلئے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو یعنی مقدر یا نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں یا سابقہ زمانہ کے دو آدمیوں کی مثال بیان کرو رجلین مضاف کے حذف کے ساتھ مثل کا بدل ہے اور اس کے بعد مثل کی تفسیر ہے۔

۲۔ یعنی کافر کیلئے انگوروں کے باغ اگائے یہ جملہ تمثیل کا بیان یا رجلین کی صفت ہے۔ حفه القوم کا معنی ہے قوم نے اسے گھیر لیا اور نخل سے پہلے با زائدہ ہے جسے غشیت بہ میں با زائدہ ہے۔

۳۔ ان دونوں باغات کے درمیان کوئی جگہ بنجر یا خراب نہیں ہے بلکہ ان کے درمیان بھی ہم نے کھیتی اگا دی ہے گویا وہ دونوں باغ ہر قسم کے اناج اور پھلوں کے جامع ہیں اور بہت خوبصورت ترتیب اور دلکش انداز میں وہ باغ لگائے گئے ہیں۔

كِلْتَا الْجَنَّتَيْنِ اٰتَتْ اُكُلَهَا وَلَمْ تَظْلِمْ مِّنْهُ شَيْـًٔا ۙ وَّفَجَّرْنَا خِلٰلَهُمَا نَهَرًا ۙ۝

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3 صفحہ 566 (الفکر)

''یہ دونوں باغ اپنے اپنے پھل لائے اور نہ کم ہوئی ان سے کوئی چیز اور ہم نے جاری کر دیں ان کے درمیان نہریں ۱؎''

۱؎ باغ دو ہیں لیکن صیغہ اور ضمیر مفرد ذکر فرمائی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ کلتا مفرد ہے عام طور پر باغات کا پھل ایک سال اچھا ہوتا ہے دوسرے سال کم ہو جاتا ہے لیکن ان باغوں کے پھلوں میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی فجرنا کو یعقوب نے جیم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے جبکہ دوسرے قراء نے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اور ان باغوں کے درمیان نہریں جاری فرمائی ہیں تاکہ ان کو متواتر پانی ملتا رہے اور ان کی بہار باقی رہے اور ہمیشہ سرسبز و شاداب رہیں۔

وَّكَانَ لَهٗ ثَمَرٌ ۚ فَقَالَ لِصَاحِبِهٖ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا وَّاَعَزُّ نَفَرًا ﴿۳۴﴾

''اور (باغوں کے علاوہ) اور بھی اس کے اموال تھے ۱؎ تو (ایک روز) اس نے اپنے ساتھی سے بحث مباحثہ کے دوران کہا کہ میں دولت کے لحاظ سے بھی تم سے زیادہ ہوں اور نفری کے لحاظ سے بھی تم سے طاقتور ہوں ۲؎''

۱؎ ثمر کو عاصم نے ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابو عمرو نے ثاء کے ضمہ اور میم کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے دونوں کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ احیط ثمرہ میں بھی اسی طرح مختلف قرأتیں ہیں۔ الازہری فرماتے ہیں الثمر ہ کی جمع ثمر یعنی ثاء اور میم کے فتحہ کے ساتھ آتی ہے اور ثَمَرٌ کی جمع ثمار اور ثمار کی جمع الثمر یعنی ثاء اور میم کے ضمہ کے ساتھ آتی ہے۔ قاموس میں ہے الثمرة محركة حمل الشجر و انواع المال(1) یعنی الثمرة باغات اور باغات کے علاوہ مال کی اقسام کیلئے بھی استعمال ہوتا ہے، واحد ثمرة و ثمرہ ہے اور جمع ثمار ہے اور جمع الجمع ثمر اور جمع الجمع اثمار ہے اور اس سے مراد سونا، چاندی، نسل اور اولاد ہوتی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ باغوں کے علاوہ اس کے پاس مال و دولت کے کئی ذخائر بھی تھے اور یہ ثمر مالہ سے مشتق ہے جس کا معنی مال کا زیادہ ہونا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہاں ثمر سے مراد سونا اور چاندی ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں جنہوں نے ثمر کو ثاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک درختوں کے پھل مراد ہیں جو کھائے جاتے ہیں اور جنہوں نے ثاء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے ان کے نزدیک اس سے مراد مال کثیر ہے(2)۔

۲؎ نفر سے مراد خدام، نوکر چاکر اور معاون ہیں۔ بعض علماء نے اس کا معنی مذکر اولاد کیا ہے کیونکہ یہ اس کے ساتھ چلتے ہیں۔ اس معنی پر یہ ارشاد بھی دلالت کرتا ہے ان ترن انا اقل منک مالا وولداً۔

وَدَخَلَ جَنَّتَهٗ وَهُوَ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ ۚ قَالَ مَآ اَظُنُّ اَنْ تَبِيْدَ هٰذِهٖٓ اَبَدًا ﴿۳۵﴾

''اور (ایک دن) وہ اپنے باغ میں گیا درآنحالیکہ وہ اپنی جان پر ظلم کرنے والا تھا کہنے لگا میں نہیں خیال کرتا کہ یہ (سرسبز و شاداب) باغ کبھی برباد ہوگا ۱؎''

۱؎ یہاں ایک باغ کا ذکر فرمایا کیونکہ وہ علیحدہ علیحدہ ہر باغ میں داخل ہوتا تھا یا اس لئے کہ دونوں باغ ایک دوسرے کے ساتھ متصل تھے اس لئے ایک باغ فرما دیا یا باڑ اور چار دیواری کے ایک ہونے کی وجہ سے (جنت) ایک باغ فرمایا اور درمیان میں نہر کی وجہ سے جَنَّتَیْن (دو باغ) فرمایا یا وہ باغ مراد ہے جس نے اسے دائمی باغ سے محروم کر دیا تھا، جس کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے متقین سے فرمایا ہے چونکہ کافر کی امیدیں بڑی طویل تھیں اور غفلت میں سرکش ہو چکا تھا اور مہلت کی وجہ سے بڑے گھمنڈ میں تھا، اس وجہ سے اس نے کہا

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 512 (التراث الاسلامی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 568 (الفکر)

میں تو اس باغ کی فناء کا تصور بھی نہیں کرتا شاید یہ بھی مراد ہو کہ اس نے یہ گمان کیا کہ اس کی یہ خوشحالی، مال، دولت اور باغات ہمیشہ رہیں گے، جب تک اس کی زندگی کے سانس باقی ہیں کیونکہ کوئی عقلمند خواہ مومن ہو یا کافر وہ یہ تو جانتا ہے کہ ایک دن اس دنیا سے کوچ کرنا ہے اور ہمیشہ زندہ رہنا تو ممکن ہی نہیں ہے یا یہ مراد ہے کہ اس نے زبان حال سے یہ کہا تھا کیونکہ جو یاد الٰہی سے غافل ہوتے ہیں اور دنیا کی لذتوں اور آسائشوں میں منہمک ہوتے ہیں وہ بڑی طویل امنگیں رکھتے ہیں اور ایسے ایسے اعمال کرتے ہیں گویا انہوں نے کبھی مرنا ہی نہیں ہے۔ گویا وہ زبان حال سے کہتے ہیں کہ نہ ہمارے باغ تباہ ہوں گے اور نہ قیامت قائم ہوگی۔

وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآىِٕمَةً وَّلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا ۝۳۶

''اور میں یہ خیال بھی نہیں کرتا کہ کبھی قیامت بھی برپا ہوگی اور بفرض محال اگر مجھے لوٹایا گیا اپنے رب کی طرف تو یقیناً میں پاؤں گا اس (نزہت گاہ) سے بہتر پلٹنے کی جگہ [1]''

[1] چونکہ وہ کافر تھا اور قیامت کے وقوع کا منکر تھا اس لئے اس نے کہا میں قیامت کا تصور کر بھی نہیں سکتا۔ پھر اس نے کہا بفرض محال اگر مرنے کے بعد تمہارا گمان کے مطابق مجھے رب کے حضور لوٹایا بھی گیا تو میں آخرت میں دنیا کی سعاتمندیوں سے زیادہ سعادت و آرام عطا فرمائے گا۔ اس نے یہ اس لئے کہا تھا کہ کیونکہ اس کا یہ اعتقاد تھا کہ دنیا میں جو مجھے اللہ تعالیٰ نے آرام و آسائش دی ہے، یہ اس وجہ سے ہے کہ میں اللہ کی بارگاہ میں معزز و مکرم ہوں اور میرا یہ اللہ کے ہاں حق ہے، بصریوں اور کوفیوں نے منها کو مفرد ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے جس کا مرجع وہ باغ ہے جس میں وہ داخل ہوا تھا اور حجازیوں اور شامی قراء نے منهما تثنیہ ضمیر کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کے مصاحف میں بھی تثنیہ ضمیر کے ساتھ ہے اور مرجع جنتين ہے۔ منقلبا کا معنی، مرجع اور انجام ہے۔

قَالَ لَهٗ صَاحِبُهٗ وَهُوَ يُحَاوِرُهٗٓ اَكَفَرْتَ بِالَّذِيْ خَلَقَكَ مِنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ سَوّٰىكَ رَجُلًا ۝۳۷

''اس کے ساتھی نے اس بحث مباحثہ کے درمیان کہا کیا تو انکار کرتا ہے اس ذات کا جس نے تجھے پیدا فرمایا مٹی سے پھر نطفہ سے پھر بنا سنوار کر تجھے مرد بنایا [1]''

[1] یہ مومن کی گفتگو جو وہ اپنے ساتھی کافر سے کر رہا ہے۔ کیا تو اس کریم ذات کا انکار کرتا ہے جس نے تجھے مٹی سے پیدا فرمایا، تیرے مادہ کی اصل مٹی ہے یا تیرے اصل آدم علیہ السلام کا مادہ مٹی ہے اور پھر غور کر تیرا اقریبی مادہ بھی اتنی عمدہ چیز نہیں وہ نطفہ ہے پھر اس نے تجھے اپنی کمال قدرت سے کامل انسان بنا دیا۔ اس آیت میں قیامت کے انکار کو اللہ تعالیٰ کے انکار سے تعبیر کیا گیا ہے کیونکہ قیامت کا انکار اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت پر شک کی بنیاد پر ہے۔ اسی وجہ سے اس کی مٹی کی تخلیق پر ان کار قیامت کو مرتب فرمایا ہے کیونکہ جو ابتداءً مٹی سے پیدا کرنے پر قادر ہے، وہ اس کے اعادہ پر بھی قادر ہے۔

لٰكِنَّا۟ هُوَ اللّٰهُ رَبِّيْ وَلَآ اُشْرِكُ بِرَبِّيْٓ اَحَدًا ۝۳۸

''لیکن میں [1] (تو) وہ اللہ ہی میرا رب ہے اور میں شریک نہیں ٹھہراتا اپنے رب کے ساتھ کسی کو [2]''

[1] لكنا کو جمہور قراء نے وقف کی صورت میں خط کی اتباع کرتے ہوئے الف کے ساتھ پڑھا ہے اور وصل کی صورت میں بغیر الف کے پڑھا ہے کیونکہ اس کی اصل لكن انا ہے۔ تخفیف کیلئے ہمزہ کو حذف کیا گیا ہے اور اس کی حرکت لكن کے نون کو دی گئی ہے پس

دونوں جمع ہو گئے تو آپس میں مدغم ہو گئے اور الف خط میں باقی رہا، وقف کی صورت میں الف پڑھا جاتا ہے جیسے انا میں وقت کی صورت میں پڑھا جاتا ہے اور وصلاً الف نہیں پڑھا جاتا جیسے انا میں وصلاً الف نہیں پڑھا جاتا۔ ابن عامر، یعقوب نے وصل کی صورت میں بھی الف کیساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ہمزہ کے عوض میں ہے یا وصل کو وقف کے قائم مقام کرتے ہوئے ایسا پڑھا ہے۔

۲؎ ھو ضمیر شان ہے اور جملہ اس کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھو اللہ کی ضمیر ہو اور اللہ اسم جلالت اس کا بدل ہو اور ربی اس کی خبر ھو اور ھو اللہ ربی کا جملہ فعل محذوف کا مفعول ہو، تقدیر عبارت اس طرح ہو اقول ھو اللہ ربی اور اقول کا جملہ انا کی خبر ہو اور ضمیر عائد اقول کی انا ضمیر ہو اور اس تقدیر کی دلیل ولا اشرک ربی، کا عطف ہے۔ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے ولا اشرک ربی اکفرت سے استدراک ہے گویا اس طرح کہا ہے تو اللہ کا منکر ہے لیکن میں مومن اور موحد ہوں جیسا کہ یہ جملہ ہے زید غائب لکن عمرو حاضر امام بغوی فرماتے ہیں کسائی نے فرمایا اس آیت میں تقدیم وتاخیر ہے اصل میں لکن اللہ ھو ربی ھے (1) اس صورت میں لکنا میں خلاف قیاس رسم الخط میں الف زائدہ ہے۔

وَلَوْلَآ اِذْ دَخَلْتَ جَنَّتَكَ قُلْتَ مَا شَآءَ اللّٰهُ ۙ لَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ ۚ اِنْ تَرَنِ اَنَا اَقَلَّ مِنْكَ مَالًا وَّوَلَدًا ۚ﴿۳۹﴾

''اور کیوں ایسا نہ ہوا کہ جب تو باغ میں داخل ہوا تو تو کہتا ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ (وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر کسی میں کوئی طاقت نہیں)۱؎ اگر تو نے مجھے دیکھا کہ میں کم ہوں تجھ سے مال اور اولاد میں ۲؎''

۱؎ ماشاء اللہ سے پہلے ما موصولہ بھی ہوسکتا ہے اور ما شرطیہ بھی، شرطیہ کی صورت میں جواب محذوف ہوگا۔ یہ اقرار ہے کہ یہ باغ اور جو کچھ اس میں ہے اللہ کی مشیت اور چاہت سے ہے۔ اگر چاہے تو وہ اس کو باقی رکھے چاہے تو اس کو تلف کردے۔ یعنی تو نے باغ میں داخل ہوتے وقت اپنے عجز اور ناتوانی اور اللہ کی قدرت کا اعتراف کیوں نہ کیا کہ میں تو اس باغ کی حفاظت پر قدرت نہیں رکھتا مگر اللہ تعالیٰ کی مدد اور معونت سے۔ اس کی آبادی اور اس کی تدبیر کی جو توفیق ملی ہے، یہ بھی اللہ تعالیٰ کی معونت اور تائید سے ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت انس کی حدیث روایت کی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا جو کسی چیز کو دیکھے اور وہ اس کو اچھی لگی تو کہے ماشا اللہ لا قوۃ الا باللہ ایسا کہنے سے اس کو نظر بد نہ لگے گی (2) ابن السنی نے بھی اس طرح روایت کی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ہشام بن عروہ عن ابیہ سے مروی ہے کہ جب بھی حضرت عروہ اپنے مال میں سے کوئی اچھی چیز دیکھتے یا باغ میں داخل ہوتے تو یہ کہتے ماشاء اللہ لاقوۃ الا باللہ (3)۔

۲؎ ترن میں قالون اور ابو عمرو نے صرف وصل کی صورت میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے اور باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ انا ضمیر فصل ہے یا مفعول اول کی تاکید ہے۔ اقل کو انا کی خبر کے اعتبار سے مرفوع بھی پڑھا گیا ہے اور پھر جملہ ترن کا مفعول ثانی ہے۔

فَعَسٰی رَبِّیْٓ اَنْ یُّؤْتِیَنِ خَیْرًا مِّنْ جَنَّتِكَ وَ یُرْسِلَ عَلَیْهَا حُسْبَانًا مِّنَ السَّمَآءِ فَتُصْبِحَ صَعِیْدًا زَلَقًا ﴿۴۰﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 569 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 405 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 569 (الفکر)

''پس عجب نہیں کہ میرا رب مجھے عطا فرما دے کوئی بہتر چیز تیرے (اس) باغ سے اور اتارے اس باغ پر کوئی آسمانی عذاب تو ہو جائے یہ (سرسبز) باغ ایک چٹیل میدان ۱''

۱ ربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان یؤتین میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو ثابت رکھا ہے اور نافع اور ابو عمرو نے صرف وصل میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے۔ یہ جملہ ان ترن کا جواب ہے۔ قتادہ نے حسبانا کا معنی عذابا کیا ہے۔ ابن عباس نے آگ فرمایا ہے۔ قتیبی نے اس کا معنی پتھر یا طوفان فرمایا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ حسبانۃ کی جمع ہے اور اس کا معنی الصواعق (کڑک) ہے بعض علماء فرماتے ہیں یہ حساب کے معنی میں مصدر ہے اور اس سے مراد باغ کی تباہی کا اندازہ لگانا یا برے اعمال کا عذاب ان کے حساب سے دینا ہے (1) صعیداً زلقاً یعنی وہ باغ اس طرح صاف ہو جائے کہ اس پر پاؤں پھسلنے لگیں کیونکہ اس کے درختوں اور پودوں کا نام و نشان ہی نہ ہوگا۔ حضرت مجاہد نے اس کا معنی خوفناک ریگستان کیا ہے۔

اَوْ یُصْبِحَ مَآؤُهَا غَوْرًا فَلَنْ تَسْتَطِیْعَ لَهٗ طَلَبًا ﴿۴۱﴾

''یا یوں جذب ہو جائے اس کا پانی زمین کی گہرائی میں کہ پھر تو اس کو تلاش کے باوجود نہ پا سکے ۱''

۱ غور از مین کے اندر چلا جانا یہ مصدر ہے اس کے ساتھ صفت لگائی گئی ہے جیسے زلقا مصدر کو بطور استعمال کیا گیا ہے۔

وَ اُحِیْطَ بِثَمَرِهٖ فَاَصْبَحَ یُقَلِّبُ كَفَّیْهِ عَلٰى مَاۤ اَنْفَقَ فِیْهَا وَ هِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰى عُرُوْشِهَا وَ یَقُوْلُ یٰلَیْتَنِیْ لَمْ اُشْرِكْ بِرَبِّیْۤ اَحَدًا ﴿۴۲﴾

''اور اس کے (باغ) کا پھل برباد ہو گیا پس وہ کف افسوس ملنے لگا اس مال کے نقصان پر جو اس نے باغ پر خرچ کیا تھا اور (اب) وہ گرا پڑا تھا اپنے چھپروں پر اور (بصد حسرت) کہنے لگا کاش! میں نے کسی کو اپنے رب کا شریک نہ بنایا ہوتا ۱''

۱ اس کا مال اس طرح ہلاک ہوا جیسی اس کو توقع نہ تھی یہ احاطتہ العدو سے مشتق ہے کیونکہ جب وہ گھیرے میں لے لیتا ہے تو وہ مخالف پر غالب آ جاتا ہے اور اسے ہلاک کر دیتا ہے۔ تقلیب الکف شرمندگی اور ندامت سے کنایہ ہے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک آیت کا مفہوم یہ ہے کہ کافر جب دنیا میں اپنے باغ کو گرا پڑا دیکھتا ہے تو کف افسوس ملتا ہے اور قیامت کے دن یا قبر میں جنت میں اپنے مقام کو دیکھے گا جس کو دوزخ سے بدل دیا گیا ہوگا تو کہے گا کاش میں نے کسی کو دنیا میں اپنے رب کا شریک نہ ٹھہرایا ہوتا۔ بربی کی یاء کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

وَ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ فِئَةٌ یَّنْصُرُوْنَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَ مَا كَانَ مُنْتَصِرًا ﴿۴۳﴾

''اور نہ رہی تھی اس کے پاس کوئی جماعت جو اس کی مدد کرتی اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اور نہ وہ بدلہ لینے کے قابل تھا ۱''

۱ حمزہ اور کسائی نے لم یکن یعنی یاء کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے اللہ کے سوا قیامت کے روز اس کے عذاب کو دور کرنے یا ہلاک شدہ باغ کو لوٹانے یا اس کی مثل لانے پر کوئی قادر نہیں ہے۔ صرف وہ ذات خود ہی کسی کی اعانت کرے تو کر سکتی ہے لیکن اس کے دستور میں کفار کی مدد کرنا نہیں ہے اور کافر اس سزا پر انتقام بھی نہیں لے سکتا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 179 (العلمیہ)

هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ لِلّٰهِ الْحَقِّ ۭ هُوَ خَيْرٌ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ عُقْبًا ﴿۴۴﴾

''یہاں سے ثابت ہوگیا کہ سارا اختیار اللہ سچے کیلئے ہے ؏ وہی بہتر ثواب دینے والا ہے اور اس کے ہاتھ میں بہتر انجام ہے ؏''

؏ یعنی جب قیامت قائم ہوگی تو واضح ہو جائے گا کہ اختیار کس کے ہاتھ میں ہے۔ حمزہ اور کسائی نے الولایۃ کو واو کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی غلبہ ہے اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی دوستی اور مدد کرنا ہے، جیسا کہ اس ارشاد الٰہی میں ہے الله ولی الذین آمنوا کہ اللہ ایمانداروں کا دوست اور مددگار ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے فتحہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی ربوبیت ہے اور اگر واؤ کے کسرہ کے ساتھ ہو تو اس کا معنی امارت ہے۔ ابوعمرو اور کسائی نے الحق کو رفع کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ ولایت کی صفت ہے۔ حضرت ابی کی قرات اس کی تائید کرتی ہے هُنَالِكَ الْوَلَايَةُ الْحَقُّ لِلّٰهِ۔

مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے۔ باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اسم جلالت کی صفت ہے جیسے اس ارشاد میں ہے ثُمَّ رُدُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ یلیتنی لم اشرک بربی احداً کا جملہ کافر سے دنیا میں شرمندگی اور شرک سے توبہ کے طور پر صادر ہوا ہو۔ یا جب اسے اپنی بھائی کی نصیحت یاد آئی ہو اور اس نے اضطراری اور اضطرابی حالت میں یہ کہا ہو اور اس نے گمان کیا ہو کہ یہ سارا نقصان مجھے شرک کی وجہ سے پہنچا ہے خواہ وہ ایمان لایا ہو یا نہ لایا ہو۔ یہ اس کا قول دوسرے کفار کے قول کی طرح ہوگا جب وہ کشتی میں سوار ہوتے ہیں اور وہ بھنور میں پھنس جاتی ہے تو وہ اللہ کو پکارتے ہیں فَاِذَا رَكِبُوْا فِي الْفُلْكِ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ پھر جب سوار ہوتے ہیں کشتی میں تو دعا مانگتے ہیں اللہ تعالیٰ سے خالص کرتے ہوئے اس کے لیے اپنے دین کو یعنی حالت اضطراب میں وہ کہے گا ولایت تو اللہ سچے کیلئے ہے۔

؏ اللہ تعالیٰ کی ذات اپنے اطاعت شعار بندوں کو بہتر جزاء عطا فرماتی ہے۔ انہیں دنیا میں اپنی حکمت کے تقاضے کے مطابق جزاء عطا فرماتا ہے اور آخرت میں بھی ان کو بہتر ثواب اور دائمی اجر عطا فرمائے گا، جبکہ دوسرے منکر لوگوں کو وہ اپنی منشاء کے مطابق حقیر اور فانی چیزیں عطا فرماتا ہے اور بس آخرت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ عقبا کو عاصم اور حمزہ نے قاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ عقبیٰ کا معنی جزاء ہے جزاء کو عقبیٰ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ طاعت کے پیچھے ہوتی ہے۔

وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَاۗءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَاۗءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ فَاَصْبَحَ هَشِيْمًا تَذْرُوْهُ الرِّيٰحُ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ مُّقْتَدِرًا ﴿۴۵﴾

''بیان فرمایئے ان سے دنیوی زندگی کی (ایک اور) مثال یہ پانی کی طرح ہے جسے ہم نے اتارا ہے آسمان سے پس گنجان ہوکر اگتی ہیں اس پانی سے زمین کی انگوریاں پھر کچھ عرصہ کے بعد وہ خشک بوسیدہ گھاس ہو جاتی ہے اڑائے پھرتی ہیں اسے ہوائیں ؏ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر پوری قدرت رکھنے والا ہے ؏''

؏ اے پیارے اپنی قوم کے سامنے اس دنیا کی ظاہری چمک دمک، بہت جلدی فنا اس کی عجیب وغریب حالت کو بیان کر دو یہ تو اس پانی کی طرح ہے جسے ہم اپنی قدرت سے اتارتے ہیں۔ کماء ھو کی خبر ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ یہ اضرب کا مفعول ثانی ہو اور ضرب بمعنی صیّر ہو۔ اختلط کا معنی مل جل جانا ہے، یعنی اس پانی کے سبب زمین کی فصل گنجان ہو جاتی ہے یا یہ معنی کہ پانی نے اس کھیتی میں اثر دکھایا اور وہ کھیتی

سرسبز وشاداب ہوگئی۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں تذر وہ کا معنی بکھیرنا ہے۔ بلکہ مجموعی کیفیت مشبہ بہ ہے اور وہ یہ ہے پانی کے ذریعے پودوں کا پیدا ہونا ان کا گنجان ہونا پھران کا ریزہ ریزہ ہو جانا پھران کو ہلواؤں کا بکھیرنا اور آخر میں اس طرح ہو جانا کہ گویا یہاں کھیتی تھی ہی نہیں۔

۲۔ اللہ تعالیٰ کسی چیز کے پیدا کرنے اور فناء کرنے پر پوری طرح قادر ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَةُ الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا ۚ وَالْبٰقِیٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَیْرٌ اَمَلًا ﴿۴۶﴾

''مال اور فرزند (تو صرف) دنیوی زندگی کی زیب وزینت ہیں ۱؎ اور (درحقیقت) باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں تیرے رب کے ہاں ثواب کے اعتبار سے اور بہتر ہیں جن سے امید وابستہ کی جاتی ہے ۲؎''

۱؎ یہ مال واولاد جس کی کثرت پر عیینہ اور اس جیسے مادیت پرست اتراتے ہیں، دنیا میں انسان ان سے زیب وزینت حاصل کرتا ہے لیکن یہ تو جلدی فناء ہونے والی ہیں۔ یہ دنیا کا مال واسباب آخرت کا زادراہ نہیں ہے۔

۲؎ اور ایک نیک اعمال جن کا اثر دائمی ہے وہ از روئے ثواب کے مال وفرزند سے اللہ کی بارگاہ میں ہزار درجہ بہتر ہیں۔ اور ہر اس چیز سے بہتر ہیں جن سے انسان امیدیں وابستہ کرتا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا مال اور بیٹے دنیا کی کھیتی ہیں اور نیک اعمال آخرت کی کھیتی ہیں۔ کبھی اللہ تعالیٰ یہ دونوں چیزیں بعض افراد کو عطا فرما دیتا ہے(1)۔ ابن عباس، عکرمہ اور مجاہد فرماتے ہیں الباقیات الصالحت سے مراد سبحان اللہ، الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر ہے۔ حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے کہ رسول ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ کی تسبیح، تہلیل، تحمید، تکبیر اور لا حول ولا قوۃ الا باللہ ہیں(2) اس حدیث کو امام احمد، ابن حبان اور حاکم نے روایت کیا ہے اور حاکم نے اس کی تصحیح بھی کی ہے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا لا حول ولا قوۃ الا باللہ کی کثرت کیا کرو کیونکہ یہ تکلیف کے ننانوے (99) دروازے بند کرتا ہے اور کم از کم تکلیف جو اس سے دور ہوتی ہے وہ حزن وملال ہے اس حدیث کو العقیلی نے روایت کیا ہے۔

نعمان بن بشیر سے مرفوع حدیث مروی ہے کہ سبحان اللہ الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر یہ الباقیات الصالحات ہیں(3) طبرانی نے اسی کی مثل سعد بن عبادہ کی حدیث نقل کی ہے۔ ابن جریر نے حضرت ابو ہریرہ سے مرفوع حدیث اسی طرح نقل کی ہے، ایک صحابی سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا افضل کلام یہ ہے۔ سبحان اللہ الحمد للہ لا الہ الا اللہ واللہ اکبر۔ اس کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سبحان اللہ الحمد للہ ولا الہ الا اللہ واللہ اکبر میرے نزدیک ہر اس چیز سے زیادہ محبوب ہے جن پر سورج طلوع ہوتا ہے(4)۔ اس حدیث کو مسلم اور ترمذی نے روایت کیا ہے۔ حضرت سعید بن جبیر، مسروق اور ابراہیم فرماتے ہیں الباقیات الصالحت، پانچ نمازیں ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہ قول مروی ہے۔ ابن عباس سے اس کا مفہوم اعمال صالحہ بھی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 571 (الفکر) 2۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 408 (العلمیہ) 3۔ ایضاً
4۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 16، حدیث: 32 (العلمیہ)

مروی ہے۔ حضرت قتادہ کا بھی یہی قول ہے۔ (1)

وَيَوْمَ نُسَيِّرُ الْجِبَالَ وَتَرَى الْأَرْضَ بَارِزَةً وَحَشَرْنَاهُمْ فَلَمْ نُغَادِرْ مِنْهُمْ أَحَدًا ﴿٤٧﴾

"اور (غور کرو) جس روز ہم ہٹا دیں گے پہاڑوں کو (ان کی جگہ سے) ۱؎ اور تم دیکھو گے زمین کو کہ کھلا میدان ہے اور ہم جمع کریں گے انہیں پس نہیں پیچھے رہنے دیں گے ان میں سے کسی کو ۲؎"

۱؎ کوفیوں اور نافع نے جمع متکلم کا صیغہ نسیر پڑھا ہے اور جبال کو منصوب پڑھا ہے اور باقی قراء نے واحد مونث غائب کا صیغہ اور مجہول پڑھا ہے اور الجبال کو نائب الفاعل بنایا ہے، یعنی ہم پہاڑوں کو اپنی جگہ سے اکھیڑ دیں گے اور ریزہ ریزہ کریں گے۔ یوم اذکر فعل کی وجہ سے منصوب ہے یا عند ربک پر اس کا عطف ہے اس لئے منصوب ہے تقدیر یوں ہوگی اَلْبَاقِيَاتُ الصَّالِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ وَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ۔

۲؎ آپ کو زمین کھلا میدان نظر آئے گی، درخت، پہاڑ اور کوئی منزل دکھائی نہ دے گی۔ ابن ابی حاتم نے قتادہ سے بارزۃ کا یہی مفہوم نقل کیا ہے۔ عطا فرماتے ہیں زمین میں جو مردے وغیرہ دفن ہیں وہ ظاہر ہو جائیں گے اور زمین کا باطن بھی ظاہر دکھائی دے گا پھر فرمایا ہم لوگوں کو قبروں سے اٹھائیں گے۔ نسیر مضارع کا صیغہ استعمال فرمایا اور یہاں حشرنا ماضی کا صیغہ ذکر فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کا وقوع متحقق اور یقینی ہے یا اس بات پر دلالت کرنے کیلئے کہ حشر پہاڑ کے ہٹانے سے پہلے ہوگا، اس صورت میں واؤ حالیہ ہوگی اور قد مقدر ہوگا۔ غدرہ کا معنی کسی کو چھوڑ دینا ہے، وفا نہ کرنے کو غدر کہتے ہیں۔ فلم نغادر کا معنی ہوگا کہ ہم نہیں چھوڑیں گے، یعنی زندہ کیے بغیر ہم کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔

وَعُرِضُوا عَلَىٰ رَبِّكَ صَفًّا لَّقَدْ جِئْتُمُونَا كَمَا خَلَقْنَاكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ بَلْ زَعَمْتُمْ أَلَّن نَّجْعَلَ لَكُم مَّوْعِدًا ﴿٤٨﴾

"اور وہ پیش کیے جائیں گے آپ کے رب کی بارگاہ میں صفیں باندھے ہوئے ۱؎ (پھر ہم انہیں کہیں گے کہ) آج تم آ گئے ہو ہمارے پاس جیسے ہم نے پیدا کیا تھا تمہیں پہلی بار ۲؎ ہاں تم تو یہ خیال کیے ہوئے تھے کہ ہم نہیں مقرر کریں گے تمہارے لیے وعدہ کا وقت ۳؎"

۱؎ لوگوں کے بارگاہ الٰہی میں پیش ہونے کی حالت کو لشکر کی حالت سے تشبیہ دی گئی ہے جو بادشاہ کے سامنے تعارف کیلئے نہیں بلکہ اس لئے آتا ہے کہ وہ انہیں حکم دے اور سارے بندے صفوں میں ہونگے، کوئی مخفی اور پوشیدہ نہیں ہوگا۔ لقد جئتمونا حال ہے عرضوا کی ضمیر سے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لقد جئتمونا یوم کا عامل ہو۔

۲؎ یعنی ہم کہیں گے کہ تم آ گئے ہو جس طرح ہم نے تمہیں پیدا کیا تھا پہلی مرتبہ کہ تمہارے سر پر کپڑا تھا، نہ پاؤں میں جوتا تھا اور تمہارا ختنہ بھی نہ کیا گیا تھا۔ تمہارے پاس کچھ بھی نہیں ہے جو ہم نے تمہیں بعد میں دنیا کے اندر عطا کیا تھا۔

بخاری، مسلم اور ترمذی نے اپنی سنن میں ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ رسول ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں پیدل چلتے ہوئے، ننگے بدن، غیر مختون جمع ہو گے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 572 (الفکر)

پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ (1) سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔ بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول ﷺ نے فرمایا لوگوں کو قیامت کے روز ننگے پاؤں ننگے بدن اور بغیر ختنہ کے اٹھایا جائے گا۔ حضرت عائشہ نے عرض کی مرد، عورتیں ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہونگے۔ فرمایا اے عائشہ اس دن معاملہ بہت سخت ہوگا (2)۔ طبرانی نے اوسط میں صحیح سند کے ساتھ ام سلمہ سے اسی طرح روایت کی ہے۔ اس حدیث میں ہے کہ حضرت عائشہ نے عرض کی یہ تو بڑی بری حالت ہوگی۔ ایک دوسرے کی شرمگاہوں کو دیکھ رہے ہوں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا لوگ مشغول ہوں گے۔ حضرت عائشہ نے عرض کی حضور! لوگوں کی کیا مشغولیت ہوگی؟ فرمایا صحائف کا کھلنا جن میں چیونٹی اور رائی کے دانہ کے برابر نیکیاں اور گناہ لکھے ہوئے ہوں گے۔ امام بیہقی نے ابن عباس سے مرفوع حدیث نقل کی ہے، اس میں ہے کہ آپ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے کہا لوگ ایک دوسرے کی شرم گاہ کو دیکھ رہے ہونگے؟ آپ ﷺ نے فرمایا اے فلانہ ہر شخص کو اپنی پڑی ہوگی، وہ ہر چیز سے غافل ہوگا۔ طبرانی نے سہل بن سعد سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما سے بھی مرفوع حدیث اسی طرح مروی ہے، اس میں ہے کہ آپ ﷺ کی زوجہ محترمہ رضی اللہ عنہا نے عرض کیا یا رسول ﷺ ایک دوسرے کو کیسے دیکھیں گے آپ ﷺ نے فرمایا آنکھیں پھٹی ہوں گی اور حضور نے اپنی نظر اوپر اٹھائی، طبرانی اور بیہقی نے سودہ بنت زمعہ سے روایت کیا ہے، فرماتی ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز لوگ ننگے پاؤں، ننگے بدن اور غیر مختون ہوں گے۔ کسی کے منہ تک پسینہ ہوگا، کسی کے کانوں کی لووں تک ہوگا۔ میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ یہ تو بڑی بری حالت ہوگی، لوگ ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے ۔ فرمایا لوگ اس سے غافل ہوں گے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ (3) علامہ قرطبی فرماتے ہیں ان احادیث میں عراۃ (ننگے بدن) کا قول اس حدیث کے مخالف نہیں ہے جس میں ہے کہ مردے اپنی قبروں میں اپنے کفنوں کے ساتھ ایک دوسرے کی زیارت کرتے ہیں کیونکہ یہ حدیث برزخ کے متعلق ہے۔ جب قبور سے نکلیں گے تو برہنہ بدن ہوں گے۔ لیکن یہ احادیث ان احادیث کے معارض ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں۔ ابو داؤد، حاکم، ابن حبان اور بیہقی نے حضرت ابو سعید الخدری سے روایت کی ہے۔ حاکم نے اسے صحیح بھی لکھا ہے۔ جب حضرت ابو سعید الخدری پر موت کا وقت قریب آیا تو نئے کپڑے منگوائے اور پہن لیے پھر فرمایا میں نے رسول ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ میت ان کپڑوں میں اٹھایا جائے گا جن میں وہ مرے گا (4)۔ ابن ابی الدنیا نے حسن سند کے ساتھ حضرت معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے اپنی ماں کو دفن کیا تو انہیں نئے کپڑوں میں کفن دیا گیا تھا۔ اور پھر حضرت معاذ نے فرمایا اپنے مردوں کو اچھے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز انہی کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

سعید بن منصور نے اپنی سنن میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اپنے مردوں کو اچھے لباس میں کفن دیا کرو کیونکہ وہ قیامت کے روز ان کپڑوں میں اٹھائے جائیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں بعض علماء نے ان احادیث کے ظاہر کا اعتبار کیا ہے اور اکثر علماء نے ان احادیث کو شہید پر محمول کیا ہے جسے ان کپڑوں میں ہی دفن کرنے کا حکم ہے جن میں وہ قتل ہوتا ہے اور اسی خون کے ساتھ دفن کرنے کا حکم ہے۔

حضرت ابو سعید نے یہ حدیث شہید کے متعلق سنی تھی لیکن انہوں نے اس کو عموم پر محمول کر دیا ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں ان احادیث

1۔ صحیح مسلم، جلد 17، صفحہ 160، حدیث: 58 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 159، حدیث 56

3۔ کنز العمال، جلد 14، صفحہ 363 (التراث الاسلامی) 4۔ ایضاً، جلد 15، صفحہ 578 (التراث الاسلامی)

میں اس طرح تطبیق ہوگی کہ بعض لوگ برہنہ اٹھیں گے اور بعض کپڑوں کے ساتھ اٹھیں گے۔ میں کہتا ہوں یہ تطبیق وتوفیق بہتر ہے اور یہ آیت کریمہ کفار کے متعلق ہے کیونکہ آگے بھی کفار کے متعلق ارشاد ہے۔

۳؎ تمہارا یہ خیال تھا کہ ہم نے دوبارہ اٹھنے کا وقت مقرر نہیں کیا اور انبیاء کرام نے تم سے غلط بیانی کی ہے۔ بل کا کلمہ یہاں ایک واقعہ سے دوسرے واقعہ کی طرف خروج کیلئے ہے اور یہ اس بات پر دلالت کر رہا ہے کہ برہنہ جسم نیکوکاروں کے علاوہ کا ہوگا اور حضور ﷺ کا ارشاد ہے کہ آنکھیں پھٹی ہونگی اور قرآن کا ارشاد لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَأْنٌ يُغْنِيهِ۔ یہ کفار کے حق میں ہے اور آنکھوں کا پھٹا ہونا کفار کی صفت ہے۔ ہولناکی کی وجہ سے ان کی آنکھیں پھٹی ہونگی۔ نیکوکاروں کی یہ کیفیت نہ ہوگی لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد کہ سب سے پہلے ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا، اس سے اعتراض کیا جا سکتا ہے کیونکہ اس حدیث سے ثابت ہے کہ ابتداء میں انبیاء برہنہ ہونگے۔ ہاں اس حدیث کا جواب یہ دیا جا سکتا ہے کہ صلحاء اور نیکوکاروں کو قبروں کے اندر نکلنے سے پہلے کرامت کے لباس عطا کیے جائیں گے اور حضرت ابراہیم کو قبر کے اندر سب سے پہلے لباس پہنایا جائے گا۔ بعض علماء اس حدیث کو اس پر محمول کرتے ہیں کہ کپڑوں سے مراد عمل صالح ہے جیسا کہ عمل صالح کو قرآن میں لباس سے تعبیر کیا گیا ہے فرمایا وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ۔

وَوُضِعَ الْكِتٰبُ فَتَرَى الْمُجْرِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا فِيْهِ وَيَقُوْلُوْنَ يٰوَيْلَتَنَا مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا ۚ وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا ۗ وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ اَحَدًا ﴿۴۹﴾

''اور رکھ دیا جائیگا (ان کے سامنے) نامہ عمل ۱؎ پس تو دیکھے گا مجرموں کو کہ وہ ڈر رہے ہونگے اس سے جو اس میں ہے اور کہیں گے صد حیف! اس نوشتہ کو کیا ہوگیا ہے کہ نہیں چھوڑا اس نے کسی چھوٹے گناہ کو اور نہ کسی بڑے گناہ کو مگر اس نے اس کا شمار کرلیا ہے اور (اس دن) وہ پالیں گے جو عمل انہوں نے کیے تھے اپنے سامنے۔ اور آپ کا رب تو (اے حبیب!) کسی پر زیادتی نہیں کرتا ۲؎''

۱؎ الکتاب پر الف لام جنس کا ہے۔ اس سے مراد بندوں کے اعمال کی کتابیں ہیں کیونکہ یہی نامۂ اعمال بندوں کے دائیں اور بائیں ہاتھ میں رکھا جائے گا یا میزان میں رکھا جائے گا یا رحمٰن کے سامنے رکھا جائے گا۔ جن کو نامہ اعمال بائیں ہاتھ میں ملے گا، اپنے گناہوں کو لکھا ہوا دیکھ کر ڈر رہے ہوں گے۔ اور اس وقت وہ اپنی ہلاکت کو پکار دیں گے۔ یہاں نداء کا معنی جزع فزع کا اظہار کرنا ہے اور مخاطبین کو آگاہ کرنا ہے جن پر یہ کلام نازل ہوا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں صغیرہ سے مراد بغیر وجہ کے مسکرانا ہے اور کبیرہ سے مراد قہقہہ لگانا ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں صغیرہ سے مراد چھونا، بوسہ لینا ہے اور کبیرہ سے مراد زنا ہے(1) اور فرماتے ہیں یہ بطور تمثیل فرمایا ہے۔ ہم نے سورۂ نساء میں اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ الآیۃ کی تفسیر میں گناہ کبیرہ کا ذکر کردیا ہے۔ الا احصاھا محل نصب میں ہے کیونکہ یہ لایغادر کا مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر چھوٹا بڑا گناہ اس کتاب میں موجود اور شمار ہوگا۔

سہل بن سعد سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا چھوٹے گناہوں سے بچو۔ چھوٹے گناہوں کی مثال اس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (الفکر)

قوم کی طرح ہے جو کسی وادی کے بطن میں اترے، ایک ایک لکڑی اٹھا کر لائیں اوران پر روٹیاں پکالیں (تو جس طرح چھوٹی ایک ایک لکڑی مل کر روٹیاں پکانے کے قابل ہوگئیں) اس طرح چھوٹے گناہ بھی ہلاک کرنے والے ہیں۔ اس حدیث کو امام بغوی نے روایت کیا ہے(1) طبرانی نے حضرت سعد بن جنادہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب نبی کریم ﷺ حنین سے فارغ ہوئے تو ہم ایک چٹیل میدان میں اترے جہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جو کچھ کسی کے پاس ہو وہ لے آئے۔ بڑا یا چھوٹا سب کچھ جمع کرو۔ راوی فرماتے ہیں چند منٹوں میں ہم نے مال کا ڈھیر لگا دیا۔ رسول ﷺ نے فرمایا کیا تم یہ ڈھیر دیکھ رہے ہو؟ اسی طرح گناہ تم میں سے ایک شخص کے جمع ہوں گے جیسے تم نے یہ ڈھیر جمع کیا ہے بس ہر شخص کو اللہ سے ڈرنا چاہیئے نہ چھوٹا گناہ کرے، نہ بڑا کیونکہ یہ سب شمار کیے جاتے ہیں(2)۔ نسائی، ابن ماجہ اور ابن حبان نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عائشہ چھوٹے گناہوں سے بچو کیونکہ اللہ کی طرف ان کا بھی مطالبہ کیا جائے گا(3)۔

امام بخاری نے حضرت انس سے روایت کیا ہے، فرمایا تم ایسے اعمال کرتے ہو جو تمہاری نظر میں بال سے بھی زیادہ باریک ہوتے ہیں، جبکہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں انہیں ہلاک کرنے والا شمار کرتے تھے(4)۔ امام احمد نے اسی کی مثل صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید سے روایت کی ہے۔

ء وہ اپنے صحیفوں میں ہر عمل کو موجود پائیں گے یا جو انہوں نے اعمال کیے، ان کی جزاء کو موجود پائیں گے اور اللہ تعالیٰ کسی پر زیادتی نہیں فرماتا، وہ کسی بندے کے نامہ عمل میں کوئی ایسا گناہ نہیں لکھتا جو اس نے کیا نہ ہو اور نہ سزا سے زیادہ دیتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز بندوں کو تین پیشیاں ہوں گی۔ دو پیشیاں تو جھگڑنے اور عذر پیش کرنے کیلئے ہوں گی اور تیسری پیشی یہ ہوگی کہ صحیفے (نامہ اعمال) اڑکر لوگوں کے ہاتھوں میں پہنچ جائیں گے۔ کوئی دائیں ہاتھ میں لے گا اور کوئی بائیں ہاتھ میں لے گا(5) اس حدیث کو ابن ماجہ نے ابوموسیٰ الاشعری سے اور امام ترمذی نے ابوہریرہ سے روایت کیا ہے اور بیہقی نے ابن مسعود سے موقوف روایت کی ہے۔ حکیم ترمذی فرماتے ہیں جھگڑا دشمنوں کیلئے ہوگا وہ جھگڑیں گے کیونکہ وہ اپنے رب کو نہیں پہچانتے ہوں گے اور ان کا خیال ہوگا کہ ہم جھگڑیں گے تو بچ جائیں گے اور ان کی صحبت قائم ہوگی۔ دوسری پیشی میں حضرت آدم تمام انبیاء کے سامنے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں عذر پیش کریں گے۔ اور اللہ تعالیٰ انبیاء کرام کی موجودگی میں دشمنوں پر حجت قائم فرمائے گا پھر انہیں دوزخ کی طرف بھیج دے گا اور تیسری پیشی مومنین کیلئے ہوگی اور یہ پیشی مغفرت کیلئے ہوگی۔ اللہ تعالیٰ مومنین کو خلوت میں عتاب فرمائے گا حتی کہ وہ حیاء اور خجالت محسوس کریں گے لیکن اللہ تعالیٰ انہیں معاف فرما دے گا اور ان سے راضی ہو جائے گا۔ حضرت انس نے حضور ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا سارے نامہ اعمال عرش کے نیچے ہوں گے۔ جب اللہ کی بارگاہ میں حاضری کا وقت ہوگا تو اللہ تعالیٰ ایک ہوا چلائے گا جو دائیں اور بائیں ہاتھوں میں نامہ اعمال پہنچا دے گی اور ان کی ابتداء میں لکھا ہوگا اِقْرَاْ كِتٰبَكَ ؕ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔

ابن جریر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ آپ فرماتے تھے جو شخص دنیا میں ان پڑھ ہوگا، قیامت کے روز وہ بھی پڑھ لے گا

وَ اِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓىٕكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْۤا اِلَّاۤ اِبْلِیْسَ ؕ كَانَ مِنَ الْجِنِّ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 574 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 411 (العلمیہ)
3۔ الدر المنثور، جلد 3، صفحہ 411 (العلمیہ) 4۔ مشکوۃ المصابیح، جلد 3، صفحہ 145 (الفکر) 5۔ ایضاً، صفحہ 205

فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ؕ اَفَتَتَّخِذُوْنَهٗ وَ ذُرِّیَّتَهٗۤ اَوْلِیَآءَ مِنْ دُوْنِیْ وَ هُمْ لَكُمْ عَدُوٌّ ؕ بِئْسَ لِلظّٰلِمِیْنَ بَدَلًا ۞

''اور یاد کرو جب ہم نے حکم دیا فرشتوں کو کہ سجدہ کرو آدم کو پس سب نے سجدہ کیا سوائے ابلیس کے [1] وہ قوم جنّ سے تھا سو اس نے نافرمانی کی اپنے رب کے حکم کی (اے اولاد آدم) کیا تم بناتے ہو اسے اور اس کی ذریت کو اپنا دوست مجھے چھوڑ کر حالانکہ وہ سب تمہارے دشمن ہیں ظالموں کیلئے بہت برا بدلہ ہے [2]''

[1] اللہ تعالیٰ نے آدم کو فرشتوں کے سجدہ کرنے اور ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کو کئی مقامات پر ذکر فرمایا ہے کیونکہ یہ ان امور کی تمہید اور مقدمہ ہے، جبکہ بیان مقصود تھا۔ یہاں جب پہلے اللہ تعالیٰ نے ظاہر مال و دولت پر فخر کرنے والوں کی مذمت فرمائی اور ان کی اس سوچ اور عمل کو قبیح فرمایا تو ابلیس کا ذکر فرما کر یہ ظاہر فرمایا کہ حکم الٰہی سے انحراف ابلیس کا طریقہ ہے یا جب اللہ تعالیٰ نے دنیا پر فخر کرنے اور دنیا سے شغف رکھنے والوں کا حال بیان فرمایا اور اس کا سبب دنیا کی محبت اور شیطان کی مکاری تھی۔ پہلے انہیں دنیا کی ظاہری چمک دمک سے عدم دلچسپی کی ترغیب دی کیونکہ یہ ساری چیزیں زوال پذیر ہیں اور پھر بتایا کہ نیک اعمال ہی باقی رہنے والے اور بہتر ہیں۔ پھر انہیں شیطان کی انسان سے پرانی دشمنی یاد دلا کر شیطان سے نفرت دلائی جارہی ہے۔ قرآن میں اس واقعہ کو بار بار ذکر کرنے کی یہی حکمت ہے۔

[2] وہ جنوں میں سے تھا۔ یہ جملہ حال ہے اور اس سے پہلے قد مضمر ہے یا تعلیل کیلئے مستقل کلام ہے۔ گویا اس طرح کہا گیا ہے کہ پوچھا گیا اس نے سجدہ کیوں نہیں کیا؟ تو بتایا گیا کہ اس کی وجہ اس کا جنوں میں سے ہونا ہے۔ اس نے اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کی۔ یہ دلیل ہے کہ ابلیس کو بھی فرشتوں کے ساتھ سجدہ کا حکم تھا۔ فاء سببیہ ہے، اس میں دلیل ہے کہ ملائکہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں کرتے، ابلیس نے نافرمانی کی تھی کیونکہ وہ اصل میں جن تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا ملائکہ کا ایک گروہ ہے جنہیں جن کہا جاتا ہے اور ان کی تخلیق نار السموم سے ہوتی ہے، اس معنی ومفہوم کے اعتبار سے مستثنیٰ متصل ہوگا (1) حضرت حسن فرماتے ہیں وہ جنوں میں سے تھا، ملائکہ میں سے نہیں تھا اور یہ جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم انسانوں کی اصل ہیں، اس صورت میں مستثنیٰ منقطع ہوگا۔ اس کے متعلق تفصیلی بحث سورۂ بقرہ میں گذر چکی ہے۔ حضرت حسن کا یہ کہنا کہ ابلیس جنوں کی اصل ہے جس طرح آدم انسانوں کی اصل ہیں بہت بعید ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۔ یہ آیت کریمہ سورۂ رحمٰن اور سورۂ جن کی آیات اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ جنوں میں سے کچھ مومن نیکوکار ہیں اور کچھ اور ہیں جو جہنم کا ایندھن ہیں۔ ابلیس اور اس کی اولاد سب اللہ اور اللہ کے دوستوں کے دشمن ہیں جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے افتتخذونه الایه یہ ان کی دشمنی کے ظاہر ہونے کے باوجود ان کو دوست بنانے پر استفہام انکاری ہے، یعنی وہ تمہارا دشمن ہے پھر بھی تم میری اطاعت کے بجائے تم اس (پلید) کی اطاعت و پیروی کرتے ہو۔ یہ ظالموں کیلئے برا بدلہ ہے کہ انہوں نے ابلیس اور اس کی ذریت کو اللہ کا بدل بنایا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں مجاہد نے امام شعبی سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن میں بیٹھا تھا کہ ایک مزدور آدمی آیا اور اس نے پوچھا، کیا ابلیس کی بیوی ہے؟ میں نے پہلے کچھ اور سوچا پھر غور کیا تو مجھے اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد یاد آیا افتتخذ ونه وذریته اولیاء. مجھے معلوم ہوگیا کہ اولاد بغیر بیوی کے نہیں ہوسکتی ہے۔ اس لئے میں نے کہا ہاں اس کی بیوی ہے۔ امام شعبی کا یہ قول کہ بیوی کے بغیر اولاد نہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 575 (الفکر)

ہوسکتی، یہ اس ارشاد سے مستفاد ہے اَنّٰی یَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (اس کا بیٹا کیسے ہوسکتا ہے، جبکہ اس کی بیوی ہی نہیں ہے) قتادہ فرماتے ہیں شیطانوں کی بھی اسی طرح اولاد ہوتی ہے جس طرح انسانوں کی اولاد ہوتی ہے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ شیطان اپنی دبر میں اپنی دم داخل کرتا ہے پھر وہ انڈا دیتا ہے پھر وہ انڈا پھٹتا ہے تو شیطانوں کی ایک جماعت پیدا ہو جاتی ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں شیطان کی اولاد سے لاقیس اور ولہان ہے۔ (ولہان نماز اور وضو میں وسوسہ اندازی کرتا ہے)۔ الھفاف، مرۃ (مرۃ کی وجہ سے شیطان کی کنیت ابو مرہ ہے) زلنبور (یہ بازاروں میں گھومتا ہے لغو باتوں کو مزین کرتا ہے جھوٹی قسمیں اٹھواتا ہے اور سامان کی تعریف کرواتا ہے) الاعور۔ یہ انسان کو زنا پر برانگیختہ کرتا ہے، مرد کے ذکر اور عورت کی شرمگاہ میں پھونک مارتا ہے۔ مطوس (یہ لوگوں کے مونہوں میں ایسی باتیں ڈالتا ہے جن کی کوئی اصل نہیں ہوتی۔ یعنی جھوٹی افواہیں پھیلاتا ہے) بتر (یہ مصیبت کے وقت چہرہ نوچنے، سینہ پیٹنے اور گریبان چاک کرنے کا عمل کراتا ہے) داسم یہ اس شخص کے ساتھ گھر میں داخل ہوتا ہے جو سلام نہیں کرتا اور اللہ کا ذکر نہیں کرتا، یہ شیطان اسے دکھاتا ہے کہ سامان نہیں اٹھایا گیا یا سامان کو حسن ترتیب سے نہیں رکھا گیا پھر جب وہ آدمی کھانا کھاتا ہے اور اس پر اللہ کا ذکر نہیں کرتا تو وہ شیطان اس کے ساتھ کھانا کھاتا ہے۔ اعمش فرماتے ہیں ایک دفعہ میں گھر میں داخل ہوا اور میں نے اللہ کا ذکر نہ کیا اور نہ میں نے گھر والوں پر سلام کیا تو مجھے لوٹا دکھائی دیا میں نے گھر والوں سے کہا اسے اٹھاؤ اور میں ان سے جھگڑنے لگا۔ پھر مجھے یاد آیا تو میں نے کہا داسم داسم۔ (یعنی داسم نے مجھے دھوکا میں ڈال دیا) ابی بن کعب حضور ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا وضو کیلئے ایک شیطان ہے جسے ولہان کہا جاتا ہے، پس پانی کے وسوسہ سے بچو (1) اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث غریب ہے، اہل حدیث کے نزدیک اس کی سند قوی نہیں ہے کیونکہ اس کا راوی خارجہ بن مصعب ہے۔

حضرت ابوسعید الخدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ عثمان بن العاص نبی کریم ﷺ کے پاس آئے اور عرض کی یا رسول اللہ شیطان میرے اور میرے نماز اور میرے قرآن کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور مجھ پر نماز کو خلط ملط کر دیتا ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ شیطان ہے جس کا نام حزب ہے، جب تم اس کے وسوسہ کو محسوس کرو تو اللہ سے اس کی پناہ مانگا کرو اور تین مرتبہ بائیں طرف تھوک دیا کرو، عثمان بن ابی العاص فرماتے ہیں میں نے ایسا کیا تو اللہ تعالیٰ نے اس شیطان کو مجھ سے دور کر دیا۔ اس حدیث کو مسلم نے روایت ہے۔ حضرت جابر سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ابلیس اپنا عرش پانی پر لگاتا ہے۔ پھر اپنے لشکر زمین میں بھیجتا ہے اور اس کا سب سے قریبی وہ ہوتا ہے جو بڑا فتنہ برپا کرتا ہے۔ ایک شیطان چیلہ آتا ہے، کہتا ہے میں نے فلاں کام کیا ہے، شیطان کہتا ہے تو نے کوئی اعلیٰ کام نہیں کیا پھر دوسرا چیلہ آتا ہے اور کہتا ہے میں نے میاں بیوی کے درمیان جدائی ڈال دی ہے۔ شیطان اسے اس کے کام کی وجہ سے اپنا قریبی بنالیتا ہے اور کہتا ہے ہاں تو نے عظیم کام کیا ہے۔ اعمش کہتے ہیں میرا خیال ہے راوی نے فرمایا اور وہ اس کو اپنے ہاتھ چمٹا لیتا ہے۔ اس کو مسلم نے نقل کیا ہے۔

مَاۤ اَشْهَدْتُّهُمْ خَلْقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ وَ لَا خَلْقَ اَنْفُسِهِمْ ۪ وَ مَا كُنْتُ مُتَّخِذَ الْمُضِلِّیْنَ عَضُدًا ﴿۵۱﴾

"میں نے ان سے مدد نہیں لی تھی جب آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور نہ (اس وقت ان سے مدد لی) جب خود انہیں پیدا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 575 (الفکر)

کیا اور میں نہیں بنایا کرتا گمراہ کرنے والوں کو اپنا دست و بازو ۱؎ ''

۱؎ ابو جعفر نے جمع متکلم کا صیغہ نون اور الف کے ساتھ مَا اَشْهَدْنَا هُمْ پڑھا ہے اور جمع کا صیغہ تعظیم کیلئے ہوتا ہے، یعنی ہم نے ان اشیاء کی تخلیق میں ان شیطانوں سے کچھ مدد نہیں لی تا کہ یہ عبادت و طاعت کے مستحق قرار پائیں۔ کیونکہ عبادت کا استحقاق خالقیت (پیدا کرنے) کے توابع اور لوازم میں سے ہے۔ جو پیدا کرنے میں شریک ہوگا وہ عبادت میں بھی شریک ہوگا۔ جب اللہ تعالیٰ نے اشارۃً ان سے مدد لینے کی نفی فرمائی تو اب صراحۃً نفی فرما دی اور فرمایا میں گمراہ لوگوں کو کائنات کی تخلیق میں مددگار و انصار بنانے والا نہیں ہوں۔ ضمیر کی جگہ صراحۃً المضلین کا اسم ذکر فرمایا اس کی وجہ ان کی مذمت کرنا اور ان سے امداد لینے کو بہت بعید سمجھنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں مااشهدتهم میں هم ضمیر کا مرجع مشرکین ہیں، اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ان مشرکوں کو اشیاء کی تخلیق کے وقت نہیں بلایا تھا اور نہ میں نے ان کو ایسے علوم کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن کو کوئی دوسرا نہیں جانتا حتیٰ کہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ اگر ہم ایمان لائے تو سب لوگ ایمان لائیں گے۔ اے حبیب آپ نصرت دین کیلئے ان کی باتوں کی طرف توجہ نہ فرمائیں۔ میری یہ شان کے لائق ہی نہیں ہے کہ میں اپنے دین کیلئے گمراہوں سے مدد حاصل کروں اس توجیہ کی تائید ما کنت کی قرأت کرتی ہے۔ کہ یہ خطاب کا صیغہ ہے اور خطاب حضور ﷺ کیلئے ہے۔ کلبی کہتے ہیں اشهدتهم میں هم ضمیر کا مرجع ملائکہ ہیں۔ یعنی کائنات ارضی و سماوی کی تخلیق کے وقت فرشتوں کو میں نے نہیں حاضر کیا تھا تا کہ وہ عبادت کے مستحق ہوں اور انہیں اللہ کی بیٹیاں کہا جائے۔ اس توجیہ پر یہ وما کنت متخذ المضلین مستقل کلام ہوگی۔ ضمیر کی جگہ اسم ظاہر رکھنے والی صورت نہ ہوگی۔ یعنی میں نے نہ تو فرشتوں سے مدد لی ہے، نہ شیطانوں سے کہ یہ عبادت کے مستحق نہیں۔

وَيَوْمَ يَقُولُ نَادُوا شُرَكَاءِيَ الَّذِينَ زَعَمْتُمْ فَدَعَوْهُمْ فَلَمْ يَسْتَجِيبُوا لَهُمْ وَجَعَلْنَا بَيْنَهُمْ مَّوْبِقًا ﴿٥٢﴾

'' اور اس روز اللہ تعالیٰ (کفار کو) فرمائے گا بلاؤ میرے شریکوں کو جنہیں تم (میرا شریک) خیال کیا کرتے تھے ۱؎ تو وہ انہیں پکاریں گے پس وہ انہیں کوئی جواب نہیں دیں گے اور ہم حائل کر دیں گے ان کے درمیان ایک آڑ ۲؎ ''

۱؎ یقول کو حمزہ نے نون کے ساتھ متکلم کا صیغہ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ کافروں سے فرمائے گا کہ بلاؤ میرے شریکوں کو جن کو تم میرا شریک یا اپنے شفیع خیال کرتے تھے تا کہ وہ تمہیں میرے عذاب سے بچائیں۔ شرکاءی کی یاء متکلم کی طرف اضافت ان کے عقیدہ اور گمان کے مطابق ہے اور انہیں زجر و توبیخ کرنے کیلئے ہے بعض علماء فرماتے ہیں شرکاءی سے مراد ابلیس اور اس کی ذریت ہے۔

۲؎ وہ بتوں کے پجاری اپنے بتوں کو فریاد کریں گے لیکن وہ انہیں کوئی جواب نہ دیں گے اور اس دن ہم کفار اور ان کے بتوں کے درمیان آڑ بنا دیں گے موبقا اسم ظرف ہے جس کا معنی ہلاکت کی جگہ ہے اوبق کا معنی ہلاک کرنا ہے، عطاء اور ضحاک نے اس کا معنی ہلاکت کی جگہ کیا ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں یہ جہنم کی ایک وادی کا نام ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یہ جہیم کی وادی ہے۔ عکرمہ کہتے ہیں یہ آگ کی ایک نہر ہے جس میں آگ بہتی ہے اور اس کے کناروں پر کالے گدھوں کی طرح بڑے بڑے سانپ ہیں۔ ابن الاعرابی

فرماتے ہیں ہر دو چیزوں کے درمیان جو آڑ اور رکاوٹ ہوتی ہے اسے موبق کہتے ہیں(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے۔ الفراء کہتا ہے البین کا معنی تعلق ہے معنی یہ ہے کہ ہم قیامت کے روز دنیا کے تعلقات کو ہلاک کر دیں گے، اس کی مثل قرآن میں ہے لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَیْنَكُمْ (ان کے تعلقات کٹ جائیں گے) اس قرأت پر جنہوں نے بین کو مرفوع پڑھا ہے۔

وَرَاَ الْمُجْرِمُوْنَ النَّارَ فَظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ مُّوَاقِعُوْهَا وَلَمْ يَجِدُوْا عَنْهَا مَصْرِفًا ﴿۵۳﴾

''اور دیکھیں گے مجرم (جہنم کی) آگ کو اور وہ خیال کریں گے کہ وہ اس میں گرنے والے ہیں اور نہ پائیں گے اس سے نجات پانے کی کوئی جگہ [1]''

[1] مجرمون سے مراد مشرکین ہیں، یعنی مشرکین دوزخ کی آگ کو دیکھیں گے تو انہیں یوں محسوس ہوگا کہ ابھی اس میں گرنے والے ہیں۔ امام احمد نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے وظنوا انهم مواقعوها کے ارشاد کے متعلق فرمایا کہ کافر کو پچاس ہزار سال کھڑا کیا جائے گا جیسا کہ اس نے دنیا میں کوئی عمل نہیں کیا۔ کافر جہنم کو دیکھے گا تو چالیس سال کی مسافت سے بھی یوں محسوس کرے گا کہ وہ اس میں ابھی گرا(2)۔ مصرفاً یا تو مصدر ہے یا اسم ظرف ہے۔

وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ ۭ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾

''اور بیشک ہم نے طرح طرح سے بار بار بیان کی ہیں اس قرآن میں لوگوں کیلئے ہر قسم کی مثالیں [1] اور انسان ہر چیز سے بڑھ کر جھگڑالو ہے [2]''

[1] یعنی ہم نے اس قرآن میں بار بار اور نئے نئے اسلوب میں ایسی عبارتیں پیش کی ہیں جن میں ہر عبارت غرابت میں ضرب المثل کی مانند ہے اور انداز اس لیے اختیار فرمایا تاکہ لوگ نصیحت حاصل کریں بعض علماء فرماتے ہیں من کل مثل محذوف کی صفت ہے جو صرفنا کا مفعول ہے، یعنی مثالاً من جنس کل مثل یعنی ہم نے ہر قسم کی مثالیں بیان کیں تاکہ نصیحت حاصل کریں۔

[2] ابن عباس فرماتے ہیں انسان سے مراد نضر بن الحارث ہے اور اس کا جھگڑا قرآن کے متعلق تھا۔ کلبی کہتے ہیں انسان سے مراد ابی بن خلف الجهمی ہے۔ بعض کہتے مطلق کفار مراد ہیں جیسا کہ ارشاد ہے وَيُجَادِلُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ اور جھگڑتے ہیں کافر بے سرو پا دلیلوں کے بعض علماء فرماتے ہیں یہ عموم پر ہے، اس میں مسلمان اور کافر کوئی تخصیص نہیں ہے۔ امام بخاری نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ رات کو میرے اور فاطمہ رضی اللہ عنہا کے گھر تشریف لائے اور فرمایا کیا تم نماز تہجد نہیں پڑھتے ہو۔ حضرت علی فرماتے ہیں میں نے عرض کی ہماری روحیں اللہ کے ہاتھ میں ہیں اگر وہ ہمیں اٹھانا چاہتا ہے تو ہم اٹھ پڑتے ہیں۔ جب میں نے یہ جواب دیا تو آپ ﷺ کوئی جواب دیے بغیر واپس تشریف لے گئے پھر میں نے سنا کہ آپ واپس پلٹتے ہوئے اپنی ران پر ہاتھ مار کر یہ کہہ رہے تھے وکان الانسان اکثر شی جدلا(3)۔

جدلاً نسبت سے تمیز ہونے کی وجہ سے منصوب ہے، معنی یہ ہے کہ انسان کا جھگڑا سب چیزوں سے زیادہ ہے۔

وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَاۗءَهُمُ الْهُدٰى وَيَسْتَغْفِرُوْا رَبَّهُمْ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ اَوْ يَاْتِيَهُمُ الْعَذَابُ قُبُلًا ﴿۵۵﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 577 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 415 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

"اور کس چیز نے روکا ہے لوگوں کو اس بات سے کہ وہ ایمان لے آئیں جب آگئی ان کے پاس ہدایت (کی روشنی) اور مغفرت طلب کریں اپنے رب سے مگر یہ (کہ وہ منتظر ہیں) کہ آئے ان کے پاس اگلوں کا دستور ۲؎ یا آئے ان کے پاس طرح طرح کا عذاب ۲؎"

۱؎ الھدیٰ سے مراد، قران، اسلام اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح احکام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں ھدی سے مراد نبی کریم ﷺ کی ذات اقدس واطہر ہے، یعنی حق کے واضح ہونے بعد ایمان لانے اور اپنے رب کی بارگاہ میں کفر اور گناہوں کی معافی مانگنے سے کونسی چیز انہیں روکے ہوئے ہے۔ کیا یہ یہی چاہتے ہیں کہ پہلے لوگوں پر جس طرح ہمارا عذاب آیا اور ان کا نام ونشان مٹا دیا۔ ان پر بھی ایسا عذاب آئے اور انہیں تہس نہس کردے، ان تاتیھم سے پہلے مضاف محذوف ہے، مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے، تقدیر عبادت اس طرح ہے اِلَّاتَقْدِیْرَ اَنْ تَاْتِیَھُمْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ۔ بعض علماء نے یہ تقدیر ذکر کی ہے اِلَّاطَلَبَ اَنْ تَاْتِیَھُمْ سُنَّۃُ الْاَوَّلِیْنَ مِنْ مَعَایَنَۃِ الْعَذَابِ وَانْتِظَارِھِمْ ذَالِکَ۔ یعنی وہ پہلے لوگوں کے طریقہ پر عذاب کو دیکھنا چاہتے ہیں ان کی طرح عذاب کے منتظر ہیں کیونکہ انہوں نے بھی دعا مانگی تھی اللّٰھُمَّ اِنْ کَانَ ھٰذَا ھُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَیْنَا حِجَارَۃً مِّنَ السَّمَآءِ۔

۲؎ ابن عباس نے قبلاً کا معنی عیاناً کیا ہے، یعنی آمنے سامنے، روبرو، مجاہد نے اس کا معنی اچانک کیا ہے(1) اہل کوفہ، ابوجعفر نے قبلاً کو قاف اور باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے، باقی قراء نے قاف کے کسرہ اور باء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہم معنی ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں قبلاً جمع قبیلہ کی اور اس کا معنی مختلف قسم کا عذاب ہے اور اس پر نصب ضمیر سے یا العذاب سے حال ہونے کے اعتبار سے ہے۔

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ ۚ وَیُجَادِلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ وَاتَّخَذُوْۤا اٰیٰتِیْ وَمَاۤ اُنْذِرُوْا هُزُوًا ﴿۵۶﴾

"اور ہم نہیں بھیجتے رسولوں کو مگر مژدہ سنانے والے اور ڈرانے والے ۱؎ اور جھگڑتے ہیں کافر بے سروپا دلیلوں کی آڑ لے کر ۲؎ تا کہ وہ مٹا دیں اس سے حق کو ۳؎ اور بنالیا ہے انہوں نے میری آیتوں کو اور جن سے وہ ڈرائے گئے ایک مذاق ۴؎"

۱؎ ہمارے رسولوں کی آمد کا مدعا مؤمنین کو ثواب اور جنت کی بشارت دینا اور کافروں کو عذاب اور جہنم سے ڈرانا ہے، یعنی ہم نے انہیں یہ قدرت دے کر نہیں بھیجا کہ یہ کفار کی تجویز کردہ آیات لے آئیں یا ساری مخلوق کو شاہراہ ہدایت پر گامزن کریں اور ان کو ہدایت دینے پر غالب ہوں۔

۲؎ کافر بے سروپا، لایعنی باتوں کے ساتھ جھگڑتے ہیں، کہتے ہیں کیا اللہ نے بشر کو رسول بنا کر بھیجا ہے؟ کبھی کہتے ہیں مَاۤ اَنْتُمْ اِلَّا بَشَرٌ مِّثْلُنَا (تم ہماری طرح بشر ہو) کبھی کہتے ہیں وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَنْزَلَ مَلٰٓىِٕكَةً (اگر اللہ چاہتا تو فرشتوں کو نازل فرماتا کبھی کہتے ہیں) لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ (کیوں نہ قرآن کو ان دو شہروں میں سے کسی عظیم آدمی پر اتارا گیا۔) کبھی کہتے ہیں کیا تم جو ذبح کرو وہ حلال ہے، جسے اللہ تعالیٰ مار دے وہ حرام ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 578 (الفکر)

ل دحض کا اصل معنی پھسلنا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ان غیر معقول باتوں سے ان کا مقصود یہ ہے کہ حق کو اپنی جگہ سے پھسلا دیں۔

۲ انہوں نے قرآن اور جس عذاب سے انہیں ڈرایا گیا ہے اس کا مذاق اڑایا ہے۔ ما انذروا سے پہلے ما مصدریہ یا ما موصولہ ہے۔ وہ مشرک کہتے ہیں لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس قرآن کی مثل کہہ لیں۔ يُعَلِّمُهٗ بَشَرٌ (یہ قرآن انہیں کوئی بشر سکھاتا ہے) اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ (یہ قرآن تو پہلے لوگوں کے قصے ہیں) عذاب کا مذاق اس طرح اڑاتے ہیں کہ کہتے ہیں لَوْلَا يُعَذِّبُنَا اللّٰهُ بِمَا نَقُوْلُ (ہم جو کہتے ہیں اس کی وجہ سے اللہ ہمیں عذاب کیوں نہیں دیتا۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ ذُكِّرَ بِاٰيٰتِ رَبِّهٖ فَاَعْرَضَ عَنْهَا وَنَسِيَ مَا قَدَّمَتْ يَدٰهُ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا ؕ وَاِنْ تَدْعُهُمْ اِلَى الْهُدٰى فَلَنْ يَّهْتَدُوْٓا اِذًا اَبَدًا ﴿۵۷﴾

''اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے جسے نصیحت کی گئی اس کے رب کی آیتوں سے پس اس نے روگردانی کر لی ان سے اور فراموش کر دیا اس نے ان (اعمال بدکو) جو آگے بھیجے تھے اس کے دونوں ہاتھوں نے ۱۔ ہم نے ڈال دیے ان کے دلوں پر پردے تا کہ وہ قرآن کو نہ سمجھ سکیں اور ان کے کانوں میں گرانی پیدا کر دی اور اگر تم بلاؤ انہیں ہدایت کی طرف تو جب بھی وہ ہدایت قبول نہیں کریں گے ۲۔''

ل یعنی اس سے بڑھ کر کون ظالم ہوگا جس کو اس قرآن سے نصیحت کی گئی جس کے الفاظ اور معانی سراپا اعجاز ہیں، اس نے نصیحت قبول کرنے کے بجائے اس میں غور و فکر کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور اپنے اعمال خبیثہ، کفر، عقائد باطلہ کو فراموش کر دیا اور ان کے انجام کی طرف مڑ کر نہ دیکھا۔ اس اعراض اور فراموشی کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے ان کے دل پر پردے ڈال دیئے ہیں اور ان کے دل کفر کی تیرگیوں اور تاریکیوں سے ڈھک دیئے گئے ہیں تا کہ انجام کار قرآن حکیم کو سمجھنے کی نعمت حاصل نہ کریں۔ ان یفقھوہ سے پہلے لام مقدر ہے جو عاقبت کیلئے ہے۔ ان یفقھوہ میں ہ ضمیر مذکر اور مفرد ذکر کی ہے حالانکہ اس کا مرجع آیات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ضمیر کو معنی کے اعتبار سے ذکر کیا گیا ہے اور آیات سے مراد قرآن ہی ہے۔ اور ہم نے ان کے کانوں میں گرانی ڈال دی ہے، ہم نے انہیں آیات قرآنیہ کو سننے کی صلاحیت ہی عطا نہیں فرمائی۔ علی آذانهم کا عطف علی قلوبهم پر ہے، یعنی جَعَلْنَا عَلٰى اٰذَانِهِمْ وَقْرًا۔

۲ اے میرے حبیب اگر آپ ان کو کتنی پر خلوص دعوت توحید دیں پھر بھی یہ ہدایت نہ پائیں گے کیونکہ ان کے دلوں پر پردے پڑے ہیں اور کانوں میں گرانی ہے۔ ان میں ہدایت کی استعداد ہی نہیں ہے ان کے پاس ہدایت حاصل کرنے والے سب ذرائع مفقود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ نے اس قوم کے ساتھ معاملہ کیا جن کے متعلق اللہ تعالیٰ کے علم ازلی میں تھا کہ وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔

وَرَبُّكَ الْغَفُوْرُ ذُو الرَّحْمَةِ ؕ لَوْ يُؤَاخِذُهُمْ بِمَا كَسَبُوْا لَعَجَّلَ لَهُمُ الْعَذَابَ ؕ بَلْ لَّهُمْ مَّوْعِدٌ لَّنْ يَّجِدُوْا مِنْ دُوْنِهٖ مَوْئِلًا ﴿۵۸﴾

''اور آپ کا پروردگار تو بہت بخشنے والا بڑا ہی رحمت والا ہے۔ اگر وہ پکڑ لیتا انہیں ان کے کئے پر تو جلد ان پر عذاب بھیجتا

(وہ ایسا نہیں کرتا) بلکہ ان کو سزا دینے کا ایک وقت مقرر ہے۔ نہیں پائیں گے اس وقت اس کے بغیر کوئی پناہ کی جگہ۔[1]"

[1] اے پیارے! اے روح کائنات' تیری رب کی بخشش و مغفرت بہت وسیع ہے، وہ صفت رحمت سے موصوف ہے۔ اور اس کی مغفرت و رحمت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس نے قریش مکہ کو فوراً عذاب کی چکی میں پیس نہیں دیا حالانکہ انہوں نے اس کے نبی مکرم ﷺ سے دشمنی اور عداوت کی حد کر دی ہے' اس نے ان کے لئے بھی عذاب دینے کا وقت مقرر فرمایا ہے۔ موعد سے مراد قیامت کا دن ہے یا جنگ بدر کا دن ہے۔ جب وہ وقت مقرر آ جائے گا تو یہ میرے نبی ﷺ کے گستاخ کوئی پناہ گاہ نہیں پائیں گے۔ آل کا معنی نجات پانا ہے اور آل الیہ کا معنی کسی کے پاس نجات حاصل کرنا ہے۔

وَتِلْكَ الْقُرٰٓى اَهْلَكْنٰهُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا وَجَعَلْنَا لِمَهْلِكِهِمْ مَّوْعِدًا ﴿٥٩﴾

"اور یہ بستیاں ہیں ہم نے تباہ کر دیا ان کے باشندوں کو جب وہ ستم شعار بن گئے[1] اور ہم نے مقرر کر دی تھی ان کی ہلاکت کیلئے ایک میعاد[2]"

[1] ان بستیوں سے مراد قوم نوح' عاد اور ثمود کی بستیاں ہیں اور ان لوگوں کی بستیاں ہیں جو ان کی صفت سے موصوف تھے۔ **تلک القری** مبتدا ہے اور **اھلکنا ھم** خبر ہے۔ یا **تلک القری** فعل مضمر کا مفعول ہے جس کی تعبیر مابعد فعل کر رہا ہے۔ موصوف یا صفت سے پہلے مضاف کا مقدر ماننا ضروری ہے۔ تا کہ ضمیر کا مرجع صحیح ہو جائے۔ یعنی اصحاب **تلک القری** ہوگا یا **تلک اصحاب القری** ہے۔ یعنی ہم نے ان بستیوں کے باشندوں کو ہلاک کر دیا جنہوں نے قریش مکہ کی طرح کفر اور گناہ کر کے اپنے اوپر ظلم کیا تھا۔

[2] ابو بکر نے یہاں اور سورۂ نمل میں میم اور لام کے فتحہ کے ساتھ **مھلکھم** پڑھا ہے اور حفص نے میم کے فتحہ اور لام کے کسرہ کے ساتھ شاذ مصادر کے وزن پر پڑھا ہے۔ جیسے مرجع' المحیض' اور باقی قراء نے میم کے ضمہ اور لام کے فتحہ کے ساتھ **اھلکہ** سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔ **موعداً** سے مراد وقت معلوم ہے۔ یعنی جس طرح پہلی ظالم قوموں کی ہلاکت کا وقت مقرر تھا اور وہ اس وقت سے لمحہ بھر مقدم و مؤخر نہ ہوئے تو یہ کفار مکہ بھی اپنے مقررہ وقت سے ایک سیکنڈ بھی آگے پیچھے نہ ہوں گے۔

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِفَتٰىهُ لَآ اَبْرَحُ حَتّٰٓى اَبْلُغَ مَجْمَعَ الْبَحْرَيْنِ اَوْ اَمْضِيَ حُقُبًا ﴿٦٠﴾

"اور یاد کرو جب کہا موسیٰ نے اپنے نوجوان (ساتھی) کو کہ میں چلتا رہوں گا یہاں تک کہ پہنچوں جہاں دو دریا ملتے ہیں[1] یا (چلتے چلتے) گزار دوں گا مدت دراز۔[2]"

[1] آیت میں جس موسیٰ کا ذکر ہو رہا ہے وہ موسیٰ بن عمران ہیں جیسا کہ صحیح حدیث دلالت کرتی ہے اور نوجوان سے مراد یوشع بن نون بن افراثیم بن یوسف علیہ السلام ہیں۔ میں (مفسر) کہتا ہوں شاید نون جو یوشع کے باپ ذکر کئے گئے ہیں وہ آل افراثیم سے ہوں کیونکہ یوشع اور نون کے درمیان بہت زیادہ زمانہ ہوا ہے، یعنی باپ نہیں ہیں، آل افراثیم کی نسل سے ہیں۔ **لا ابرح** کا معنی ہے کہ میں متواتر چلتا رہوں گا۔ خبر کو حذف کیا گیا ہے کیونکہ ہر حالت خبر پر دلالت کر رہی ہے اور وہ سفر ہے اور **حتی ابلغ** کا قول بھی خبر پر دلالت کر رہا ہے۔ کیونکہ **حتی ابلغ مجمع البحرین** یہ غایت ہے جو کسی چیز کی غایت ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ پس وہی لا ابرح کی خبر ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ اس کی اصل **لایبرح مسیری حتی ابلغ ھو** ۔ اس صورت میں اسم محذوف ہے اور مضاف الیہ کو اس کی جگہ رکھا گیا ہے (یعنی میسر کو حذف کر کے یاء ضمیر کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے) پھر ضمیر اور فعل بدل گئے ہیں، یعنی یاء ضمیر مرفوع مستر ضمیر میں

بدل گئی (جبکہ پہلے مجرور اور بارز تھی) اور فعل غائب کے صیغہ **لا ابرح** سے متکلم کے صیغہ **لا ابرح** میں بدل گیا ہو۔ اور حتی ابلغ خبر ہو۔ یہ بھی ہوسکتا ہے **لا ابرح** تامہ ہو یعنی ہمیشہ اس حالت پر چلتا رہوں گا اور تلاش کرتا رہوں گا اور کبھی جدا نہ ہوں گا۔ جب تامہ ہوگا تو اسے خبر کی ضرورت ہی نہ ہوگی۔ **مجمع البحرین:** مشرق کی جانب سے فارس اور روم کے سمندروں کے ملنے کی جگہ مراد ہے قتادہ نے اس کا یہی مفہوم بیان کیا ہے۔ محمد بن کعب فرماتے ہیں اس سے مراد طنجہ کا شہر ہے اور ابی بن کعب کے نزدیک افریقہ مراد ہے۔

ﷺ قاموس میں **الحقبة بالضمتين ثمانون سنة او اكثر والدهر و السنة و السنون۔** یعنی حقبہ حا اور قاف کے ضمہ کے ساتھ ہو تو اس سے مراد اسی سال یا اس سے زیادہ مدت ہوتی ہے اور زمانہ سال کئی سال کے معانی میں استعمال ہوتا ہے۔

ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ **الحقب** الدھر یعنی حقب سے مراد زمانہ ہے۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا الحقب سے مراد اسی (80) سال ہیں بعض نے فرمایا ستر (70) سال ہیں۔ ابن ابی شیبہ ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اس قول کو نقل کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں چلتا رہوں گا حتی کہ دونوں امروں میں سے ایک امر واقع ہو جائے یا تو میں **مجمع البحرین** تک پہنچ جاؤں گا یا چلتے چلتے زمانہ گزار دوں گا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ او بمعنی الا ہو اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ میں چلتا رہوں گا حتی کہ میں **مجمع البحرین** کو پالوں گا یا میں اتنا زمانہ گزار دوں گا کہ مجھے یقین ہو جائے گا کہ وہ مجمع مجھے نہیں مل سکتا۔

امام بخاری اور مسلم نے سعید بن جبیر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے ابن عباس سے کہا کہ نوف البکالی کہتا ہے کہ خضر علیہ السلام کے ساتھی موسیٰ سے مراد موسیٰ بنی اسرائیل نہیں ہے ابن عباس نے فرمایا اللہ کے دشمن نے جھوٹ بکا ہے ہمیں ابی بن کعب نے بتایا کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ایک دن موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو خطبہ دینے کیلئے کھڑے ہوئے تو آپ سے دریافت کیا گیا کہ تمام لوگوں سے زیادہ علم والا کون ہے؟ آپ نے جواب دیا میں سب سے بڑا عالم ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عتاب فرمایا کیونکہ آپ نے اللہ تعالیٰ کی طرف علم کو منسوب نہیں کیا چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ پر وحی بھیجی کہ **مجمع البحرین** میں میرا ایک بندہ ہے جو تجھ سے زیادہ عالم ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی یارب میں اس تک کیسے پہنچ سکتا ہوں اللہ تعالیٰ نے فرمایا اپنے ساتھ ایک مچھلی ٹوکری میں رکھ لو، جہاں وہ مچھلی تم سے گم ہو جائے وہی میرے بندے کی قیام گاہ ہے۔ موسیٰ علیہ السلام حکم الٰہی کے مطابق مچھلی ٹوکری میں لیکر چل پڑے اور آپ کے ساتھ نوجوان یوشع بن نون بھی چل پڑا۔ چلتے چلتے دونوں ایک چٹان تک پہنچے، اس پر دونوں سر رکھ کر سو گئے۔ مچھلی نے ٹوکری میں حرکت کی اور اس سے باہر نکلی پھر سمندر میں گر گئی اور درمیان میں سرنگ کی طرح راستہ بنا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کا چلنا روک لیا اور وہ اس پر محراب کی طرح ہو گیا۔ جب دونوں بیدار ہوئے تو یوشع جو سب کچھ مچھلی کا نکلنا اپنے آنکھوں سے دیکھ چکے تھے موسیٰ علیہ السلام کو اس کی خبر دینا بھول گئے۔ دن کا بقیہ حصہ بھی وہ چلتے رہے اور رات کو بھی سفر جاری رکھا حتی کہ جب دوسرا دن آیا تو موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا صبح کا کھانا لاؤ، ہمیں اس سفر میں بہت بڑی مشقت برداشت کرنی پڑی ہے۔ فرمایا موسیٰ علیہ السلام کو تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی حتی کہ وہ اس جگہ سے آگے گذر گئے جہاں پہنچنے کا اللہ نے حکم دیا تھا۔ یوشع نے کہا اے موسیٰ کلیم آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم ستانے کیلئے اس کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں۔ اس نے سمندر میں اپنا راستہ بنا لیا تھا، بڑی تعجب کی بات ہے۔ فرمایا مچھلی نوجوان کیلئے سرنگ کی صورت میں تھی اور موسیٰ کیلئے تعجب کی بات تھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا وہی تو جگہ تھی جس کی ہم تلاش میں تھے، وہ ہماری منزل

مراد تھی۔ وہ دونوں اپنے قدموں کے نشانات پر واپس لوٹے۔ حتی کہ اسی چٹان تک پہنچ گئے۔ وہاں ایک شخص کپڑا لپیٹے سویا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے سلام کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں آپ کے پاس اس لئے حاضر ہوا ہوں کہ آپ مجھے رشد و ہدایت کے علم سے کچھ سکھا دیں جو آپ کو سکھایا گیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا اے موسیٰ کلیم تم میرے ساتھ صبر کی طاقت نہیں رکھ سکو گے۔ مجھے اللہ نے ایسا علم عطا فرمایا ہے جو تم نہیں جانتے اور آپ کو ایسا علم عطا فرمایا ہے جس کو میں نہیں جانتا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ مجھے ان شاء اللہ صابر پائیں گے اور میں تمہارے کسی امر کی نافرمانی نہیں کروں گا۔ حضرت خضر نے فرمایا اگر تم نے میرے ساتھ چلنا ہے تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہیں کرنا یہاں تک کہ میں خود تجھے اس کے متعلق بتاؤں۔ وہ دونوں ساحل سمندر کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ایک کشتی پاس سے گذری تو خضر علیہ السلام نے انہیں سوار کرنے کو کہا۔ انہوں نے حضرت خضر علیہ السلام کو پہچان لیا اور بغیر کرایہ کے سوار کر لیا۔ جب وہ دونوں سوار ہو گئے تو تھوڑی دیر بعد حضرت خضر ہتھوڑے کے ساتھ کشتی کا ایک پھٹہ اکھیڑنے لگے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا جناب انہوں نے ہمیں بغیر کرائے کے کشتی پر سوار کیا ہے اور آپ ان کی کشتی کا تختہ نکال رہے ہیں تاکہ سب غرق ہو جائیں، یہ آپ نے بڑا برا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ آپ میرے ساتھ صبر نہیں کر سکیں گے۔ موسیٰ کلیم نے عرض کی حضور میری بھول پر میرا مواخذہ نہ فرمائیں اور میرے اس معاملہ میں مجھ سے سختی نہ کرو (1)۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام سے پہلا سوال بھول کر ہوا تھا۔ دوسرا شرط کی بناء پر اور تیسرا جان بوجھ کر کیا تھا' فرمایا ایک چڑیا آئی اور کشتی کی ایک طرف بیٹھ گئی پھر اس نے دریا سے پانی کی چونچ بھری۔ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا میرا اور تیرا علم اللہ کے علم کے مقابلہ میں ایسے ہیں جیسے سمندر سے چڑیا نے پانی لیا ہے۔ پھر وہ ساحل پر چل پڑے۔ راستہ میں حضرت خضر علیہ السلام نے بچوں میں کھیلتے ہوئے ایک بچہ دیکھا تو خضر علیہ السلام نے اسکو پکڑا اور ہاتھ سے ہی اس کا سر تن سے جدا کر کے قتل کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام (تڑپ گئے) اور فرمایا بغیر کسی حق کے ایک معصوم نفس کو آپ نے قتل کر دیا، آپ نے بڑا نازیبا کام کیا ہے۔ حضرت خضر نے فرمایا میں نے تجھے کہا نہیں تھا کہ تم میرے ساتھ صبر نہیں کر سکو گے۔ فرمایا یہ پہلے سے زیادہ سخت کام کیا ہے۔ پھر کہا اگر میں آپ سے اس کے بعد کسی چیز کے متعلق سوال کروں تو مجھے آپ ساتھ نہ رکھیں اور آپ میری طرف سے معذور ہو گئے۔ پھر وہ چل پڑے حتی کہ جب انکا گذر ایک گاؤں سے ہوا' گاؤں والوں سے انہوں نے کھانا مانگا تو انہوں نے ان کی میزبانی کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی گاؤں میں دونوں نے ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو خضر علیہ السلام نے اپنے ہاتھ سے اسے درست کر دیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اے بھائی یہ ایسی قوم تھی جنہوں نے ہمیں کھانا کھلانے اور میزبانی کرنے سے انکار کر دیا۔ اگر آپ چاہتے تو کم از کم ان سے مزدوری ہی لے لیتے۔ حضرت خضر نے فرمایا بس سنگت ختم، اب میرے اور تیرے درمیان جدائی کا وقت آ گیا ہے۔۔۔۔۔ ذٰلِكَ تَاْوِيْلُ مَالَمْ تَسْطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا تک حضرت خضر علیہ السلام نے کلام فرمائی۔ راوی فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہماری خواہش ہے کہ موسیٰ کلیم صبر کرتے تاکہ ہم پر ان کے مزید واقعات بیان کئے جاتے (2)۔

ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے اپنی تفسیر میں ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تیرے بندوں میں سے محبوب ترین بندہ کونسا ہے۔ فرمایا جو مجھے یاد کرتا ہے اور کسی حالت میں مجھے نہیں بھولتا۔ پھر پوچھا کون سا بندہ عمدہ فیصلے

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 417 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 418

کرنے والا ہے؟ فرمایا جوحق کے ساتھ فیصلہ کرتا ہے اور خواہش نفس کی پیروی نہیں کرتا۔ پھر پوچھا زیادہ عالم کون ہے؟ فرمایا جو اپنے علم کے باوجود لوگوں سے علم حاصل کرتا ہے اس خواہش سے کہ ہوسکتا ہے کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو ہدایت کی طرف راہنمائی کرے اور ہلاکت سے لوٹا دے(1)۔ پھر موسیٰ کلیم علیہ السلام نے عرض کی اگر تیرے بندوں میں سے زیادہ علم والا کوئی موجود ہے تو میری اس کی طرف رہنمائی فرمایئے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا تجھ سے زیادہ علم والا خضر ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا میں اسے کہاں تلاش کروں؟ فرمایا چٹان کے قریب ساحل سمندر پر۔ عرض کی میں اس تک کیسے پہنچوں گا؟ فرمایا ایک مچھلی ٹوکری میں لے لو جہاں وہ گم ہو جائے وہی میرے خضر کا مقام ہے۔ موسیٰ کلیم نے اپنے نوجوان ساتھی سے کہا جب مچھلی گم ہو جائے تو مجھے بتانا۔

فَلَمَّا بَلَغَا مَجْمَعَ بَيْنِهِمَا نَسِيَا حُوتَهُمَا فَاتَّخَذَ سَبِيلَهُ فِي الْبَحْرِ سَرَبًا ﴿٦١﴾

"پھر جب وہ دونوں پہنچے جہاں آپس میں دو دریا ملتے ہیں دونوں بھول گئے اپنی مچھلی کو تو۔ بنالیا اس نے اپنا راستہ دریا میں سرنگ کی طرح۔ ۲"

ا۔ بَيْنِهِمَا ظرف ہے مجمع کی اس کی طرف اضافت یا تو وسعت کی بناء پر ہے یا بین بمعنی وصل ہے اس لئے اس کی طرف مجمع کو مضاف کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب وہ دونوں اس چٹان کے پاس پہنچے جو دو دریاؤں کے سنگھم کے پاس تھی، وہ بھونی ہوئی مچھلی پھڑکی اور زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی۔ قدرت کی یہ کرشمہ سازی اسلئے ہوئی تا کہ موسیٰ علیہ السلام یا خضر علیہ السلام کیلئے معجزہ بن جائے۔ صحیحین میں ہے کہ حضرت سفیان نے فرمایا لوگ یہ خیال کرتے ہیں اس چٹان کے پاس آب حیات ہے، اس کا پانی جس چیز کو لگتا ہے وہ زندہ ہو جاتی ہے۔ اور سمندر میں جا گرتی ہے۔ کلبی کہتے ہیں یوشع بن نون نے آب حیات سے وضو کیا تھا اور اس کا پانی اس نمکین مچھلی پر ٹوکری میں چھڑکا تھا۔ اس پانی کی وجہ سے وہ مچھلی زندہ ہو کر دریا میں کود پڑی تھی اور پانی میں دم مارتی ہوئی چلی گئی۔ جس پانی کے ساتھ اس کا جسم مس کرتا وہ خشک ہو جاتا اور وہ آگے چلی جاتی۔ موسیٰ علیہ السلام بیدار ہوئے تو اس مچھلی کا حال پوچھنا بھول گئے اور یوشع بتانا بھول گئے کہ مچھلی زندہ ہو کر سمندر میں چلی گئی ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں مچھلی یوشع کے پاس تھی اور وہی بھولے تھے لیکن بھولنے کی نسبت دونوں کی طرف اس لئے فرمائی کیونکہ وہ دونوں کا زاد سفر تھی جیسے عرب کہتے ہیں قوم فلاں جگہ گئی اور زاد راہ بھی ساتھ لے گئی حالانکہ زاد راہ ایک شخص کے پاس ہوتا ہے۔ لیکن اٹھانے اور ساتھ لے جانے کی نسبت تمام کی طرف کرتے ہیں(2)۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے مچھلی کیلئے سرنگ کی طرح راستہ بنا دیا تھا سرب کا معنی راستہ ہے، اس سے سارب بالنہار ہے (دن کے وقت راستہ پر چلنے والا) بعض علماء فرماتے ہیں سرب کا معنی طویل دراڑ ہے۔ صحیح حدیث کے حوالہ سے گذر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر پانی کے چلنے کو روک لیا تھا اور وہ پانی اس پر محراب کی شکل میں ہو گیا تھا۔ سربا پر نصب مفعول ثانی ہونے کی بناء پر ہے اور فی البحر یا تو سربا سے یا سبیله سے حال ہے اور اتخذ کے متعلق کرنا بھی جائز ہے۔

فَلَمَّا جَاوَزَا قَالَ لِفَتَاهُ آتِنَا غَدَاءَنَا لَقَدْ لَقِينَا مِنْ سَفَرِنَا هَٰذَا نَصَبًا ﴿٦٢﴾

"پس جب وہاں سے آگے بڑھ گئے آپ نے اپنے جوان ساتھی سے کہا لے آؤ ہمارا صبح کا کھانا بیشک ہمیں برداشت کرنی پڑی ہے اپنے اس سفر میں بڑی مشقت۔ ا"

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 423 (العلمیة) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 582 (الفکر)

1۔ موسیٰ علیہ السلام اور یوشع چلتے چلتے مجمع سے گذر گئے حتی کہ دوسرے دن صبح کے ناشتہ کا وقت ہوا، موسیٰ علیہ السلام نے کہا صبح کا کھانا لے آؤ۔ غداء اس کھانے کو کہتے ہیں جو صبح کے وقت کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو اور العشاء جو شام کے کھانے کیلئے تیار کیا گیا ہو۔ نصب کا معنی تھکاوٹ اور شدت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چٹان سے گذرنے کے بعد بھوک اور تھکاوٹ طاری کی تا کہ مچھلی کی یاد آئے اور اپنی منزل مقصود کی طرف واپس لوٹیں۔ صحیح حدیث میں گذر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو چٹان سے گذرنے سے پہلے کوئی تھکاوٹ محسوس نہ ہوئی۔

قَالَ اَرَءَيْتَ اِذْ اَوَيْنَاۤ اِلَى الصَّخْرَةِ فَاِنِّيْ نَسِيْتُ الْحُوْتَ ۟ وَمَاۤ اَنْسٰنِيْهُ اِلَّا الشَّيْطٰنُ اَنْ اَذْكُرَهٗ ۚ وَاتَّخَذَ سَبِيْلَهٗ فِي الْبَحْرِ ۖ عَجَبًا ﴿۶۳﴾

''اس ساتھی نے کہا (اے کلیم) آپ نے ملاحظہ فرمایا جب ہم (ستانے کیلئے) اس چٹان کے پاس ٹھہرے تھے تو میں بھول گیا مچھلی کو اور نہیں فراموش کرائی مجھے وہ مچھلی مگر شیطان نے کہ میں اس کا ذکر کروں اور اس نے بنالیا تھا اپنا راستہ دریا میں بڑے تعجب کی بات ہے۔ لے''

لے امام بغوی نے لکھا ہے کہ ہقل بن زیاد نے فرمایا یہ وہ چٹان ہے جو نہر الزیت کے قریب ہے (1)۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ یوشع نے جب یہ مچھلی کا زندہ ہونا وغیرہ دیکھا تھا تو وہ موسیٰ علیہ السلام کو سارا واقعہ سنانے کیلئے کھڑے ہوئے تھے لیکن پھر بتانا بھول گئے تھے۔ حتی کہ دوسرے دن ظہر کی نماز پڑھ کر بتایا (2) اور پھر اپنا عذر پیش کیا۔ اَنْسٰنِیْهُ کو حفص نے وصل کی صورت میں ھا کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اسی طرح سورۂ فتح میں علیه الله میں ھا کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں ھا کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی شیطان نے مجھے آپ کے سامنے مچھلی کا امر بیان کرنا فراموش کرا دیا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید وہ اس نے مچھلی کے زندہ ہونے اور دریا میں گرنے کی وجہ سے قدرت کی نشانیوں کا مشاہدہ کیا تھا، ان کی وجہ سے وہ کلیتۃً اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو گیا ہو اور عبرت میں مستغرق ہو گیا ہو۔ اس وجہ سے مچھلی کا ذکر بھول گیا ہو، لیکن شیطان کی طرف بھلانے کی نسبت اپنے نفس کو روندنے کیلئے کی ہو۔ یا اس لئے کہ دونوں اطراف کے برداشت کی طاقت نہ ہونا اور ایک طرف سے غافل ہو کر دوسری طرف کلیتۃً متوجہ ہو جانا یقیناً ایسا کرنے والے کیلئے نقصان شمار ہوتا ہے (3)۔ واللہ اعلم۔ عجباً مفعول ثانی سبیلاً محذوف کی صفت ہے۔ موصوف کو حذف کر کے صفت کو اس کے قائم مقام رکھا ہے اور ظرف ظرف لغو ہے۔ یا یہ اتخذ کے مصدر اتخاذاً کی صفت ہو کر مفعول مطلق ہے اور مفعول ثانی فی البحر ظرف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اور اس کا فعل مضمر ہے۔ گویا نوجوان نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کرتے ہوئے آخر میں فرمایا عجبت عجباً۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ موسیٰ علیہ السلام کے کلام سے ہے کہ جب یوشع نے انہیں بتایا کہ مچھلی نے سمندر میں راستہ بنالیا تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا عجبت عجباً۔ بعض مفسرین نے یہ بھی لکھا ہے کہ اتخذ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے مچھلی کے سمندر میں راستہ بنانے کو عجیب جانا۔ اس صورت میں عجباً حال ہوگا۔

قَالَ ذٰلِكَ مَا كُنَّا نَبْغِ ۚ فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ﴿۶۴﴾

''آپ نے فرمایا یہی تو وہ ہے جس کی ہم جستجو کر رہے تھے پس وہ دونوں لوٹے اپنے قدموں کے نشان دیکھتے ہوئے۔ لے''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 583 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شہاب، جلد 6، صفحہ 204 (العلمیۃ)

ۓ نبغ کی یا کو ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں قائم رکھا ہے جبکہ نافع، ابوعمرو اور کسائی نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں (وقت وصل) میں حذف کیا ہے۔ قصصا یا تو فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا او قد کا مصدر ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے یا مصدر یعنی اسم فاعل ہے اور حال کی حیثیت سے منصوب ہے۔

فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَآ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا ﴿٦٥﴾

”تو پایا انہوں نے ایک بندے کو ہمارے بندوں میں سے ۱ے جسے ہم نے عطا فرمائی تھی رحمت اپنی جناب سے اور ہم نے سکھایا تھا اسے اپنے پاس سے (خاص) علم ۲ے“

۱ے عبداً سے مراد جمہور مفسرین کے نزدیک خضر علیہ السلام ہیں حالانکہ صحیح حدیث میں وارد ہے آپ کا نام بلیا بن ملکان تھا۔ بعض نے یسع اور بعض نے الیاس نام لکھا ہے اور خضر آپ کا لقب تھا۔ امام بغوی نے اپنی سند کے ساتھ ہمام بن منبہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا آپ کو خضر اس لئے کہا جاتا کہ آپ خشک زمین اور خشک گھاس پر تشریف فرما ہوتے تو وہ (آپ کی برکت سے) سرسبز ہو کر لہلہانے لگتی(1)۔ مجاہد نے آپ کے خضر لقب کی یہ وجہ لکھی ہے کہ آپ جہاں نماز پڑھتے، اردگرد کا علاقہ سرسبز و شاداب ہو جاتا۔ امام بغوی فرماتے ہیں، بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ بنی اسرائیل کی نسل سے تھے۔ بعض نے لکھا ہے کہ آپ بادشاہوں کے بیٹوں میں سے تھے جنہوں نے دنیا سے عدم دلچسپی کا مظاہرہ کیا تھا(2)۔ میرے نزدیک مختار یہ ہے کہ آپ بنی اسرائیل سے نہ تھے کیونکہ موسیٰ علیہ السلام تمام بنی اسرائیل کی طرف مبعوث کیے گئے تھے۔ اگر حضرت خضر علیہ السلام کا تعلق بنی اسرائیل سے ہوتا تو آپ موسیٰ علیہ السلام کے متبعین سے ہوتے۔ جبکہ ظاہر اس کے خلاف ہے۔ حدیث صحیح میں گذر چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو کپڑا لپیٹے ہوئے دیکھا تو ان پر سلام کیا خضر علیہ السلام نے کہا تمہاری زمین کا یہ سلام کہاں۔ فرمایا میں موسیٰ ہوں۔ خضر علیہ السلام نے کہا موسیٰ بنی سرائیل، فرمایا ہاں۔ میں جناب کے پاس آیا ہوں تاکہ آپ مجھے رشد و ہدایت کا وہ علم سکھائیں (جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے) آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ گدی کے بل چت لیٹے ہوئے تھے اور کپڑا لپیٹے ہوئے تھے، کچھ کپڑا آپ کے سر کے نیچے تھا اور کچھ پاؤں کے نیچے تھا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ اس وقت ملاقات ہوئی جب خضر علیہ السلام نماز پڑھ رہے تھے۔ یہ بھی روایت ہے کہ سبز چادر پر ملاقات ہوئی تھی سمندر کے کنارے پر۔

۲ے رحمۃً سے مراد وحی اور نبوت ہے من لدنا علمًا سے مراد مخصوص علم ہے جس کا حصول ذات الٰہی کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں اور وہ علم ذات و صفات ہے امام بغوی فرماتے ہیں اکثر اہل علم کے نزدیک حضرت خضر علیہ السلام نبی نہیں تھے۔ میں (مفسر) کہتا ہوں میرے نزدیک یہ قول محل نظر ہے کیونکہ اولیاء کرام کو جو الہام وغیرہ سے علم حاصل ہوتا ہے وہ علم ظنی ہوتا ہے، اس میں خطاء کا احتمال ہوتا ہے، اسی وجہ سے اولیاء کرام کے علوم میں تعارض پایا جاتا ہے۔ اگر خضر علیہ السلام نبی نہ ہوتے تو اس الہام کی بناء پر کہ یہ بچہ بڑا ہو کر والدین کو کفر پر مجبور کرے گا، معصوم بچے کو قتل کرنا آپ کیلئے کبھی جائز نہ ہوتا۔

قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ﴿٦٦﴾

”کہا اس بندے کو موسیٰ نے کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ سکھائیں مجھے رشد و ہدایت کا خصوصی علم جو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 584 (الفکر) 2۔ ایضاً

آپ کو سکھایا گیا ہے۔ ۱ ''

۱ کلام کا حق تو یہ تھا کہ آپ اس طرح کہتے کہ میں آپ کے پاس آیا ہوں کہ آپ کی اتباع کروں اور آپ کی سنگت اختیار کروں۔ لیکن آپ نے اتباع اور سنگت کا اذن طلب کرنے کیلئے اسلوب بیان بدل دیا۔ تعلمن میں ابن کثیر نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ نافع اور ابوعمرو نے صرف وصل میں قائم رکھا ہے، باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو حذف کیا ہے، یعنی کیا میں آپ کے ساتھ رہ سکتا ہوں بشرطیکہ آپ مجھے سکھائیں علی ان تعلمن حال ہے اتبعک کی ضمیر مرفوع سے یا ضمیر منصوب سے۔ رشدا کو ابوعمرو نے راء اور شین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے راء کے ضمہ اور شین کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے بَخَل اور بُخْل۔ رشد کا معنی بھلائی اور خیر کا پہنچانا ہے یہ تعلمنی کا مفعول ہے اور علمت کا مفعول ہوتا ہے، یعنی عرف کے معنی میں ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ رشدً ابتعک کی علت ہو۔ یا فعل مضمر کا مصدر ہو۔ یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ کبھی کبھی مفضول کو اپنے سے افضل پر کوئی جزوی فضیلت ہوتی ہے اور فاضل کو چاہئے کہ فضیلت کا وہ حصہ مفضول سے حاصل کرے اور اس کو عار نہ سمجھے جیسا کہ مذکورہ آیات کی تفسیر میں گذرا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے پوچھا کہ تیرا کونسا بندہ زیادہ عالم ہے؟ اللہ تعالیٰ نے فرمایا جو اپنے علم کے ہوتے ہوئے لوگوں سے علم سیکھتا ہے، شاید کہ کوئی کلمہ ایسا مل جائے جو اس کی ہدایت کے راستہ کی طرف راہنمائی کرے اور اسے ہلاکت کے گڑھے سے بچالے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا حکمت کا کلمہ مومن کی گمشدہ چیز ہے جہاں سے ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔ اس حدیث کو ترمذی اور ابن ماجہ نے حسن سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ سے اور ابن عساکر نے حضرت علی رضی اللہ عنہا سے روایت کی ہے۔

نبی کریم ﷺ سے منقول درود بھی اسی باب سے متعلق ہے۔

اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی آلِ مُحَمَّدٍ کَمَا صَلَّیْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَ عَلٰی آلِ اِبْرَاھِیْمَ(1)۔

امام بغوی فرماتے ہیں بعض روایات میں ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے تعلیم کا سوال کیا تو خضر علیہ السلام نے فرمایا تورات علم کے لئے کافی ہے اور عمل کے لئے بنی اسرائیل کی راہنمائی کافی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ تعالیٰ نے مجھے آپ سے علم حاصل کرنے کا حکم دیا ہے(2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے اس کلام میں انتہائی ادب اور تواضع کا اظہار کیا اور اتباع کی اجازت طلب کی اور پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی علم سے کچھ سکھانے کی استدعا کی۔

قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ﴿۶۷﴾

''اس بندے نے کہا (اے موسیٰ) آپ میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ ۱ ''

۱ حفص نے مَعِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی طاقت کی نفی بڑی تاکیدی کلام کے ساتھ کی ہے۔ ایسی ہونی نہیں چاہئے تھی، اس لئے پھر خود ہی علت بیان فرمائی اور خود ہی ساتھ نہ رہ سکنے کا ان کی طرف سے عذر پیش کر دیا۔

وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا ﴿۶۸﴾

1۔ شرح سنن ابن ماجہ، جلد 1، صفحہ 489 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفکر)

''اور آپ صبر کر بھی کیسے سکتے ہیں اس بات پر جس کی آپ کو پوری طرح خبر نہیں۔ [1]''

[1] خبراً کا معنی علم ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے یا تمیز ہے یا مفعول مطلق ہے کیونکہ لم تحط بہ کا معنی لم تخبرہ ہے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے ساتھ رہ کر صبر کرنے کی نفی اس لئے فرمائی کیونکہ خضر علیہ السلام کو معلوم تھا کہ انسے ایسے امور صادر ہوں گے جو ظاہراً غیر شرعی ہوں گے اور انبیاء کرام غیر شرعی امور پر خاموش نہیں رہ سکتے جب تک کہ انکی وجہ جواز ظاہر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اس میں راز یہ ہے کہ انبیاء کرام کی شریعتیں ایسے قواعد کلیہ پر مبنی ہوتی ہیں جو عام لوگوں کی نسبت سے عموماً اصلاح کا موجب ہوتے ہیں۔ پس ان کی اصلاح وجوہ بھی عام لوگوں کے لئے ظاہر ہونی چاہئیں۔ اور وہ احکام جو اُن انبیاء کرام کی طرف وحی کئے جاتے ہیں وہ امتوں کی طرف مبعوث نہیں کئے جاتے بلکہ وہ انبیاء کرام کے اپنے نفوس کی اصلاح کے لئے وحی کیے جاتے ہیں یا ان امور کی اطاعت کے لئے ہوتے ہیں جو انبیاء کرام اور اللہ تعالیٰ کے درمیان ہوتے ہیں۔ پس ایسے احکامات ایسی حکمتوں پر مبنی ہوتے ہیں جن کی وجہ خیر عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی۔ موسیٰ علیہ السلام کی خضر علیہ السلام کے فعل پر انکار کی وجہ بھی یہی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کا شرب مختلف تھا۔ (جبکہ استفادہ (علم حاصل کرنا) کی شرائط میں سے ہے کہ عالم و متعلم کا شرب ایک ہو۔ متعلم استاد کی پیروی کرے اور اعتراض کی زبان نہ کھولے) حضرت خضر علیہ السلام نے صبر پر استطاعت نہ رکھنے کو عدم افادہ کی علت بنایا۔ علت کو اس کے قائم مقام رکھ دیا گویا یوں فرمایا کہ میری معیت وصحبت تجھے فائدہ نہ دے گی کیونکہ تو میرے ساتھ صبر کرنے کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔

اسی وجہ سے صوفیاء کرام فرماتے ہیں کہ مرید پر واجب ہے کہ وہ شیخ کی کسی بات پر اعتراض نہ کرے اگرچہ اس کے ہاتھ سے کوئی غیر شرعی فعل بھی ظاہر ہو بشرطیکہ مرید پر ثابت ہو چکا ہو کہ مرشد کریم اہل کمال اور اہل تکمیل افراد سے ہے اگر مرید مشرب کے اختلاف کی وجہ سے صبر کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اس پر واجب ہے کہ مرشد کی مصاحبت ترک کر دے لیکن اس کے کمال کا منکر نہ ہو۔

اگر کوئی یہ کہے کہ شریعت محمدیہ عام اور دائمی ہے۔ اب اس میں نسخ اور تبدیلی کا احتمال ممکن ہی نہیں ہے تو کوئی عارف اگر غیر شرعی کام کرے تو اس پر کیسے خاموش رہا جائے۔ تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ دین میں کسی حرام چیز کو کوئی بھی مباح تصور نہیں کرتا۔ پس جو مدعی ولایت ہے اس سے بھی یہ متصور نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی بچہ کو قتل کر دے اور یہ کہے کہ اللہ نے مجھے الہام کیا ہے کہ یہ بڑا ہو کر والدین کو کفر اور سرکشی پر مجبور کرے گا۔ لیکن کبھی ایک چیز کے متعلق علماء کے اقوال مختلف ہوتے ہیں اور ہر ایک قول کی بنیاد دلیل شرعی پر قائم ہوتی ہے جیسا کہ سماع، ذکر بالجہر وغیرہ میں اولیاء کرام میں سے کوئی اگر ان افعال کو کرتا ہے اس پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے۔ کیونکہ جو کسی عالم کی تقلید کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ سے سلامتی کے ساتھ ملاقات کرے گا۔ کبھی ایک چیز ظاہراً غیر شرعی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہوتی جیسے جو بوتل میں پانی ڈال کر پیئے اور لوگوں کو دکھائے کہ یہ شراب ہے، اس سے اس کی غرض یہ ہو کہ مخلوق کا ہجوم کم ہو جائے اور اس کے معمولات میں خلل نہ آئے۔ اور کبھی اللہ والے سے گناہ صغیرہ سرزد ہوتا ہے اور اس کے گناہ ہونے کا وہ اعتراف بھی کرتا ہے۔ (یعنی گناہ اولیاء سے سرزد ہو سکتا ہے) جبکہ علماء کا اجماع ہے کہ گناہ سے عصمت انبیاء کرام کا خاصہ ہے۔ معصیت کا صدور ولایت کے منافی نہیں ہے۔ پس مرید کے لئے شیخ پر اعتراض جائز نہیں بلکہ اس فعل کو اچھا نہ سمجھے اور اس پر عمل نہ کرے اور اس شیخ کے کمال کا انکار بھی نہ کرے۔ ایسا کیوں نہ ہوا کہ جب تم نے یہ (افواہ) سنی تو گمان کیا ہوتا مومن مردوں اور مومن عورتوں نے اپنے بارے میں نیک گمان۔ بعض اولیاء کرام کے مقالات کشف اور مشاہدات پر مبنی ہوتے ہیں۔ پس ان پر اعتراض نہیں کرنا چاہئے بلکہ جہاں تک ممکن ہو ان کی صحیح محمل پر تاویل کرنی چاہئے کیونکہ اللہ کا ارشاد ہے۔ لَوْلَآ اِذْ سَمِعْتُمُوْهُ ظَنَّ الْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بِاَنْفُسِهِمْ خَيْرًا [1] اور اگر

ان کے اقوال کا کوئی صحیح محل بیان نہ ہو سکے تو اسے سکر پر محمول کرنا چاہئے۔ کیونکہ فقہاء کا فتویٰ ہے کہ جب مباح چیز سے نشہ چڑھ جائے تو وہ بندہ معذور ہوگا اور اس کی طلاق واقع نہ ہوگی۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ سے محبت کے غلبہ کی وجہ سے کوئی مدہوش ہو جائے تو وہ کیسے اپنے کلام میں معذور نہ ہوگا۔ یا ان کی باتوں کو اس پر محمول کیا جائے کہ قائل کی مراد کو سامع سمجھنے سے قاصر ہے۔ یا اس پر محمول کیا جائے کہ کہنے والے کا وہ کلام اور معنی مراد ہے جو ظاہری معنی کے خلاف ہے کیونکہ عبارات محسوس معانی یا معقولہ معانی پر منحصر ہوتی ہیں جو امور محسوسہ سے مستنبط معانی ہوتے ہیں۔ لیکن جس کی کوئی مثال اور نظیر نہ ہو جیسے ذات وصفات کے حقائق جب قلب سلیم پر متجلی ہوتے ہیں اور وہ ان کو بیان کرنا چاہتا ہے، جبکہ ان کے بیان کے لئے کوئی الفاظ بھی لغت میں نہیں ہیں۔ تو قائل استعارات، مجازات اور غیر تامہ تشبیہات کی طرف مجبور ہوتا ہے۔ پس سننے والے کیلئے جائز نہیں ہے کہ ان کے مقالات کو ظاہر معانی پر محمول کرے جو عقائد اہل سنت کے مخالف ہوں اور کہنے والے پر اعتراض کرے بلکہ ان اقوال کے ساتھ متشابہات کا معاملہ کرے جو کلام الٰہی اور کلام رسول ﷺ میں موجود ہیں۔ جو اس مسلک پر نہیں چلتا (اور اولیاء کرام کی گستاخیاں کرتا ہے) وہ خسارے اور گھاٹے میں ہوتا ہے جیسا کہ قرآن ظالموں کے لئے خسارے کا اضافہ کرتا ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جو اَلرَّحْمٰنُ عَلَی الْعَرْشِ اسْتَوٰی۔ یَدُ اللّٰہِ فَوْقَ اَیْدِیْہِمْ سننے اور ان کے آیات قرآنیہ ہونے کا انکار کرے تو وہ کافر ہو جاتا ہے اور اگر اللہ کے جسم کا معتقد ہو تو کفر کے قریب ہو جائے گا۔ اسی طرح اولیاء کرام کا کلام جب ظاہر شریعت کے خلاف ہو تو اس پر انکار نہیں کرنا چاہئے اور اس کے ظاہر پر اعتقاد بھی نہیں رکھنا چاہئے۔ واللہ اعلم۔

جب موسیٰ علیہ السلام کو اپنے صبر پر یقین نہ تھا تو قطعی طور پر یہ نہیں کہا کہ میں صبر کروں گا بلکہ ان شاء اللہ کہہ کر مشیت الٰہی کے ساتھ اپنے صابر ہونے کو معلق کر دیا۔

قَالَ سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّلَآ اَعْصِیْ لَکَ اَمْرًا ﴿۶۹﴾

"آپ نے کہا آپ مجھے پائیں گے اگر اللہ تعالیٰ نے چاہا صبر کرنے والا اور میں نافرمانی نہیں کروں گا آپ کے کسی حکم کی۔ ۱"

۱۔ ستجدنی کو نافع نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ولا اعصی لک امراً کا جملہ صابراً پر معطوف ہے اور محل نصب میں ہے۔ یعنی آپ مجھے ان شاء اللہ صبر کرنے والا اور نافرمانی نہ کرنے والا پائیں گے۔ یا اس جملہ کا عطف ستجدنی پر ہے، اس وقت اعراب میں اس کا کوئی محل نہ ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صبر کرنے پر معاہدہ کیا کیونکہ صحبت کے افادہ کے لئے صبر کرنا شرط ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو مصاحبت کا حکم فرمایا تھا۔ اور موسیٰ علیہ السلام کو صبر کرنے میں شک تھا کیونکہ اعتراض اور مخالفت، مشرب کے مختلف ہونے کے لوازم میں سے ہے اور بغیر اختیار کے ان سے اس چیز کا صادر ہونا تھا اس لئے حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا اگر تم میرے ساتھ رہنا چاہتے ہو تو مجھ سے کسی چیز کے متعلق سوال نہ کرنا حتیٰ کہ میں خود بیان کروں۔

قَالَ فَاِنِ اتَّبَعْتَنِیْ فَلَا تَسْـَٔلْنِیْ عَنْ شَیْءٍ حَتّٰٓی اُحْدِثَ لَکَ مِنْہُ ذِکْرًا ﴿۷۰﴾

"اس بندے نے کہا اگر آپ میرے ساتھ رہنا چاہتے ہیں تو مجھ سے کسی چیز کے بارے میں پوچھیئے نہیں یہاں تک کہ میں آپ سے اس کا خود ذکر کروں۔ ۱"

۱۔ قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں۔ اتبعتنی میں ابن ذکوان نے یاء کو دونوں حالتوں میں حذف کیا ہے، جبکہ اخفش سے اس کے خلاف مروی ہے۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں یاء کو قائم رکھا ہے۔ نافع، ابن عامر اور ابوجعفر نے فلا تسئلنی کو لام کے فتحہ اور

نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے لام کے سکون اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ کلام کو شرط و جزاء کی صورت میں ذکر کیا ہے کیونکہ صبر کرنے میں آپ کو شک تھا اور اسکے وقوع کو آپ نے بعید سمجھا تھا۔ (یعنی خضر علیہ السلام کو موسیٰ کلیم کے خاموش رہنے اور سوال نہ کرنے پر شک تھا اور آپ کو معلوم تھا کہ اختلاف مشرب کی بناء پر یہ خاموش نہیں رہ سکیں گے اس لئے یہ اسلوب اپنایا۔ سیدھا یہ نہیں فرمایا کہ تم مجھ سے اس کام کے متعلق نہ پوچھنا جو میں کروں، جبکہ وہ تجھے پسند نہ ہو۔ کیونکہ سوال اعتراض کی مانند ہوتا ہے اور اعتراض استفادہ سے مانع ہے۔ پس میں خود اس معاملہ کو بیان کروں تو فبہا ورنہ تم استفسار نہ کرنا۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰٓی اِذَا رَکِبَا فِی السَّفِیْنَۃِ خَرَقَہَا ؕ قَالَ اَخَرَقْتَہَا لِتُغْرِقَ اَہْلَہَا ۚ لَقَدْ جِئْتَ شَیْئًا اِمْرًا ﴿۷۱﴾

''پس وہ دونوں چل پڑے یہاں تک کہ جب وہ سوار ہوئے کشتی میں تو اس بندے نے اس میں شگاف کر دیا موسیٰ بول اٹھے کیا تم نے اس لئے شگاف کیا ہے کہ اس کی سواریوں کو ڈبو دو۔ ۱؎ یقیناً تم نے بہت برا کام کیا ہے۔ ۲؎ ''

۱؎ باہم معاہدہ کر کے دونوں ساحل سمندر پر چل پڑے۔ انہیں ایک کشتی کی تلاش تھی تاکہ اس پر سوار ہو جائیں۔ انہیں ایک کشتی مل گئی اور اس پر سوار ہو گئے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سواریوں نے کہا یہ چور ہیں۔ ان کو نکل جانے کا حکم دو۔ لیکن کشتی کے مالک نے کہا یہ چور نہیں ہیں، مجھے تو یہ انبیاء کے چہرے دکھائی دیتے ہیں (1)۔ بخاری، مسلم کی حدیث میں ابی بن کعب کے حوالہ سے گزر چکا ہے کہ انکے پاس سے کشتی گذری تو انہوں نے سوار کرنے کے متعلق کہا تو وہ خضر علیہ السلام کو پہچان گئے اور انہوں نے بغیر کسی کرایہ کے انہیں سوار کر لیا (2)۔ جب سوار ہو گئے تو خضر علیہ السلام نے اسے توڑنا شروع کر دیا، جب کہ صحیحین کی حدیث میں گزر چکا ہے کہ خضر علیہ السلام نے کشتی کا ایک تختہ نکال لیا۔ موسیٰ علیہ السلام سے یارائے ضبط نہ ہو سکا اور کہا تم بھی کمال کے بندے ہو۔ انہوں نے ہم پر احسان کیا کہ ہمیں بغیر کرایہ کے سوار کر لیا اور آپ شگاف کر کے سواریوں کو ڈبونا چاہتے ہو۔ آپ اس میں شگاف کریں گے تو پانی اندر داخل ہو جائے گا اور نتیجہ سب لوگوں کا غرق ہونا ہے۔ حمزہ اور کسائی نے لیغرق کو یاء اور راء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اھلھا کو مرفوع پڑھا ہے۔ جبکہ شَیْئًا پر مفعولیت کی بناء پر نصب پڑھا ہے۔

۲؎ امرا یہ امر الامر سے مشتق ہے جس کا معنی عظیم ہونا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں کلام عرب میں الامر کا معنی داھیہ (مصیبت) ہے اور ہر چیز کی اصل شدید اور بڑی ہے (3)۔ قتیبی نے اس کا ترجمہ عجبا کیا ہے (4)۔ امام بغوی لکھتے ہیں روایت ہے کہ خضر علیہ السلام نے ایک کانچ کا پیالہ لیا اور کشتی کے سوراخ پر رکھ دیا (5)۔ جلال الدین المحلی فرماتے ہیں پانی اندر داخل نہ ہوا تھا یعنی یہ خضر علیہ السلام کا معجزہ تھا۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ اِنَّکَ لَنْ تَسْتَطِیْعَ مَعِیَ صَبْرًا ﴿۷۲﴾

''اس بندے نے کہا کیا میں نے کہا نہیں تھا کہ آپ میں یہ طاقت نہیں کہ میری سنگت پر صبر کر سکیں۔ ۱؎ ''

۱؎ قال کا فاعل خضر علیہ السلام ہیں۔ حفص نے معی کو یآء کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ خضر علیہ السلام نے پہلی بات یاد کرانے کے لئے دوبارہ کہی۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585 (الفکر) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 482 (وزارت تعلیم) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 585
4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

جب موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ تختہ نکالنے کے باوجود پانی کشتی میں داخل نہیں ہوا اور سواریوں کو کچھ نقصان نہیں ہوا اور اپنا معاہدہ بھی یاد آیا تو معذرت کرتے ہوئے کہا۔

قَالَ لَا تُؤَاخِذْنِي بِمَا نَسِيتُ وَلَا تُرْهِقْنِي مِنْ أَمْرِي عُسْرًا ﴿٧٣﴾

''آپ نے (عذرخواہی کرتے ہوئے) کہا کہ نہ گرفت کرو مجھ پر میری بھول کی وجہ سے۔ 1۔ اور نہ سختی کرو مجھ پر میرے اس معاملہ میں بہت زیادہ۔ 2۔''

1۔ بما نسیت میں ما موصولہ بھی ہو سکتا ہے اور شئی کے معنی میں موصوف بھی ہو سکتا ہے، یعنی اعتراض نہ کرنے کے معاہدہ یا میرے اس کو بھول لینے کی وجہ سے مؤاخذہ نہ فرمائیں۔ موسیٰ کلیم نے اپنی بھول پر معذرت طلب کی۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں نسیان بمعنی الترک ہے۔ یعنی آپ کی پہلی وصیت کو میں نے جو چھوڑا ہے اس پر مواخذہ نہ فرمائیں۔ حدیث صحیح میں ابی بن کعب سے روایت ہو چکا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے پہلا سوال بھول کی وجہ سے، دوسرا شرط کی بناء پر، تیسرا سوال عمداً کیا تھا(1)۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا آپ بھولے نہیں تھے۔ بلکہ یہاں کلام میں تعریض ہے (تعریض کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ صراحۃ ایک چیز ذکر کی جاتی ہے لیکن مراد کچھ اور ہوتا ہے جس کا ذکر نہیں ہوتا جیسے کوئی کسی سے مخاطب ہو کر کہتا ہے بخل کتنا برا ہے۔ اس کلام میں تعرض ہے کہ مخاطب بخیل ہے۔) گویا آپ کوئی دوسری چیز بھول گئے تھے وصیت کو نہیں بھولے تھے(2)۔

2۔ لاترھقنی کا معنی لا تکلفنی ہے۔ یعنی مجھ پر تنگی اور گرفت کر کے مشقت نہ ڈالیئے۔ عسراً کا معنی مشقۃ ہے یعنی مجھ پر اس تنگی اور مؤاخذہ کی وجہ سے آپ کی متابعت مشکل ہو جائے گی۔ عسراً رھق کا مفعول ثانی ہے۔ یرھق کا معنی کسی چیز کو ڈھانپ لینا ہے۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ مجھ پر سختی نہ کرو، اور آسانی کا معاملہ کرو تنگی کا معاملہ نہ کرو۔

فَانْطَلَقَا ۗ حَتَّىٰ إِذَا لَقِيَا غُلَامًا فَقَتَلَهُ قَالَ أَقَتَلْتَ نَفْسًا زَكِيَّةً بِغَيْرِ نَفْسٍ لَقَدْ جِئْتَ شَيْئًا نُكْرًا ﴿٧٤﴾

''پھر دونوں چل پڑے حتیٰ کہ جب وہ ملے ایک لڑکے کو تو اس نے اسے قتل کر ڈالا موسیٰ (غضب ناک ہو کر) کہنے لگے۔ 1۔ کیا مار ڈالا آپ نے ایک معصوم جان کو کسی نفس کے بدلہ کے بغیر بیشک آپ نے ایسا کام کیا ہے جو بہت ہی نازیبا ہے۔ 2۔''

1۔ کشتی سے اتر کر کلیم و خضر چل پڑے۔ راستہ میں بچوں کے درمیان کھیلتے ہوئے ایک بچہ سے ملے جسے خضر علیہ السلام نے قتل کر دیا۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ بچہ شیریں کلام اور خوش شکل تھا۔ سدی نے لکھا ہے کہ وہ بچہ تمام بچوں سے زیادہ حسین تھا، اس کا چہرہ حسن کی وجہ سے چمکتا تھا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ خضر علیہ السلام نے اسے لٹا کر چھری سے ذبح کیا تھا۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے اسے سر سے پکڑا اور ہاتھ سے اس کی گردن اکھیڑ دی۔ عبدالرزاق نے بھی خبر روایت کی ہے کہ آپ نے انگوٹھے، سبابہ اور وسطی تین انگلیوں کے ساتھ اشارہ فرمایا اور اس کا سر تن سے جدا کر دیا۔ یہ بھی روایت ہے کہ آپ نے پتھر سے اس کا سر کچل دیا تھا۔ بعض نے لکھا ہے کہ دیوار پر اس کا سر مار کر قتل کیا تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ بچہ ابھی بالغ نہیں تھا۔ اکثر مفسرین کا یہی قول ہے(3) اور نص قرآن سے بھی یہی مستفاد ہے کیونکہ غلام کے لفظ کا اطلاق بلوغ کے بعد میں نہیں تھا۔ ابن عباس فرماتے ہیں موسیٰ کلیم کا نفساً زکیۃ کہنا ہی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 586 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

دلیل ہے کہ وہ بچہ تھا، بالغ نہیں تھا۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں وہ پورا مرد تھا۔ کلبی کہتے ہیں وہ ڈاکہ زنی کرتا تھا اور سامان لوٹ کر والدین کے پاس پناہ لیتا تھا۔ ضحاک فرماتے ہیں وہ بچہ تھا اور برے افعال کرتا تھا، جس سے اس کے والدین کو تکلیف ہوتی تھی۔ مسلم نے ابی بن کعب کی حدیث میں نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس بچے کو خضر علیہ السلام نے قتل کیا تھا وہ طبعاً کافر تھا۔ اگر وہ زندہ رہتا تو والدین کو کفر اور نافرمانی پر مجبور کرتا(1)۔ فقتلہ میں فآ تعقیب کے لئے ہے اور یہ دلالت کرتی ہے کہ خضر علیہ السلام نے پہلی ملاقات میں بغیر تفتیش اور مہلت کے فوراً قتل کر دیا تھا۔

؂ کوفیوں اور ابن عامر نے الف کے بغیر یآ کی تشدید کے ساتھ زکیۃً پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے الف کے ساتھ یآء کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ کسائی اور فراء فرماتے ہیں کہ دونوں کا معنی ایک ہے جیسے قاسیہ اور قسیہ دونوں کا معنی ایک ہے۔ ابو عمرو بن العلاء کہتے ہیں الزاکیۃ وہ ہوتا ہے جس نے کبھی کوئی گناہ نہ کیا ہو اور الزکیۃ وہ نفس ہوتا ہے جس نے گناہ کیا ہو اور پھر توبہ کر لی ہو(2)۔ بغیر نفس یعنی قتل تو حد اور قصاص کی وجہ سے واجب ہوتا ہے۔ جبکہ اس پر نہ حد تھی نہ قصاص۔ آپ نے اسکو کیوں قتل کر دیا۔ کشتی کے مسئلہ میں خرقھا کو جزاء بنایا اور موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو مستقل کلام ذکر فرمایا اور دوسرے فعل (قتلہ) میں موسیٰ علیہ السلام کے اعتراض کو ماقبل شرط کی جزاء بنایا۔ اس تغیر عبارت کی وجہ یہ ہے کہ قتل ایک قبیح ترین فعل تھا، اس پر اعتراض کو زیادہ دخل تھا۔ یہ فعل اس قابل تھا کہ اسے کلام کی بنیاد بنایا جائے۔ اسی وجہ سے آگے علیحدہ کلام ذکر فرمائی لقدجئت شیئًانکرا ؐ نکراً اس فعل کو کہتے ہیں جو غیر شرعی ہو۔ نافع، یعقوب، ابوبکر اور ابن ذکوان نے یہاں اور سورۃ الطلاق میں نکراً یعنی کاف کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ باقی قراء نے کاف کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ النکر امر سے زیادہ قبیح فعل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ بچے کے قتل میں حقیقۃً ہلاکت پائی گئی تھی اس لئے نکرا فرمایا اور کشتی کے پھاڑنے میں ہلاکت کا اندیشہ تھا۔ اس لئے وہاں امراً استعمال فرمایا۔ یہ قتادہ کا قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں امر نکر سے زیادہ برے فعل پر دلالت کرتا ہے۔ کیونکہ کشتی میں بہت سے لوگوں کا ہلاک ہونا تھا اس لئے وہاں امر استعمال کیا، یہاں ایک شخص کی ہلاکت تھی اس لئے نکر استعمال فرمایا(3)۔ واللہ اعلم۔

قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝۷۵

"اس نے کہا (پہلے ہی) میں نے کہہ نہ دیا تھا آپ کو کہ آپ میری معیت میں صبر نہیں کر سکیں گے۔ ؂"

؂ معی کو حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ دو مرتبہ عہد کو توڑنے پر یہاں عتاب کو زوردار لہجہ میں ذکر فرمایا۔

قَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ عَنْ شَيْءٍۢ بَعْدَهَا فَلَا تُصٰحِبْنِيْ ۚ قَدْ بَلَغْتَ مِنْ لَّدُنِّيْ عُذْرًا ۝۷۶

"آپ نے کہا اگر میں پوچھوں آپ سے کسی چیز کے بارے میں اس کے بعد تو آپ مجھے اپنے ساتھ نہ رکھیں۔ ؂ آپ میری طرف سے معذور رہوں گے۔ ؂"

؂ قال کا فاعل موسیٰ علیہ السلام ہیں، یعنی آپ نے کہا اگر اس مرتبہ کے بعد مجھ سے آپ پر کوئی سوال ہو تو آپ مجھے بیشک جدا کر دینا۔ یعقوب نے فلا تصحبنی یعنی بغیر الف کے الصحبۃ سے مشتق کر کے پڑھا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 587 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

۲۔ نافع اور ابوجعفر نے لدنی کو دال کے ضمہ اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور ابوبکر نے دال کے سکون اور ضمہ کے اشمام اور نون کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ لیکن دوسرے قراء نے دال کے ضمہ اور نون کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ لدنی کا معنی عندی ہے۔ یعنی آپ میری طرف سے معذور ہوں گے کیونکہ تین مرتبہ میں آپ سے عہد توڑ چکا ہوں گا۔ مسلم نے ابی بن کعب سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْنَا وَعَلٰى مُوْسٰى لَوْلَا اَنَّهٗ عَجَّلَ لَرَاٰى الْعَجَبَ وَلٰكِنَّهٗ اَخَذَهٗ مِنْ صَاحِبِهٖ ذِمَامَةٌ فَقَالَ اِنْ سَاَلْتُكَ بَعْدَهَا الخ۔ یعنی اللہ ہم پر اور موسیٰ علیہ السلام پر رحم فرمائے۔ (آپ ﷺ کا معمول مبارک) تھا کہ جب بھی کسی نبی کا اس طرح ذکر فرماتے تو پہلے اپنا ذکر کرتے) اگر وہ جلدی نہ فرماتے تو بڑی بڑی عجیب چیزیں دیکھتے۔ لیکن انہوں نے خضر علیہ السلام سے حیاء فرمایا اور ملامت و مذمت سے ڈر گئے اور یہ کہہ دیا اگر میں اس کے بعد آپ سے پوچھوں تو آپ میری طرف سے معذور ہوں گے (1)۔ ابن مردویہ نے ان الفاظ میں یہی حدیث نقل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بھائی موسیٰ پر رحم فرمائے کہ انہوں نے حیاء فرمایا اور یہ کہہ دیا۔ اگر وہ اپنے ساتھی (خضر علیہ السلام) کے ساتھ ٹھہرے رہتے تو بڑی بڑی تعجب خیز چیزیں دیکھتے۔

فَانْطَلَقَا ٚ حَتّٰۤى اِذَاۤ اَتَيَاۤ اَهْلَ قَرْيَةِ ِۣاسْتَطْعَمَاۤ اَهْلَهَا فَاَبَوْا اَنْ يُّضَيِّفُوْهُمَا فَوَجَدَا فِيْهَا جِدَارًا يُّرِيْدُ اَنْ يَّنْقَضَّ فَاَقَامَهٗ ؕ قَالَ لَوْ شِئْتَ لَتَّخَذْتَ عَلَيْهِ اَجْرًا ﴿۷۷﴾

”پھر وہ چل پڑے یہاں تک کہ جب ان کا گزر ہوا گاؤں والوں کے پاس تو انہوں نے ان سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے (صاف) انکار کر دیا انکی میزبانی کرنے سے پھر ان دونوں نے اس گاؤں میں ایک دیوار دیکھی جو گرنے کے قریب تھی تو اس بندے نے اسے درست کر دیا۔ ۱؎ موسیٰ کہنے لگے اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ۲؎“

۱؎ ابن عباس فرماتے ہیں قریہ سے مراد انطا کیہ ہے۔ ابن سیرین نے فرمایا وہ ایکہ ہے یہ آسمان سے بعید ترین جگہ ہے۔ بعض نے برقہ لکھا ہے (2) علامہ بغوی نے حضرت ابوہریرہ سے اندلس روایت کیا ہے (3)۔ کلیم و خضر نے اس بستی والوں سے کھانا طلب کیا تو انہوں نے مہمان نوازی سے صاف انکار کر دیا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے فرمایا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ دونوں لئام کی بستی میں آئے، مجالس کا چکر لگایا اور لوگوں سے کھانا طلب کیا لیکن انہوں نے کھانا نہ دیا۔ مہمان نوازی کا حق طلب کیا لیکن انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا سب سے برا شہر وہ ہے جس میں مہمان کی مہمان نوازی نہ کی جائے (4)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ مردوں سے انہوں نے کھانا طلب کیا، انہوں نے نہ دیا لیکن اہل بربر کی ایک عورت نے ان کو کھانا پیش کیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام نے ان کی عورتوں کے لئے دعا کی اور ان کے مردوں پر لعنت کی (5)۔ پھر انہوں نے دیکھا کہ ایک دیوار ہے جو بالکل گرنے کے قریب ہے۔ اس کلام میں مجاز ہے کیونکہ دیوار کا کوئی ارادہ نہیں ہوتا، اس کا معنی یہ ہے کہ وہ گرنے کے قریب تھی۔ اسی طرح کہتے ہیں داری تنظر دار فلان۔ (میرا گھر فلاں کے گھر کو دیکھتا ہے) یہ اس وقت کہتے ہیں جب گھر ایک دوسرے کے آمنے سامنے ہوں۔ حضرت خضر علیہ السلام نے گرتی ہوئی دیوار کھڑی کر دی۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابی بن کعب نے حضور ﷺ سے روایت فرمایا ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے وہ دیوار ہاتھ کے اشارہ سے کھڑی کر دی تھی۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں حضرت خضر نے دیوار کو ہاتھ سے چھوا تو وہ سیدھی ہو گئی۔ ابن عباس سے مروی ہے کہ پہلے آپ نے اس دیوار کو مکمل گرایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 587 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 588 3۔ ایضاً
4۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 589 (الفکر) 5۔ ایضاً

پھر اس کی بنیاد کھڑی کی۔ السدی فرماتے ہیں مٹی بنائی اور پھر دیوار بنائی(1)۔

۲۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا آپ بھی عجیب آدمی ہیں مفت و مفت دیوار بنادی ان لوگوں کی جنہوں نے ایک وقت کا کھانا بھی نہیں دیا۔ اگر آپ چاہتے تو اس محنت پر مزدوری ہی لے لیتے۔ ابن کثیر یعقوب اور ابوعمر نے لتخذت یعنی تاء کی تخفیف اور خاء کے کسرہ کے ساتھ مجرد فعل سے تبعت کے وزن پر پڑھا ہے۔ تخذیتخذ بروزن سمع یسمع استعمال ہوتا ہے۔ باقی قراء نے تاء کی تشدید اور خاء کے فتحہ کے ساتھ باب افتعال سے اتبعت کے وزن پر پڑھا ہے۔ فاء کلمہ کی تا کو تاء افتعال میں مدغم کیا گیا ہے۔ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ جیسے تبع اور اتبع کا معنی ایک ہے۔ یہ بصریوں کے نزدیک اخذ سے مشتق نہیں ہے امام بیضاوی نے بھی بصریوں کی تائید کی ہے کیونکہ اس صورت میں فاکلمہ ہمزہ ہوگا اور ہمزہ تاء میں مدغم نہیں ہوتا۔ جوہری فرماتے ہیں اتخاذ باب افتعال کا مصدر ہے۔ الاخذ سے مشتق ہے لیکن ہمزہ کی تلیین اور یاء کو تاء سے بدلنے کے بعد ادغام کیا گیا ہے، یعنی پہلے ہمزہ کو ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے یاء سے بدلا گیا پھر یاء کو تاء سے بدلا گیا کیونکہ وہ باب افتعال فاکے کلمہ میں واقع ہے۔ جس طرح اسر ’ایسر سے ہے اسی طرح الاتخاذ ’الاخذ سے ہے۔ پھر جب باب افتعال میں کثرت سے استعمال ہونے لگا تو علماء کو یہ شبہ ہوا کہ تاء اصلیہ ہے پس انہوں نے اسی سے فعل یفعل بنالیا۔ اور تخذ یتخذ کہنے لگے۔ اہل عرب کا قول علامہ جوہری کے قول کے خلاف ہے، اسی طرح الجزری نے نہایہ میں لکھا ہے۔

علیہ میں ضمیر کا مرجع ”بنانا“ ہے۔ یعنی آپ اس دیوار بنانے پر اجرت ہی طلب کر لیتے۔ اس جملہ میں عوض لینے پر برانگیختہ کرنا ہے تاکہ وہ دونوں اس عوض سے خوراک لے کر قوت حاصل کرتے اور گزر اوقات کرتے۔ دوسرا اس جملہ میں اشارہ ہے کہ آپ نے بے مقصد کام کیا ہے۔ اس جملہ میں دلیل ہے کہ آپ نے دیوار محنت اور مشقت سے بنائی تھی اس لئے اجرت لینا جائز تھا۔ اگر معجزہ سے کھڑی کی ہوتی تو اجرت لینا جائز نہ ہوتا۔

قَالَ هٰذَا فِرَاقُ بَیْنِیْ وَ بَیْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِیْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ﴿۷۸﴾

”اس نے کہا (بس سنگت ختم) اب میرے اور آپ کے درمیان جدائی کا وقت آ گیا۔ ۱۔ میں آگاہ کرتا ہوں آپ کو ان باتوں کی حقیقت پر جن کے متعلق آپ صبر نہ کر سکے۔ ۲۔“

۱۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا یہ تیسرا اعتراض ہماری جدائی کا سبب ہے کیونکہ اس اعتراض میں ہوائے نفس کا دخل ہے، جبکہ پہلے دو اعتراض کی کیفیت اس سے مختلف تھی کیونکہ ان کی بنیاد خالصۃً دین اور دیانت پر تھی۔ (۱) یا یہ معنی کہ یہ وقت ہماری جدائی کا وقت ہے کیونکہ آپ نے ایسا اعتراض کیا ہے جس میں خواہش نفس کا دخل ہے۔ یہ بھی جائز ہے کہ ھذا کا اشارہ اس فراق کی طرف ہو فلا تصاحبنی کے قول سے جس کا ذکر کیا گیا تھا۔ فراق کی بین کی طرف اضافت ’ظروف کی ظرف کی طرف اضافت کی طرح ہے مجازاً ایسا ہوتا رہتا ہے۔ مفسر فرماتے ہیں میں کہتا ہوں یہ اضافت فیوی ہے۔

۲۔ حضرت خضر علیہ السلام نے موسیٰ کلیم علیہ السلام سے فرمایا اب سنو جن باتوں کے ظاہر کو غیر مناسب سمجھ کر آپ خاموش نہیں رہ سکے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 589 (الفکر)

(۱) بعض غالی صوفیاء نے یہ کہا ہے اور مفسر رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی اتباع میں یہ لکھ دیا ہے۔ حالانکہ ایسی بات درست نہیں کیونکہ نبی جو بنی اسرائیل کے انبیاء میں سے سب سے افضل ہیں صاحب کتاب ہیں اور انتہائی جلیل القدر ہیں ان کی شان میں یہ گستاخی ہے۔ بعض مفسرین سے ایسی غلطی ہوئی ہے جسے صاحب کشاف معتزلی نے بھی رد کیا ہے۔ صاحب روح المعانی نے بھی اسے بے بنیاد قرار دیا ہے۔

میں آپ کو بتاتا ہوں کہ ان باتوں کا انجام خیر اور نیکی تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں بعض تفاسیر میں ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کا دامن پکڑا اور کہا قبلہ! جدا کرنے سے پہلے مجھے اپنے کاموں کی حقیقت تو بتا دو۔ تو خضر علیہ السلام نے فرمایا(1)۔

أَمَّا السَّفِينَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِينَ يَعْمَلُونَ فِي الْبَحْرِ فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا وَكَانَ وَرَاءَهُم مَّلِكٌ يَأْخُذُ كُلَّ سَفِينَةٍ غَصْبًا ﴿۷۹﴾

''وہ جو کشتی تھی وہ چند غریبوں کی تھی جو (ملاحی کا) کام کرتے تھے دریا میں سو میں نے ارادہ کیا کہ اسے عیب دار بنا دوں۔ لے اور (اس کی وجہ یہ تھی کہ) ان کے آگے (جابر) بادشاہ تھا جو پکڑ لیا کرتا تھا ہر کشتی کو زبردستی سے۔ ۲ ''

لے حضرت کعب فرماتے ہیں کہ وہ کشتی دس بھائیوں کی تھی جن میں سے پانچ اپاہج تھے اور پانچ سمندر میں کام کرتے تھے۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ مسکین کا اطلاق اس پر ہوتا ہے جس کے پاس مال ہو لیکن نصاب کو نہ پہنچتا ہو(2)۔ اور اس کی کفایت بھی نہ کرتا ہو یا اس کی حاجات اصلیہ سے فارغ نہ ہو۔ وہ بھائی مل کر اس کشتی کو اجرت پر چلاتے تھے اور اپنی معیشت کا بندوبست کرتے تھے۔

۲ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا میں نے اسے عیب دار اس لئے کیا تھا کیونکہ آگے ایک بادشاہ تھا جو صحیح سلامت کشتی زبردستی لے لیتا تھا۔ وراء ھم کا معنی امامھم (سامنے آگے) ہے جیسے ارشاد ہے مِّن وَرَآئِهِ جَهَنَّمُ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی خلفھم (پیچھے) ہے چونکہ لوٹنا اس کے راستہ پر تھا اس لئے فرمایا وراء ھم (ان کے پیچھے) پہلا قول صحیح ہے کیونکہ ابن عباس کی قرأت مکان امامھم اس پر دلالت کرتی ہے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس اسی طرح پڑھتے تھے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے کشتی کو اس لئے عیب دار کیا تھا تا کہ ظالم بادشاہ وہ چھین نہ لے۔ اس بادشاہ کا نام جلیدی بن کرکر تھا۔ محمد بن اسحٰق نے اس کا نام سولہ بن جلید الازدی لکھا ہے۔ شعیب الجبائی نے ہدد بن بدد ذکر کیا ہے(3)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کلام کے نظم کا حق تو یہ تھا کہ وکان وراء ھم ملک پہلے ہوتا اور فَأَرَدْتُّ أَنْ أَعِيبَهَا متأخر ہوتا۔ کیونکہ ہمیشہ مسبب۔ سبب پر مرتب ہوتا ہے اور مسبب' سبب سے مؤخر ہوتا ہے۔ لیکن یہاں تعییب کا ارادہ جو مسبب ہے وہ غصب کے خوف سبب سے مقدم ہے۔ اس اسلوب بیان کی دو وجہیں ہیں۔ 1۔ اہتمام کی وجہ سے۔ (چونکہ موسیٰ علیہ السلام کے انکار کی بنیاد کشتی کے پھاڑنے پر تھی اس لئے خضر علیہ السلام نے پہلے انکار کی وجہ کو دور کیا کہ میں نے عیب دار کرنے کے لئے اس میں شگاف کیا تھا۔ غرق کرنے کے لئے شگاف نہیں کیا تھا۔ تو اس اہمیت کے پیش نظر خضر علیہ السلام نے انداز بیان کو بدل دیا۔

۲۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ سبب صرف صحیح کشتی کے غصب ہونے کا خوف نہیں تھا بلکہ کشتی کا مساکین کے لئے ہونا بھی عیب دار کرنے کے سبب کا جزء تھا۔ خضر علیہ السلام نے پہلے دونوں جزوں میں سے اقوی جزء پر حکم کو مرتب فرمایا اور اقویٰ کی رعایت فرمائی اور پھر بطور تقید و تعمیم دوسرے جزء کو ذکر فرمایا۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت خضر علیہ السلام نے قوم کے سامنے عیب دار کرنے کا عذر پیش کیا اور ظالم بادشاہ کے متعلق بتایا، جبکہ پہلے انہیں اس بادشاہ کے متعلق معلوم نہ تھا۔ فرمایا میں نے اس کو عیب دار کرنے کا اس لئے ارادہ کیا تھا تا کہ جب یہ اس ظالم بادشاہ کے پاس سے گزرے تو وہ اس کے عیب کی وجہ سے اسے چھوڑ دے اور جب وہ بادشاہ سے آگے گزر گئے تو انہوں نے کشتی کو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 590 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

درست کرلیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ انہوں نے ایک شیشی سے اس کا سوراخ بند کردیا۔ بعض فرماتے ہیں تارکول سے بند کیا تھا(1)۔

میں کہتا ہوں امام بغوی کی نقل کردہ روایت کی قرآن کا اسلوب بیان موافقت نہیں کرتا کیونکہ آیت قرآنیہ میں صراحت کے ساتھ ہے کہ خضر علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت کشتی سے اترنے' بچے کو قتل کرنے اور دیوار کو درست کرنے کے بعد علیحدگی کے وقت بتائی تھی۔ اگر خضر علیہ السلام نے کشتی والوں کے سامنے پہلے ہی یہ عذر پیش کردیا ہوتا اور حکمت بتادی ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام پر یہ حکمت مخفی نہ ہوتی کیونکہ آپ بھی تو کشتی میں ساتھ تھے اور دوبارہ اس حکمت کو موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کرنے کی ضرورت ہی نہ ہوتی۔

وَاَمَّا الْغُلٰمُ فَكَانَ اَبَوٰهُ مُؤْمِنَيْنِ فَخَشِيْنَآ اَنْ يُّرْهِقَهُمَا طُغْيَانًا وَّكُفْرًا ۝

''اور وہ جو لڑکا تھا تو (اس کی حقیقت یہ ہے کہ) اس کے والدین مومن تھے پس ہمیں اندیشہ ہوا کہ وہ (اگر زندہ رہا تو) مجبور کردے گا انہیں سرکشی اور کفر پر۔ ۲ ''

۱۔ یعنی بچے کے والدین ایماندار تھے، ہمیں اندیشہ ہوا کہ یہ بچہ اپنی نافرمانی اور بدکرداری سے ان پر سرکشی اور کفر کی بدنما چادر نہ بچھا دے۔ اور ان کو شر اور مصیبت میں گرفتار نہ کردے۔ یا یہ معنی کہ ان کے ایمان کے ساتھ اپنی سرکشی اور کفر کو ملا نہ دے اور ایک ہی گھر میں دو مومن اور ایک کافر وسرکش جمع نہ ہو جائیں۔ یا یہ معنی کہ ہمیں اندیشہ ہوا کہ غالب آکر انہیں تکلیف دے گا اور اس کی گمراہی کی وجہ سے وہ مرتد ہو جائیں گے یا غلبہ محبت کی وجہ سے اس کی سرکشی اور کفر پر اس کی مدد کر کے مرتد ہو جائیں گے۔

سعید بن جبیر فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ ہمیں خوف ہوا کہ اس کی محبت والدین کو اس کافر کے دین کی پیروی پر برانگیختہ کرے گی(2)۔ حضرت خضر علیہ السلام کو یہ اندیشہ وحی کے ذریعہ سے معلوم ہوا تھا۔ ابن ابی شیبہ نے زید بن ہرمز عن ابن عباس کی سند سے روایت کیا ہے کہ نجدہ الحروری نے حضرت ابن عباس کو خط لکھا کہ حضرت خضر علیہ السلام نے ایک بچہ کو کیسے قتل کیا تھا؟ حالانکہ نبی کریم ﷺ نے بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔ حضرت ابن عباس نے جواباً لکھا کہ اگر بچوں کا حال تمہیں بھی موسیٰ علیہ السلام کے عالم ساتھی کی طرح معلوم ہو جائے تو تیرے لئے قتل کرنا جائز ہوگا، یعنی حضور نبی کریم ﷺ کی نہی عام مسلمانوں کے لئے ہے جن کی طرف وحی نہیں کی جاتی۔ تا کہ ان کو بچوں کی حالت کا علم حاصل ہو۔ اور وحی کا سلسلہ اب نبی کریم ﷺ کے بعد ختم ہو چکا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی نہی خضر علیہ السلام اور ان جیسے دوسرے افراد کے لئے نہیں ہے جنہیں وحی کے ذریعے چیزوں کا علم عطا کیا جاتا ہے۔ بلکہ آپ کی نہی عام مؤمنین کے لئے ہے جن پر وحی نہیں آتی۔ واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ چونکہ جانتا تھا کہ اگر یہ بچہ زندہ رہا تو کافر اور سرکش ہوگا اور مفروض متحقق غلام نہ زندہ رہا، نہ اس نے کفر کیا اور نہ سرکشی کی کیونکہ خضر علیہ السلام نے اسے قتل کردیا تھا۔ اور علم ہمیشہ معلوم کے تابع ہوتا ہے۔ پس ضروری ہے کہ خارج میں علم کے مصداق کو معلوم پایا جائے۔ پس اس مسئلہ میں اس علم کی صحت کیسے متصور ہوگی۔ جبکہ معلوم پایا ہی نہیں گیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے اسے پہلے ہی قتل کردیا تھا۔ اس سوال کے جواب میں یہ بھی نہیں کہا جا سکتا کہ اشیاء کا وجود علم الٰہی کے تابع ہے، جبکہ بندوں کا علم اشیاء کے تابع ہوتا ہے۔ کیونکہ علم وہاں بھی معلوم کے تابع ہے اور اس سے مستفاد ہے۔ یہ جواب اس لئے نفع بخش نہیں کیونکہ علم خواہ معلوم کے تابع ہو یا معلوم کا متبوع ہو' علم ومعلوم کی مطابقت ضروری ہوتی ہے اور ایک کا دوسرے سے تخلف نہ ہونا بھی ضروری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 590 (الفکر) 2۔ ایضاً

ہے' پس جب غلام ہی زندہ نہ رہا اور اس نے کفر کا ارتکاب ہی نہ کیا تو واقع میں قضیہ کے تحقق کا نہ ہونا ظاہر ہو گیا۔ پس علم الٰہی کا تعلق قضیہ کے ساتھ جائز نہیں ہے تا کہ واقع کے ساتھ علم کی مطابقت کا نہ ہونا لازم نہ آئے (یعنی ایسا معلوم جس کا خارج میں وجود ہی نہیں ہے اس کے ساتھ علم الٰہی کا صحیح تعلق کیسے ممکن ومتصور ہوگا) اسکا صحیح جواب وہ ہے جو شبہ کو جڑ سے ختم کر دیتا ہے کہ قضیہ شرطیہ کا صدق اور اس کے ساتھ علم کا تعلق واقع میں مقدم کے لئے تالی کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے (یعنی مقدم اور تالی میں علاقہ لزوم پایا جائے) قضیہ شرطیہ کا وجود دونوں طرفوں (مقدم وتالی) کے پائے جانے کا مقتضی نہیں ہوتا (یعنی مقدم اور تالی کا پایا جانا ضروری نہیں۔ علاقہ لزوم ضروری ہے اگر وہ پایا جائے گا تو قضیہ شرطیہ صحیح ہوگا) مثلاً اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لَوْ كَانَ فِيهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا۔ یہ قضیہ شرطیہ ہے اور سچا ہے مقدم (بہت سے خدا) کے نہ پائے جانے کے باوجود اس سے علم متحقق ہے۔ پس اس علم کا مقتضی بچہ کے باقی رہنے کی صورت میں بچہ کے کفر کا لزوم ہے۔ اس سے اس کے تخلف کا احتمال نہیں۔ (یعنی بچہ کا نہ پایا جانا اس کا کفر نہ کرنا قضیہ شرطیہ کی سچائی کے لئے مانع نہیں۔ کیونکہ مقدم اور تالی کے درمیان علاقہ لزوم پایا جاتا ہے۔) ایک دوسری مثال سے سمجھئے ہم کہتے ہیں اگر سورج طلوع ہوگا تو دن موجود ہوگا۔ پس یہ قضیہ شرطیہ سورج کے طلوع ہونے کی صورت میں دن کے وجود کے لزوم کا تقاضا کرتا ہے' سورج کے طلوع ہونے یا دن کے وجود کا تقاضا نہیں کرتا۔ (اسی طرح اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ بچہ زندہ رہے گا تو کفر کرے گا قضیہ شرطیہ صحیح ہے اور اس سے علم متحقق ہوتا ہے) واللہ اعلم۔

اگر یہ کہا جائے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے لئے لزوم اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ دونوں چیزوں میں سے ایک چیز دوسری کے لئے علت تامہ ہو۔ یا وہ دونوں چیزیں معلول ہوں اور ایک تیسری چیز دونوں کے لئے علت تامہ ہو۔ پس بچہ کے زندہ رہنے کی صورت میں اس کے کفر کے لزوم کی وجہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس لزوم کی وجہ وہ ہے جو صوفیاء کرام نے بیان فرمائی ہے کہ خارج میں تمام اشیاء کے وجود ان اعیان ثابتہ کے عکس اور ظل ہیں جو اللہ تعالیٰ کی صفات کے پرتو ہیں۔ جب اعیان ثابتہ علم کے مرتبہ میں ہیں۔ تو اسی لئے صوفیاء فرماتے ہیں۔ معلوم علم کے تابع ہے۔ پھر صفات الٰہیہ اللہ تعالیٰ کے ہادی اور مضل ہونے کی طرف راجع اور تقسیم ہوتی ہیں۔ پس وہ اشیاء جن کا مبداء تعین ہدایت ہے ان کے وجود کے لئے ہدایت کا ظہور لازم ہے۔ ان کا خاتمہ یقیناً سعادت پر ہوگا (یعنی جس شخص پر صفت الٰہیہ ہادی کا عکس پڑے گا تو یقیناً اسے ہدایت نصیب ہوگی اور اس کا خاتمہ بالخیر ہوگا) اور وہ چیزیں جن کا مبدء تعین صفت ضلالۃ ہو تو ان کے وجود کے لئے شقاوت کا ظہور لازمی ہوگا۔ اور ان کا خاتمہ شقاوت پر ہوگا۔ ان چیزوں سے ہدایت متصور ہی نہیں ہو سکتی۔ (یعنی جس شخص پر اس کی صفت ضلالت کا سایہ وعکس پڑے گا وہ یقیناً بدبخت ہوگا) حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد كُلٌّ مُيَسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهٗ۔ (ہر ایک کے لئے وہ آسان کر دیا جاتا ہے جو اس کے لئے پیدا کیا گیا ہے) کا یہی مطلب ہے۔ پس جو اہل سعادت سے ہوگا اس کے لئے سعادت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے اور جو اہل شقاوت سے ہوگا اس کے لئے اہل شقاوت کے اعمال آسان کر دیئے جائیں گے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی حدیث متفق علیہ ہے۔ اور حضرت علی سے مروی ہے۔ پس اس بچہ کی کفر پر پیدائش کا مطلب یہ ہے کہ اس کا مبدء تعین صفت ضلال تھی (اس لئے اس نے بڑا ہو کر بھی گمراہ ہی رہنا تھا) پس اس میں گمراہی کے اثر کے ظہور سے پہلے بچپن میں اس کا وفات پا جانا اس کے لئے اور اس کے والدین کے لئے بہتر تھا۔ اور یہ اس کے والدین پر اللہ کی طرف سے مہربانی اور بندہ نوازی تھی۔ اس طرح نہیں جیسا کہ معتزلہ کہتے ہیں کہ جو کام بندے کی اصلاح کا باعث ہے اس کا کرنا اللہ تعالیٰ پر واجب ہے' کیونکہ اگر اس طرح

معاملہ ہوتا تو کوئی کافر بھی نہ پایا جاتا کیونکہ اس کا بچپن میں اللہ تعالیٰ پر مارنا واجب ہوتا۔ واللہ اعلم۔

فَاَرَدْنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً وَّ اَقْرَبَ رُحْمًا ﴿۸۱﴾

''پس ہم نے چاہا کہ بدلہ دے انہیں ان کا رب (ایسا بیٹا) جو بہتر ہو اس سے پاکیزگی میں اور (ان پر) زیادہ مہربان ہو۔1''

1۔ فاردنا کا معنی شاید یہ ہو کہ ہم نے خواہش کی اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی۔ کیونکہ بندے کے ارادہ کا تعلق اللہ کے فعل سے ممکن نہیں ہے، حضرت خضر علیہ السلام نے یہاں ارادہ کی نسبت اپنی طرف بھی کی ہے اور جمع کا صیغہ ذکر کر کے اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی ہے، کیونکہ تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے اس کا بدل عطا کرنے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ہلاک کرنا خضر علیہ السلام کے کسب سے پایا گیا اور ایجاد خالصۃً اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا۔ پس دونوں نسبتیں صحیح ہیں۔ ابوجعفر، نافع اور ابوعمرو نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ یبدل پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ دونوں کا معنی ایک ہے۔ بعض علماء نے تبدیل اور ابدال کے معنی میں فرق کیا ہے۔ فرماتے ہیں تبدیل یہ ہے کہ کسی چیز کا عین قائم ہو اور اسکی حالت کو بدل دیا جائے اور ابدال یہ ہے کہ ایک چیز کو اٹھا دینا اور دوسری چیز کو اس کے قائم مقام رکھنا (1)۔ میں کہتا ہوں اس فرق کی کوئی حقیقت نہیں ہے کیونکہ اگر معاملہ اس طرح ہوتا تو دونوں قراءتوں کا جمع کرنا متصور نہ ہوتا، جبکہ دونوں قراءتیں متواتر بھی ہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو اس بیٹے کا بدل ایک بیٹا عطا فرمائے گا جو گناہوں کی غلاظت سے پاک ہو اور برے اخلاق سے منزہ ہو۔ اور والدین پر زیادہ مہربان ہو۔ ابن عامر، ابوجعفر اور یعقوب نے رحما کو حاء کے ضمہ کے ساتھ، جبکہ دوسرے قراء نے حاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحما، رحم اور قرابت سے ہے۔ قتادہ نے یہ معنی کیا ہے صلہ رحمی کرنے والا ہو اور والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والا ہو۔ زکوٰۃ اور رحماً پر نصب تمیز ہونے کی بناء پر ہے اور ان کا عامل اسم تفضیل خیر اور اقرب ہیں۔ امام بغوی نے کلبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بچہ کے بدلہ میں انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی جس سے ایک نبی نے شادی کی تھی پھر اس سے ایک نبی پیدا ہوا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ نے ایک امت کو اس کے ذریعے ہدایت عطا فرمائی تھی (2)۔

حضرت جعفر بن محمد رحمۃ اللہ علیہما سے مروی ہے، فرمایا اللہ نے انہیں ایک بیٹی عطا فرمائی تھی۔ جس سے ستر نبی پیدا ہوئے تھے۔ ابن جریج نے لکھا ہے کہ ایک مسلمان بچہ عطا فرمایا تھا (3)۔

ابن ابی شیبہ، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے عطیہ سے اس طرح نقل کیا ہے۔ ان کو بیٹی عطا کی گئی تھی جس نے نبی کو جنا تھا (4)۔

ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح نقل کیا ہے۔ ابن المنذر نے بسطام بن جمیل عن یوسف بن عمر کے طریق سے اس طرح روایت کیا ہے کہ اللہ نے بیٹے کی جگہ بیٹی عطا فرمائی تھی جس نے کئی انبیاء کو جنم دیا تھا (4)۔ امام بخاری نے اپنی تاریخ میں، ترمذی، حاکم نے حضرت ابو درداء کے واسطہ سے نبی کریم ﷺ سے اس حدیث کو نقل کیا ہے۔ مطرف فرماتے ہیں اس بچہ کی پیدائش پر والدین خوش ہوئے تھے اور اسکے قتل پر غمگین ہوئے تھے۔ اگر وہ بچہ زندہ رہتا تو اس کے ہاتھوں دونوں ماں باپ کی ہلاکت ہوتی۔ پس انسان کو راضی بقضاء الٰہی ہونا چاہئے کیونکہ ناپسندیدہ امر میں مومن کے لئے قضاء الٰہی بہتر ہوتی ہے بنسبت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 431 (العلمیہ)

پسندیدہ امر کے(1)۔ میں کہتا ہوں پسندیدہ اور ناپسندیدہ ہر امر میں انسان کو اللہ تعالیٰ کی آزمائش سے ڈرنا چاہئے اور اس سے پناہ طلب کرے، اس کی رحمت کی امید رکھے۔ ہرصورت میں قضاء الٰہی سے خوش اور راضی رہے' اعتراض کی زبان نہ کھولے۔

وَ اَمَّا الْجِدَارُ فَكَانَ لِغُلٰمَیْنِ یَتِیْمَیْنِ فِی الْمَدِیْنَةِ وَ كَانَ تَحْتَهٗ كَنْزٌ لَّهُمَا وَ كَانَ اَبُوْهُمَا صَالِحًا ۚ فَاَرَادَ رَبُّكَ اَنْ یَّبْلُغَاۤ اَشُدَّهُمَا وَ یَسْتَخْرِجَا كَنْزَهُمَا ۖۗ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ۚ وَ مَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ ذٰلِكَ تَاْوِیْلُ مَا لَمْ تَسْطِعْ عَّلَیْهِ صَبْرًا ﴿۸۲﴾

''باقی رہی دیوار (تو اس کی حقیقت یہ ہے کہ) وہ شہر کے دو یتیم بچوں کی تھی اور اس کے نیچے ان کا خزانہ (دفن) تھا۔ ۱؎ اور ان کا باپ بڑا نیک شخص تھا۔ ۲؎ پس آپ کے رب نے ارادہ فرمایا کہ وہ دونوں بچے اپنی جوانی کو پہنچیں اور نکال لیں اپنا دفینہ۔ ۳؎ یہ (ان پر) ان کے رب کی خاص رحمت تھی۔ ۴؎ اور (جو کچھ میں نے کیا) میں نے اپنی مرضی سے نہیں کیا یہ حقیقت ہے ان امور کی جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔ ۵؎''

۱؎ امام بغوی نے ان یتیم بچوں کے نام اصرم اور صریم لکھے ہیں(3) اور وہ خزانہ بقول عکرمہ کوئی مال تھا۔ بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ترمذی' حاکم نے ابی الدرداء کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ وہ مال سونا اور چاندی تھا(4)۔ طبرانی نے ابوالدرداء سے اس آیت کے تحت روایت کیا ہے کہ پہلے لوگوں کے لئے سونا چاندی حلال تھے اور مال غنیمت حرام تھا اور ہمارے لئے غنائم حلال ہیں اور سونا چاندی (مردوں کے لئے) حرام ہے۔ میں کہتا ہوں سونے چاندی کے ہم پر حرام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہم سونے چاندی کو خزانہ کریں اور ان کی زکوٰۃ ادا نہ کریں تو ہم پر حرام ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ وَالَّذِیْنَ یَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَ الْفِضَّةَ وَ لَا یُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ۔ اور جو لوگ جوڑ کر رکھتے ہیں سونا اور چاندی اور نہیں خرچ کرتے اسے اللہ کی راہ میں تو انہیں خوشخبری سنا دیجئے دردناک عذاب کی۔

حضرت ابن عباس اور ابن عمر نے فرمایا ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا کی گئی ہو وہ کنز کے زمرہ میں نہیں آتا اگرچہ وہ مدفون بھی ہو۔ اور ہر وہ مال جس کی زکوٰۃ ادا نہ کی گئی ہو وہ کنز ہے اگرچہ مدفون نہ بھی ہو۔ شاید اس وقت اس شہر والوں پر زکوٰۃ واجب نہ ہو اسی وجہ سے فرمایا گیا اُحِلَّتْ لَهُمُ الْكُنُوْزُ کہ ان کے لئے کنز حلال تھے۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ سعید بن جبیر سے مروی ہے، فرماتے ہیں کنز سے مراد ایک صحیفہ ہے جس میں علم (کا خزانہ) تھا(5)۔ حاکم نے ابن عباس سے روایت کیا ہے اور اس اثر کو صحیح بھی کہا ہے کہ وہ خزانہ نہ سونا تھا، نہ چاندی تھا بلکہ علم کے صحائف (کتابیں) تھے۔ ابن ابی حاتم نے ربیع بن انس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی نے یہ بھی لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ وہ ایک سونے کی تختی تھی جس پر لکھا تھا کہ تعجب ہے اس شخص پر جو موت پر یقین بھی رکھتا ہے اور پھر وہ خوش رہتا ہے' حیرت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر پر یقین بھی رکھتا ہے تو تھکاوٹ کیسے برداشت کرتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو رزق کے ملنے کا یقین رکھتا ہے تو اپنے آپ کو مشقت میں کیسے ڈالتا ہے۔ تعجب ہے اس شخص کے لئے جو حساب کا یقین رکھتا ہے تو غافل کیسے ہوتا ہے۔ تعجب ہے اس پر جو دنیا کی زوال پذیری کا یقین رکھتا ہے' تو دنیا پر مطمئن کیسے ہوتا ہے۔ لا الله

1۔ الدرالمنثور، جلد 4، صفحہ 431 (العلمیہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 430 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر)
4۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 591 (الفکر) 5۔ جامع ترمذی، جلد 2، صفحہ 144 (وزارت تعلیم)

الا اللّٰه محمد رسول اللّٰه۔ اور دوسری جانب یہ لکھا تھا اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا وَحْدِیْ لَا شَرِیْکَ لِیْ خَلَقْتُ الْخَیْرَ وَالشَّرَّ فَطُوْبٰی لِمَنْ خَلَقْتُهٗ لِلْخَیْرِ وَاَجْرَیْتُهٗ عَلٰی یَدَیْهِ وَوَیْلٌ لِّمَنْ خَلَقْتُهٗ لِلشَّرِّ وَاَجْرَیْتُهٗ عَلٰی یَدَیْهِ(1)

''میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی الٰہ نہیں میں وحدہ لاشریک ہوں میں نے ہی خیر وشر کو پیدا فرمایا' مبارک ہو اسے جسے میں نے خیر کے لئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں خیر کو جاری فرمایا اور ہلاکت ہے اس کے لئے جسے میں نے برائی کیلئے پیدا فرمایا اور اس کے ہاتھوں برائی کو جاری کیا۔''

بزار نے بھی اسی طرح ضعیف سند کے ساتھ ابوذر سے مرفوعاً نقل کی ہے لیکن مختصر ہے۔ الخرائطی نے قمع الحرص میں ابن عباس سے موقوف نقل کی ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت علی سے مرفوع نقل کی ہے۔ بزار نے ابی ذر سے مرفوع روایت کی ہے۔ زجاج کہتے ہیں کنز کا لفظ جب مطلق بولا جائے تو مال کا خزانہ مراد ہوتا ہے اور تقیید کی صورت میں یہ کہنا جائز ہے کہ اس کے پاس علم کا خزانہ ہے۔ وہ تختی ان دونوں چیزوں (مال اور علم) کی جامع تھی کیونکہ وہ خود سونے کی تھی اور اس پر علم کے شاہپارے بھی تھے(2)۔

2۔ اور ان یتیموں بچوں کا باپ ایک نیک آدمی تھا جس کا نام کاشح تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے فرمایا اپنے باپ کے تقویٰ اور صلاح کی وجہ سے ان یتیموں کے مال کی حفاظت کی گئی تھی(3) یعنی اللہ تعالیٰ نے خضر علیہ السلام کو دیوار کی اصلاح کرنے کا حکم دیا تھا تاکہ بچوں کا خزانہ محفوظ رہے اور یہ بندہ نوازی اور شفقت و رحمت صرف ان کے باپ کے نیک اور صالح ہونے کی وجہ سے تھی۔ محمد بن المنکدر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندے کی صلاح اور تقویٰ کی وجہ سے اس کی اولاد' اولاد کی اولاد اور اس کے خاندان کی حفاظت فرماتا ہے اور جب تک وہ نیک صالح بندہ کسی مقام پر سکونت پذیر رہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے پڑوسیوں کی بھی حفاظت فرماتا ہے۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں میں نماز پڑھتا ہوں تو مجھے اپنے بچے یاد آجاتے ہیں اور میں اپنی نماز میں اضافہ کرتا ہوں(4)۔

بعض علماء فرماتے ہیں ان یتیم بچوں اور ان کے نیک باپ کے درمیان سات پشتوں کا واسطہ تھا۔ ابن ابی حاتم نے بقیہ عن سلیمان بن سلیم ابی سلمہ کے طریق سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں تورات میں لکھا ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی اپنے نیک بندے کی وجہ سے سات صدیوں (یعنی سات پشتوں) تک حفاظت فرماتا ہے اور کسی ایک کی ستم شعاری اور کارستانی کی وجہ سے سات نسلوں کو ہلاک کرتا ہے(5)۔

اس آیت کریمہ میں دلیل ہے کہ مومنین پر حق ہے کہ وہ نیک لوگوں کی اولاد کی دیکھ بھال کریں جب تک کہ ان سے سرکشی اور کفر کا صدور نہ ہو' اگر ان سے دین سے انحراف اور کفر کا صدور ہو تو سزا کے بھی زیادہ مستحق ہیں جیسا کہ سابقہ آیت اس قول کی دلیل ہے اما الغلام فکان ابواہ مومنین الایہ۔ یعنی نیک والدین کا بیٹا مجرم اور طاغی تھا تو حضرت خضر علیہ السلام نے بحکم الٰہی اسے قتل کی سزا دی۔

3۔ یعنی رب کریم نے ان کے بلوغت اور جوانی کی عمر کو پہنچنے کا ارادہ فرمایا۔ رشد کی عمر سے مراد بقول بعض علماء اٹھارہ سال ہے اور میرے نزدیک چالیس سال ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۔ ترجمہ: یہاں تک کہ جب وہ اپنی پوری قوت کو پہنچا اور چالیس برس کا ہو گیا۔ ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا صحیح اور ظاہر مذہب پچیس سال ہے کیونکہ جب بیوقوف' کم عقل شخص پچیس سال کا ہو جائے تو امام صاحب کے نزدیک اس کا مال اس کے حوالہ کر دیا جائے گا۔ ارشاد ہے فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۔ پس اگر محسوس کرو تم ان میں دانائی تو لوٹا دو انہیں ان کے مال۔

4۔ رحمۃً پر نصب یبلغا کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر ہے یا مصدر ہونے یا مفعول لہ ہونے کی بناء پر ہے کیونکہ خیر کا ارادہ رحمت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 591 (الفکر) 2۔ ایضاً صفحہ 592 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً 5۔ ایضاً

ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں رحمۃ کا تعلق فعل محذوف سے ہے جس کی تقدیر یہ ہے فَعَلْتُ مَا فَعَلْتُ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اولاً ارادہ کی نسبت حضرت خضر علیہ السلام نے اپنی طرف کی اور فرمایا فاردت ان اعیبھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عیب کرنے کا عمل براہ راست آپ کے ساتھ تھا۔ اور دوسری صورت میں ارادہ کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف بھی کی اور اپنی طرف بھی کی فرمایا فَاَرَدْنَاۤ اَنْ یُّبْدِلَهُمَا رَبُّهُمَا خَیْرًا مِّنْهُ زَكٰوةً۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسمیں تبدیلی غلام کے ہلاک کرنے اور اللہ تعالیٰ کے بدل پیدا کرنے کے ساتھ تھی۔ تیسری صورت میں ارادہ کی نسبت صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ فاراد ربک ان یبلغا۔ اسکی وجہ یہ ہے بچوں کو حد بلوغت تک پہنچانے میں خضر علیہ السلام کا کوئی دخل نہیں تھا۔ یا ان تینوں توجیہات میں اسلوب بیان کے مختلف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا فعل چونکہ فی نفسہ شر اور مذموم تھا (کشتی توڑنا) اس لئے اس کی نسبت اپنی طرف کی اور تیسرا فعل (دیوار بنانا) سراپا خیر تھا اسلئے اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کر دی، جبکہ دوسرا فعل غلام کو قتل کرنا اس کے دو پہلو تھے ایک کے اعتبار سے خیر تھا (والدین کو نیک اولاد ملنی تھی) اور ایک اعتبار سے شر تھا (معصوم بچے کو قتل کرنا) اس لئے جمع کا صیغہ ذکر فرما کر اللہ تعالیٰ اور اپنی طرف نسبت کر دی۔ (تا کہ خیر کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہو اور شر کی نسبت اپنی طرف ہو) اہل ادب و عرفان ہمیشہ خیر وشر کے ذکر کے موقع پر ایسا ہی انداز ادب اپناتے ہیں) یا نسبتوں کے اختلاف کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ واسطوں کی طرف توجہ کرنے میں عارف کا حال مختلف ہوتا ہے(1) (یعنی کبھی عارف کی توجہ سبب اور واسطہ کی طرف ہوتی ہے، کبھی صرف اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے جو اسباب و وسائط کو پیدا کرنے والا ہے اور کبھی واسطہ اور اللہ تعالیٰ دونوں کی طرف ہوتی ہے) واللہ اعلم۔

۵۔ جو کچھ تو نے مجھ سے افعال سرزد ہوتے دیکھے ہیں کشتی کا توڑنا، بچہ کو قتل کرنا اور دیوار بنانا یہ سب میں نے اپنی فکر اور رائے کی بناء پر نہیں کئے بلکہ یہ سب کچھ میں نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کیا ہے۔ لم تسطع اصل میں تستطع تھا تخفیفاً تاء استفعال کو حذف کیا گیا ہے۔ اس کا معنی طاقت نہ رکھنا ہے۔

علامہ بغوی لکھتے ہیں روایت میں آیا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام حضرت خضر علیہ السلام سے علیحدہ ہونے لگے تو خضر علیہ السلام سے کہا جناب مجھے کوئی وصیت فرمائیے۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا علم صرف لوگوں کے سامنے بیان کرنے کے لئے حاصل نہ کرو بلکہ اس پر عمل کرنے کیلئے حاصل کرو(2)۔

امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں خضر و کلیم علیہما السلام کے واقعہ سے چند فوائد ملتے ہیں۔

1۔ انسان کو اپنے علم پر غرور نہیں کرنا چاہئے۔ 2۔ اگر کوئی غیر پسندیدہ کام نظر آئے تو جھٹ سے اعتراض نہیں جڑ دینا چاہئے کیونکہ ہو سکتا ہے اس میں کوئی ایسی حقیقت پوشیدہ ہو جس کی اسے خبر نہ ہو۔ میں کہتا ہوں خصوصاً جب کسی عالم دین، عارف کامل، متقی و پرہیزگار سے کوئی غیر پسندیدہ امر نظر آئے تو اس کا فوراً انکار کرنا اور زیادہ غیر مناسب اور سوءادب ہے جیسا کہ ہم نے ابھی ذکر کیا ہے 3۔ ہمیشہ علم و عرفان کے موتی تلاش کرتے رہنا چاہئے(3)۔

4۔ استاد اور مرشد کے سامنے نہایت عجز و انکسار سے رہنا چاہئے۔ ان سے گفتگو اور بات کرتے وقت ادب کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوٹنا چاہئے۔ 5۔ مجرم کو اپنے جرم پر تنبیہ کرنی چاہئے اور پھر عفو و درگزر کر دینا چاہئے۔ لیکن جب مجرم سے بار بار اس فعل کا ارتکاب ہو تو

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد3، صفحہ 518 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد3، صفحہ 592 (الفکر)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی، جلد3، صفحہ 581 (الفکر)

اس سے علیحدگی اختیار کرنی چاہئے۔

امام بغوی فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ خضر علیہ السلام بقید حیات ہیں یا موت کا ذائقہ چکھ چکے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زندہ ہیں اور ہر سال حج کے موقع پر ملاقات کرتے ہیں اور خضر علیہ السلام کی زندگی کا سبب یہ ہے کہ آپ نے آب حیات پی لیا تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ ذوالقرنین بادشاہ آب حیات کی تلاش میں تاریکی کے اندر داخل ہوا تھا اور خضر علیہ السلام ان کے آگے آگے تھے۔ خضر علیہ السلام آب حیات کے چشمہ پر پہنچ گئے تھے، آپ نے اس سے غسل بھی کیا تھا۔ اسے نوش بھی فرمایا تھا اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے لئے نوافل بھی پڑھے تھے۔ لیکن ذوالقرنین پیچھے سے راستہ بھول گیا تھا اور واپس لوٹ آیا تھا۔

بعض علماء فرماتے ہیں کہ خضر علیہ السلام کا وصال ہو گیا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَا جَعَلْنَا لِبَشَرٍ مِّنْ قَبْلِكَ الْخُلْدَ۔

ایک دفعہ عشاء کی نماز کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے تمہاری یہ رات (لیلۃ القدر) دکھائی گئی ہے، آج جو لوگ سطح زمین پر زندہ ہیں سو سال بعد کوئی ایک بھی زندہ نہ رہے گا(1)۔ میں کہتا ہوں صاحب الحصین نے التغریہ میں ذکر کیا ہے، مستدرک للحاکم میں حضرت انس سے مروی ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کا وصال ہوا تو ایک شخص آیا جس کی داڑھی سفید تھی۔ جسم صبیح (وملیح) تھا۔ وہ لوگوں کی گردنیں پھلانگ کر آگے آیا اور رونے لگا پھر صحابہ کرام کی طرف متوجہ ہو کر یوں خطاب فرمایا اللہ تعالیٰ ہر مصیبت پر تسلی دیتا ہے۔ ہر فوت شدہ کا نعم البدل عطا فرماتا ہے۔ اور ہر ہلاک ہونے والے کا جانشین بناتا ہے پس تم لوگ اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ اور اس کی طرف رغبت کرو، وہ تمہیں اس مصیبت میں گرفتار دیکھ رہا ہے۔ دیکھو دکھ اس شخص پر ہے جس کی کمی کو پورا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ خطاب کرنے کے بعد وہ شخص واپس چلا گیا۔ حضرت ابوبکر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما نے فرمایا یہ خضر علیہ السلام تھے۔

اولیاء کرام کی خضر علیہ السلام سے ملاقاتیں اور ان سے فیض یاب ہونے کی روایتیں مشہور ہیں۔ آپ کی زندگی پر یہ سب باتیں دلیل ہیں۔ لیکن ظاہر یہ ہے کہ اگر خضر علیہ السلام نبی کریم ﷺ کے زمانہ میں زندہ ہوتے تو وہ آپ کی صحبت سے جدا نہ رہتے کیونکہ آپ ﷺ تمام لوگوں کی طرف مبعوث کئے گئے تھے۔ اسی وجہ سے حضور علیہ السلام نے فرمایا اگر موسیٰ علیہ السلام زندہ ہوتے تو میری اتباع کے سوا انہیں کوئی گنجائش نہ ہوتی۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت جابر سے روایت کیا ہے۔ فرمایا عیسیٰ بن مریم آسمان سے اتریں گے اور مسلمانوں کے ایک شخص (مہدی علیہ السلام) کی اقتداء کریں گے اسی طرح مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور جابر سے روایت کی ہے۔

اس مسئلہ کا حل حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے کلام کے بغیر ممکن نہیں۔ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ سے حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق پوچھا گیا کہ وہ زندہ ہیں یا وفات پا گئے ہیں تو وہ حقیقت حال کے انکشاف کے لئے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں متوجہ ہوئے۔ حضرت مجدد نے دیکھا کہ خضر علیہ السلام ان کے سامنے کھڑے ہیں، آپ نے ان سے ان کی حقیقت حال دریافت کی تو آپ نے فرمایا میں اور الیاس زندوں میں سے نہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ہماری روحوں کو ایسی قوت بخشی ہے جس سے ہم مجسم ہو جاتے ہیں اور زندہ لوگوں جیسے کام کرتے ہیں مثلاً جب اللہ تعالیٰ چاہے تو ہم گمراہوں کی راہنمائی کرتے ہیں، مصیبت زدوں کی مدد کرتے ہیں۔ علم لدنی کی تعلیم دیتے ہیں اور جس کے متعلق اللہ تعالیٰ کا جو ارادہ ہو اسے روحانی نسبت بھی عطا کرتے ہیں۔ اولیاء اللہ میں سے جو قطب مدار ہوتا ہے ہمیں اس کا معاون بنایا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جسے مدار عالم بنایا ہے اس کی برکت سے عالم کی بقاء ہے۔ اس زمانہ میں یمن

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 592 (الفکر)

کے ایک بزرگ قطب مدار ہیں جو مذہباً شافعی ہیں۔ ہم ان کے ساتھ شافعی مذہب کے مطابق نماز ادا کرتے ہیں۔ اس کشف صحیح سے مختلف اقوال کا اختلاف اٹھ جاتا ہے اور اشکال ختم ہو جاتا ہے۔ سب تعریفیں اللہ کیلئے ہیں جو بلند و بالا ہے۔

وَيَسْـَٔلُوْنَكَ عَنْ ذِى الْقَرْنَيْنِ ۖ قُلْ سَاَتْلُوْا عَلَيْكُمْ مِّنْهُ ذِكْرًا ﴿٨٣﴾

''اور وہ دریافت کرتے ہیں آپ سے ذی القرنین کے متعلق۔ [1] فرمائیے میں ابھی بیان کرتا ہوں تمہارے سامنے اس کا حال۔ [2]''

[1] یہود یا مشرکین مکہ آپ سے آزمائش کی خاطر ذی القرنین کے متعلق پوچھتے ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں اسکے نام کے متعلق اختلاف ہے، بعض علماء نے فرمایا اس کا نام مرزبان بن مرزبہ الیونانی ہے جو یافث بن نوح علیہ السلام کی نسل سے تھا (1)۔ بعض نے اس کا نام اسکندر بن فیلیس بن فیلقوس الرومی ذکر کیا ہے۔ میرے نزدیک یہ دوسرا قول اصح ہے کیونکہ ابن اسحٰق' ابن المنذر' ابن ابی حاتم اور الشیرازی نے الالقاب میں اور ابوالشیخ نے وہب بن منبہ الیمانی سے روایت کیا ہے اور وہب تاریخی باتوں کا بہت بڑا عالم تھا۔ انہوں نے فرمایا ذوالقرنین روم کا ایک شخص تھا جو ایک بوڑھی عورت کا بیٹا تھا۔ جس کی ذوالقرنین کے علاوہ اور کوئی اولاد نہ تھی۔ اور اس کا نام اسکندر تھا۔ ابن المنذر نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے فرمایا سکندر ہی ذوالقرنین ہے (2)۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس کی نبوت میں بھی اختلاف ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نبی تھا۔ ابوالطفیل فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا گیا ذوالقرنین نبی تھا یا بادشاہ۔ آپ نے فرمایا وہ نہ نبی تھا نہ بادشاہ لیکن وہ ایسا بندہ تھا جو اللہ سے محبت کرتا تھا اور اللہ اس سے محبت کرتا تھا۔ وہ اللہ کے لئے پرخلوص تھا اور اللہ اس کے خلوص کی قدر دانی فرماتا تھا (3)۔ میں کہتا ہوں اسی طرح ابن مردویہ نے سالم بن ابی الجعد سے روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے ذوالقرنین کے متعلق پوچھا گیا کہ کیا وہ نبی تھے تو آپ نے فرمایا میں نے نبی کریم ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا بندہ تھا جو پیکر اخلاص تھا اور اللہ تعالیٰ اس کے اخلاص کی قدر فرماتا تھا (4)۔

امام بغوی فرماتے ہیں روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک شخص کو سنا کہ وہ دوسرے کو ذوالقرنین کے لقب سے پکار رہا تھا۔ آپ نے فرمایا پہلے تم نے انبیاء کرام کے اسماء کے ساتھ اپنے نام رکھے، اس پر بھی اکتفاء نہ کیا حتیٰ کہ تم نے فرشتوں کے اسماء کے ساتھ نام رکھنے شروع کر دیئے ہیں (5)۔ اکثر علماء کا خیال ہے کہ وہ نیک عادل بادشاہ تھا۔

امام بغوی فرماتے ہیں ذوالقرنین نام رکھنے کے سبب میں بھی اختلاف ہے۔ زہری فرماتے ہیں وہ سورج کے دونوں کناروں مشرق و مغرب تک پہنچا تھا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ روم اور فارس کا بادشاہ تھا اس لئے اس نام سے ملقب تھا۔ بعض فرماتے ہیں وہ نور اور تاریکی میں داخل ہوا اس لئے اسے ذوالقرنین کہا جاتا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس نے خواب میں سورج کے دونوں کناروں کو پکڑتے ہوئے دیکھا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اس کے سر پر خوبصورت مینڈھیاں تھیں۔ بعض فرماتے ہیں اس لئے کہ اس کے سر پر دو سینگ تھے جن کو وہ پگڑی کے ذریعے چھپائے رکھتا تھا (6)۔ میں کہتا ہوں ابن عبدالحکیم نے یونس بن عبیدہ اور شیرازی نے القاب میں قتادہ سے اس طرح روایت کیا ہے۔ ابوالطفیل نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ اس کو ذوالقرنین اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس نے اپنی قوم کو تقویٰ کا حکم دیا۔ قوم نے اس کے سر کے دائیں طرف چوٹ لگائی تو وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 438 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر)
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 435 (العلمیہ) 5۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر) 6۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 593 (الفکر)

مر گیا پھر اللہ تعالیٰ نے اسے زندہ کر دیا پھر اس نے قوم کو تقویٰ کا حکم دیا تو قوم نے اس کے سر پر بائیں طرف ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے پھر زندہ کر دیا۔

امام احمد نے الزہد میں، ابن المنذر، ابن ابی حاتم اور ابو الشیخ نے العظمۃ میں ابو الورقاء سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پوچھا ذوالقرنین کے سینگ کس کے تھے۔ فرمایا شاید تمہارا خیال ہے کہ اس کے سینگ سونے اور چاندی کے تھے۔ وہ نبی تھے، اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث فرمایا تھا۔ انہوں نے قوم کو اللہ تعالیٰ کی توحید کی دعوت دی تو ایک شخص اٹھا اور اس نے انکے سر کی بائیں جانب ضرب لگائی جس کی وجہ سے وہ مر گئے۔ اللہ نے پھر انہیں زندہ فرما دیا پھر اللہ نے انہیں لوگوں کی طرف مبعوث کیا (انہوں نے دعوت توحید دی) ایک شخص اٹھا اور دائیں جانب چوٹ لگائی اور وہ فوت ہو گئے۔ پس اللہ نے ان کا نام ذوالقرنین رکھ دیا (1)۔

۲۔ علیکم کا خطاب سائلین یعنی سوال کرنے والوں کو ہے۔ منہ ذی القرنین سے حال ہے یا اللہ تعالیٰ سے حال ہے۔ اور ذکر کا معنی خبر ہے۔

إِنَّا مَكَّنَّا لَهُ فِي الْأَرْضِ وَآتَيْنَاهُ مِنْ كُلِّ شَيْءٍ سَبَبًا ﴿٨٤﴾

''ہم نے اقتدار بخشا تھا اسے زمین میں ۱؎ اور ہم نے دیا تھا اسے ہر چیز (تک رسائی حاصل کرنے) کا ساز و سامان ۲؎''

۱؎ یعنی ہم نے اسے زمین میں تصرف کا اختیار بخشا۔ جیسے چاہے اس میں تصرف کرے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی علیہ السلام نے فرمایا اللہ نے بادل کو اس کے لئے مسخر کر دیا تھا اور اس پر وہ سوار ہوتے تھے اور اس کو سارے اسباب عطا فرمائے تھے۔ اس کے لئے نور کو پھیلا دیا تھا اس لئے دن اور رات اس کے لئے برابر روشن ہوتے تھے۔ تمکن فی الارض کا یہی مطلب ہے اور زمین میں چلنا اس کے لئے آسان کر دیا تھا اور راستے اس کے لئے ہموار کر دیئے تھے (2)۔

۲؎ سب چیزیں ہم نے اسے عطا کی تھیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ مخلوق جس جس چیز کی محتاج ہوتی ہے ہم نے وہ سب اسے عطا کر دی تھیں۔ بعض علماء نے یہ معنی لکھا ہے کہ بادشاہوں کو شہروں کے فتح کرنے اور دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لئے جس جس ہتھیار کی ضرورت ہوتی ہے وہ ہم نے اسے عطا کر دی تھی۔ سبباً سے مراد علم، قدرت اور آلات ہیں جن کے ذریعے وہ ہر چیز تک رسائی حاصل کرتا تھا۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت الحسن نے اس کا معنی بلاغاً الی حیث اراد کیا ہے، یعنی جہاں وہ پہنچنے کا ارادہ کرتا تھا ہم اسے پہنچنے کے سارے اسباب مہیا کر دیتے تھے۔ بعض فرماتے ہیں یہ مطلب ہے کہ ہم نے زمین کے کناروں کو اس کے قریب کر دیا تھا (3)۔

فَأَتْبَعَ سَبَبًا ﴿٨٥﴾

''پس وہ روانہ ہوا ایک راہ پر ۱؎''

۱؎ اہل حجاز اور بصریوں نے فاتبع پڑھا ہے، یعنی تینوں مقامات پر ہمزہ وصلی اور تشدید کے ساتھ باب افتعال سے پڑھا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے باب افعال سے ہمزہ قطعی اور تاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 436 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 94-593 (الفکر) 3۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

امام بغوی فرماتے ہیں ان دونوں کا معنی ایک ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ان کے معانی کے درمیان فرق ہے۔ہمزہ قطعی کی صورت میں اس کا معنی پالینا اور لاحق ہونا ہے اور باب افتعال سے تشدید کی صورت میں اس کا معنی سار یعنی چلنا ہے۔عرب کہتے ہیں ما زلت اتبعتہ حتی اتبعتہ یعنی میں اس کے پیچھے چلتا رہا حتی کہ میں نے اسے پالیا(1)۔اصمعی سے اسی طرح مروی ہے۔سبباً کا معنی راستہ ہے۔ ابن عباس نے اس کا معنی منزل کیا ہے۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَغْرِبَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَغْرُبُ فِيْ عَيْنٍ حَمِئَةٍ وَّ وَجَدَ عِنْدَهَا قَوْمًا ۬ؕ قُلْنَا يٰذَا الْقَرْنَيْنِ اِمَّاۤ اَنْ تُعَذِّبَ وَ اِمَّاۤ اَنْ تَتَّخِذَ فِيْهِمْ حُسْنًا ۝

''یہاں تک کہ جب وہ غروب آفتاب کی جگہ پہنچا تو اس نے اسے یوں پایا گویا وہ ڈوب رہا ہے ایک سیاہ کیچڑ کے چشمہ میں 1 اور اس نے وہاں ایک قوم پائی 2 ہم نے کہا اے ذوالقرنین! (تمہیں اختیار ہے) خواہ تم انہیں سزا دو خواہ ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو 3''

1 مغرب الشمس سے مراد قابل رہائش زمین کی انتہا ہے جو مغرب کی جانب تھی۔ابوجعفر،ابن عامر،حمزہ،کسائی اور ابو بکر نے حمیة یعنی رامیہ کے وزن پر ہمزہ کے بغیر الف کے ساتھ پڑھا ہے جس کا معنی گرم ہے،باقی قراء نے بغیر الف کے ملئہ کے وزن پر مہموز پڑھا ہے۔اور یہ حمئت البئر سے مشتق ہے جب کنویں کی مٹی سیاہ ہو جائے۔تو حمئة کا معنی سیاہ کیچڑ ہے۔دونوں قرأتوں کے درمیان معنوی طور پر کوئی مخالفت نہیں ہے کیونکہ ہوسکتا ہے کہ وہ چشمہ دونوں وصفوں کا حامل ہو (گرم بھی ہو اور سیاہ بھی ہو) اور یہ بھی جائز ہے کہ حامئة کی یاء ہمزہ سے بدل کر آئی ہو کیونکہ اس کا ماقبل کسرہ ہے۔اس صورت میں دونوں قراتیں متحد ہو جائیں گی یعنی سیاہ کیچڑ والا چشمہ مراد ہوگا۔امام بغوی فرماتے ہیں حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کعب سے پوچھا تورات میں کیا ہے کہ سورج کہاں غروب ہوتا ہے۔انہوں نے فرمایا ہم تورات میں پڑھتے ہیں کہ وہ پانی اور مٹی میں غروب ہوتا ہے(2)۔امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید ذوالقرنین بحر محیط کے ساحل پر پہنچا ہو اور اسے اسی طرح نظر آیا ہو کیونکہ حد نظر تک پانی کے سوا کچھ نظر نہیں آیا ہوگا۔ اسی لئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا وجدھا تغرب اس نے سورج کو غروب ہوتے پایا یہ نہیں فرمایا کہ واقعی سورج غروب ہو رہا تھا۔قتیبی نے بھی اسی طرح لکھا ہے۔(3)

2 ذوالقرنین نے اس چشمہ کے پاس ایک قوم کو پایا۔امام بیضاوی نے بعض علماء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس قوم کا لباس وحشی جانوروں کی کھالیں تھیں اور سمندر جو کچھ باہر پھینکتا تھا وہ ان کی خوراک تھی اور وہ عقیدہ کے اعتبار سے کافر تھے(4)۔

3 ہم نے ذوالقرنین کو حکم دیا کہ اس قوم کو اسلام کی دعوت دو۔اگر یہ کفر پر اصرار کریں تو پھر تم انہیں قتل کر دو اور اگر یہ توبہ کر لیں اور اسلام قبول کر لیں تو پھر انہیں اکرام وارشاد اور شریعت کی تعلیم دو۔اما کا کلمہ یہاں تقسیم کیلئے ہے جیسا کہ اواس ارشاد میں تقسیم کے لئے ہے، اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِيْنَ يُحَارِبُوْنَ اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗ وَ يَسْعَوْنَ فِي الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ يُّقَتَّلُوْۤا اَوْ يُصَلَّبُوْۤا اَوْ تُقَطَّعَ اَيْدِيْهِمْ وَ اَرْجُلُهُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ۔ترجمہ: بلاشبہ سزا ان لوگوں کی جو جنگ کرتے ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور کوشش کرتے ہیں

1۔تفسیر بغوی،جلد3،صفحہ 594 (الفکر) 2۔ایضاً 3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی،جلد3،صفحہ 520 (الفکر)
4۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ کازرونی،جلد3،صفحہ 520 (الفکر)

زمین میں فساد برپا کرنے کی یہ ہے انہیں چن چن کر قتل کیا جائے یا سولی دیا جائے یا کاٹے جائیں ان کے ہاتھ اور ان کے پاؤں مختلف طرفوں سے یا جلاوطن کر دیئے جائیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اما کا کلمہ یہاں تخییر کے لئے ہے، یعنی ان کے کفر کی وجہ سے انہیں قتل کر دو یا انہیں اسلام کی دعوت دو تمہیں اختیار ہے اور ان یتخذ فیهم حسنا سے مراد یہی دعوت اسلام ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اسے قتل کرنے اور قیدی بنانے کا اختیار دیا اور قیدی بنانے کو احسان اس لئے شمار کیا کیونکہ یہ قتل کے مقابلہ میں احسان ہی ہے۔ پہلے دو قولوں کی تائید ذیل کے ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔

قَالَ اَمَّا مَنْ ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهٗ ثُمَّ يُرَدُّ اِلٰى رَبِّهٖ فَيُعَذِّبُهٗ عَذَابًا نُّكْرًا ﴿۸۷﴾

''ذوالقرنین نے کہا جس نے ظلم (کفر وفسق) کیا تو ہم ضرور اسے سزا دیں گے پھر اسے لوٹا دیا جائے گا اس کے رب کی طرف تو وہ اسے عذاب دے گا بڑا ہی سخت عذاب ۱؎ ''

۱؎ ذوالقرنین کے حکم الٰہی کی اتباع میں یا تخییر کے بعد اسلام کی طرف انہیں دعوت دینے کو اختیار کرتے ہوئے فرمایا۔ میری دعوت اسلام کے بعد جو کفر پر اصرار کرے گا اور اپنے شرکیہ عقائد پر قائم رہے گا تو میں اور میرے ساتھی دنیا میں اسے قتل کے عذاب میں مبتلا کریں گے پھر آخرت میں رب ذوالجلال جہنم کا سخت عذاب دیں گے جس کی مثل پہلے عذاب نہ جھیلا ہوگا۔

وَاَمَّا مَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهٗ جَزَآءَ ۨالْحُسْنٰى ۚ وَسَنَقُوْلُ لَهٗ مِنْ اَمْرِنَا يُسْرًا ﴿۸۸﴾

''اور جو شخص ایمان لایا اور اچھے عمل کئے تو اس کے لئے اچھا معاوضہ ہے ۱؎ اور ہم اسے حکم دیں گے ایسے احکام بجالانے کا جو آسان ہوں گے ۲؎ ''

۱؎ یعنی جو ایمان لائے گا اور ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل کرے گا تو اس کے لئے اچھا بدلہ ہے۔ حمزہ، کسائی، یعقوب اور حفص نے جزاء کو منونا اور حال کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔ یعنی جزاء کے طور پر اس کے لئے جنت ہے۔ یا اس کے لئے بطور جزاء اچھا ثواب ہے اور یہ بھی جائز ہے کہ یہ فعل مقدر کا مصدر ہے اور پھر جملہ حال یا تمیز کی بناء پر منصوب ہے، جبکہ باقی قراء نے بغیر تنوین کے مضاف کر کے مرفوع پڑھا ہے۔ اس قرأت پر الحسنی سے مراد اعمال حسنہ ہیں، یعنی اس کے لئے اچھے اعمال کی جزاء ہے یا کہا جاتا ہے کہ الحسنی سے مراد جنت ہے یا اچھا بدلہ ہے اور جزاء کی الحسنی کی طرف اضافت موصوف کی صفت کی طرف اضافت کی طرح ہے جیسے مسجد الجامع و جانب الغربی۔

۲؎ یسر، ذا یسر کی تقدیر میں ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں یسر کا معنی معروف ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ذوالقرنین کو خطاب دلیل ہے کہ وہ نبی تھے، ان کی طرف وحی کی جاتی تھی۔ امام بغوی فرماتے ہیں اصح یہ ہے کہ وہ نبی نہیں تھے۔ اور اس خطاب سے مراد الہام ہے(1)، میں کہتا ہوں یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں یہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی نبی کے ذریعہ سے ملا ہو جو ان کی صحیح سمت راہنمائی کرتا رہتا ہو جیسے بنی اسرائیل میں بادشاہوں کے ساتھ انبیاء کرام ہوتے تھے جو ان کی راہنمائی کرتے تھے۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۸۹﴾

''پھر وہ روانہ ہوا دوسرے راستہ پر ۱؎ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

۱؎ یعنی مشرق کی طرف پہنچانے والے راستہ پر چلا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ مَطْلِعَ الشَّمْسِ وَجَدَهَا تَطْلُعُ عَلٰى قَوْمٍ لَّمْ نَجْعَلْ لَّهُمْ مِّنْ دُوْنِهَا سِتْرًا ﴿۹۰﴾

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچا طلوع آفتاب کے مقام پر تو اس نے پایا سورج کو کہ وہ طلوع ہو رہا ہے ایسی قوم پر کہ نہیں بنائی ہم نے ان کے لئے سورج (کی گرمی) سے بچنے کی آڑ ۱؎''

۱؎ یعنی ذوالقرنین سورج کے طلوع کی جگہ پہنچا تو وہاں اس نے ایسی قوم کو پایا جن کا لباس نہ تھا یا کوئی مکان نہ تھا کیونکہ ان کی زمین گھر' مکان کو اٹھانے کی متحمل ہی نہ تھی یا انہوں نے مکانوں کی جگہ غاریں بنا رکھی تھیں جن میں وہ رہتے تھے۔

كَذٰلِكَ ۭ وَقَدْ اَحَطْنَا بِمَا لَدَيْهِ خُبْرًا ﴿۹۱﴾

''بات یونہی ہے ۱؎ اور ہم نے احاطہ کر رکھا ہے ہر اس چیز کا جو اس کے پاس تھی اپنے علم سے ۲؎''

۱؎ یعنی ذوالقرنین بالکل اسی طرح تھا جس طرح ہم نے بیان کیا ہے کہ اس کا مرتبہ بلند تھا اور اس کی بادشاہی وسیع و عریض تھی یا یہ معنی کہ اس کا معاملہ اہل مشرق کے ساتھ بھی اہل مغرب کی طرح اختیار و تخییر کا تھا۔ کذالک یا یہ وجدھا کے مصدر محذوف کی صفت ہے، یعنی اس نے سورج کو طلوع ہوتے دیکھا جیسا اس نے اسے غروب ہوتے دیکھا یا یہ لم نجعل کے مصدر کی صفت ہے، یعنی اہل مشرق کے لئے کوئی آڑ نہیں بنائی جس طرح اہل مغرب کے لئے نہیں بنائی تھی یا یہ قوم کی صفت ہے یعنی اس نے سورج کو ایک ایسی قوم پر طلوع ہوتے دیکھا جو کفر اور حکم میں اس قوم کی مثل تھی جن پر سورج کو غروب ہوتے دیکھا۔

۲؎ اس کے پاس جو لشکر' آلات حرب' تعداد اور اسباب ہیں ہم سب کو جانتے ہیں' یعنی ہم اس کے ظواہر و باطن کو جانتے ہیں خبرا کا معنی علم ہے اور مصدریہ کی بناء پر منصوب ہے کیونکہ احطنا میں خبر کا معنی موجود ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اس کے پاس ہر چیز کی اتنی کثرت تھی جس کا احاطہ صرف لطیف و خبیر ذات کو ہی تھا۔

ثُمَّ اَتْبَعَ سَبَبًا ﴿۹۲﴾

''پھر وہ روانہ ہوا ایک اور راہ پر ۱؎''

۱؎ یعنی پھر اس نے تیسرا راستہ اختیار کیا جو مشرق و مغرب کے درمیان تھا، یعنی جنوب سے شمال کی طرف چلا۔

حَتّٰۤى اِذَا بَلَغَ بَيْنَ السَّدَّيْنِ وَجَدَ مِنْ دُوْنِهِمَا قَوْمًا ۙ لَّا يَكَادُوْنَ يَفْقَهُوْنَ قَوْلًا ﴿۹۳﴾

''یہاں تک کہ جب وہ پہنچا دو پہاڑوں کے درمیان ۱؎ تو پایا اس نے ان پہاڑوں کے پیچھے ایک قوم کو جو نہیں سمجھ سکتے تھے (ان کی) کوئی بات ۲؎''

۱؎ سدین کو ابن کثیر' ابوعمرو اور حفص سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں جس رکاوٹ کو انسان نے بنایا ہو وہ سد (بفتحہ سین) ہے اور جو قدرت کی کرشمہ سازی سے ہو وہ سد (بضم سین) ہے۔ ابوعمرو کا بھی یہی قول ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں السد بالفتح مصدر ہے اور بالضم اسم ہے۔ اور یہاں السدین سے مراد دو پہاڑ ہیں جن کے درمیان ذوالقرنین نے یاجوج ماجوج کے سامنے دیوار بنا دی تھی۔ یہ ارمینیہ اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 594 (الفکر)

آذربائیجان کے پہاڑ ہیں۔ ابن المنذر نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں شمال کے آخر میں جہاں ترکوں کی زمین کی حد ختم ہوتی ہے وہاں دو پہاڑ ہیں، ان کے پیچھے یاجوج' ماجوج رہتے ہیں۔ سعید بن منصور نے اپنی سنن میں' ابن جریر' ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے اپنی اپنی تفاسیر میں اسی طرح نقل کیا ہے۔ یہاں بین مفعول بہ ہے جو ظروف متصرفہ میں سے ہے۔

۲۔ دونھما میں ھما ضمیر سے مراد دو پہاڑ ہیں، یعنی ان پہاڑوں کے سامنے۔ حمزہ اور کسائی نے یفقھون کو باب افعال سے یفقھون یا کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی وہ دوسروں کو اپنی بات نہیں سمجھا سکتے تھے۔ دوسرے قراء نے یفقھون مجرد فعل سے پڑھا ہے جس کا معنی یہ ہے کہ وہ دوسروں کی کلام نہیں سمجھتے تھے۔ ابن عباس فرماتے وہ کسی کی کلام نہیں سمجھتے تھے اور نہ لوگ انکی کلام سمجھتے تھے۔

قَالُوْا یٰذَا الْقَرْنَیْنِ اِنَّ یَاْجُوْجَ وَمَاْجُوْجَ مُفْسِدُوْنَ فِی الْاَرْضِ فَهَلْ نَجْعَلُ لَكَ خَرْجًا عَلٰۤی اَنْ تَجْعَلَ بَیْنَنَا وَبَیْنَهُمْ سَدًّا ﴿۹۴﴾

''انہوں نے کہا ۱۔ اے ذوالقرنین یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے اس علاقہ میں ۲۔ تو کیا ہم مقرر کر دیں آپ کے لئے کچھ خراج ۳۔ تا کہ آپ بنا دیں ہمارے درمیان اور ان کے درمیان ایک بلند دیوار ۴۔''

۱۔ یعنی اس قوم نے کسی مترجم کے واسطہ سے ذوالقرنین سے درخواست کی کہ یاجوج اور ماجوج نے بڑا فساد برپا کر رکھا ہے۔ قالوا کی جگہ ابن مسعود کی قرأت میں قَالَ الَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ہے۔ عاصم نے یہاں اور سورۂ انبیاء میں یاجوج اور ماجوج دونوں کو مہموز پڑھا ہے اور دوسرے قراء نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے۔ یہ دونوں عجمی اسم ہیں اور دلیل ان کا غیر منصرف ہونا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ عربی ہیں اور اج الظلم سے مشتق ہیں۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ اجیج النار سے مشتق ہے (آگ کی ضو اور اس کا شرارہ) ان کی کثرت کی وجہ سے آگ کے شعلوں کے ساتھ انہیں تشبیہ دی گئی ہے اور ان کا غیر منصرف ہونا معرفہ اور تانیث کی وجہ سے ہے(1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ یافث بن نوح کی اولاد سے ہیں۔ الضحاک فرماتے ہیں یہ ترکوں کی نسل ہے۔ سدی کہتے ہیں ترک یاجوج کا ایک لشکر تھا جو نکلا ہوا تھا۔ اور ذوالقرنین نے دیوار بنائی تو یہ باہر ہی رہ گیا۔ سب ترک ان کی اولاد ہیں۔ قتادہ سے مروی ہے کہ وہ بائیس قبیلے تھے۔ ذوالقرنین نے اکیس قبیلوں کے آگے دیوار بنائی تھی اور ایک قبیلہ باقی رہ گیا تھا۔ ترک وہی ہیں۔ ان کو ترک اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ باہر چھوڑ دیئے گئے تھے۔ اہل تاریخ کہتے ہیں نوح علیہ السلام کے تین فرزند تھے۔ سام' حام اور یافث۔ عرب' عجم اور رومی سام کی اولاد ہیں اور حبشہ' زنج اور نوبہ حام کی اولاد ہیں۔ اور ترک' خزر' صقالبہ اور یاجوج ماجوج یافث کی نسل ہیں' ابن عباس نے عطا کی روایت میں فرمایا کہ یاجوج و ماجوج دس حصے ہیں اور سارے انسان ان کے مقابلہ میں ایک حصہ ہیں۔ حضرت حذیفہ سے مرفوع روایت مروی ہے کہ یاجوج ایک امت ہے اور ماجوج بھی ایک امت ہے اور ان میں سے ہر ایک امت کی تعداد چار لاکھ ہے' ان میں سے کوئی شخص اس وقت تک نہیں مرتا جب تک کہ اپنی نسل سے ہزار آدمی ایسے نہ دیکھ لے جو ہتھیار اٹھالیں (یعنی جوان ہو جائیں) یہ سب آدم علیہ السلام کی اولاد سے ہیں، بے آباد دنیا تک پھیلتے جائیں گے(2)۔

میں کہتا ہوں شاید حدیث کا مطلب یہ ہو کہ جب ذوالقرنین نے دیوار بنائی تھی اس وقت ان میں سے ہر امت کی تعداد چار لاکھ تھی لیکن اس کے بعد جب ان میں سے ہر شخص اپنے ہزار مسلح افراد دیکھ کر مرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کے سوا ان کی تعداد کا صحیح اندازہ نہیں ہو سکتا اور یَسِیْرُوْنَ اِلَی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 596 (الفکر) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 97-596 (الفکر)

خَرَابُ الدُّنْیَا کا معنی یہ ہو کہ جب قیامت کے قریب اس دیوار سے نکلیں گے تو بے آباد دنیا تک چلے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

امام بغوی فرماتے ہیں یاجوج ماجوج کی تین قسمیں تھیں کچھ ارزر (شام کا ایک درخت ہے) کی مانند ہیں، ان کی لمبائی اوپر کی جانب ایک سو بیس ہاتھ ہے اور ایک قسم وہ ہے جن کا عرض اور طول برابر ایک سو بیس ہاتھ ہے۔ ان کے سامنے نہ پہاڑ ٹھہر سکتا ہے نہ لوہا۔ ایک قسم وہ ہے جو ایک کان کو بچھونا بناتے ہیں اور دوسرے کو لحاف' گھوڑے' وحشی' خنزیر جس کے قریب سے گزرتے ہیں اسے کھا جاتے ہیں۔ ان میں سے جو مرتا اسے بھی وہ کھا جاتے ہیں، ان کا آگے والا دستہ شام میں اور پیچھے والا دستہ خراسان میں ہے۔ مشرق اور بحیرۂ طبر کی نہریں پی جاتے ہیں (1) میں کہتا ہوں یہ قرب قیامت میں اس دیوار سے نکل کر پئیں گے اور ہر چیز کو کھائیں گے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ان کا طول ایک بالشت اور عرض ایک ہاتھ ہے اور کچھ ان میں بہت لمبے ہیں (2)۔

کعب فرماتے ہیں یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے عجیب لوگ ہیں۔ یہ اس طرح پیدا ہوئے کہ آدم علیہ السلام کو ایک دن احتلام ہوا اور ان کا نطفہ مٹی سے مل گیا۔ اللہ تعالیٰ نے اس پانی سے یاجوج و ماجوج کو پیدا فرمادیا۔ وہ باپ کی طرف سے ہمارے علاتی بھائی ہیں لیکن ماں کی طرف سے کچھ نہیں لگتے (3)۔

امام بغوی فرماتے ہیں وہب بن منبہ نے ذکر کیا ہے کہ ذوالقرنین رومی تھا اور ایک بوڑھی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ جب وہ بالغ ہوا تو ایک نیک آدمی بنا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے فرمایا میں تجھے مختلف زبانوں والی قوموں کی طرف بھیجنے والا ہوں۔ ان میں سے دو امتیں ایسی ہیں جن کے درمیان زمین کے طول کی دوری ہے۔ ایک سورج کے غروب ہونے کی جگہ ہے اسے ناسک کہا جاتا ہے۔ دوسری سورج کے طلوع ہونے کی جگہ ہے، اسے منسک کہا جاتا ہے۔ دو امتیں ہیں جن کے درمیان زمین کے عرض کی مسافت ہے۔ ایک دائیں قطر میں ہے، اسے ہاویل کہا جاتا ہے۔ دوسری زمین کے بائیں قطر میں ہے، اسے قاویل کہا جاتا ہے۔ ایک امت زمین کے وسط میں ہے جن میں جن اور انسان، یاجوج و ماجوج ہیں۔ ذوالقرنین نے عرض کی میں کس قوم کے ساتھ ان کا مقابلہ کروں گا اور کس لشکر کے ساتھ ان پر چڑھائی کروں گا اور کونسی زبان سے ان کے ساتھ بات کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا میں تجھے سطوت عطا کروں گا' تیری زبان کو پھیلا دوں گا، تیرے بازوؤں کو مضبوط کروں گا۔ تجھے کوئی چیز خوفزدہ نہیں کرے گی' میں تجھے ہیبت کا لباس پہناؤں گا۔ تجھے کوئی چیز نہیں روکے گی' تیرے لئے نور و ظلمت کو مسخر کر دوں گا، نور و ظلمت تیرے لشکر بنا دوں گا۔ نور تیری آگے سے راہنمائی کرے گا، ظلمت تجھے پیچھے سے گھیرے میں لئے رکھے گی۔ ذوالقرنین پہلے سورج کے غروب ہونے کی طرف چلا۔ وہاں اس نے کافی لوگ پائے جن کی تعداد کو اللہ تعالیٰ ہی جانتا ہے۔ اس نے ان پر ظلمت سے چڑھائی کی حتی کہ انہیں ایک مکان میں جمع کر دیا پھر انہیں اللہ تعالیٰ کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف بلایا۔ ان میں سے کچھ ایمان لائے اور کچھ منکر ہو گئے۔ پھر اس نے منحرفین کی طرف توجہ کی۔ ان پر ظلمت کو داخل کیا پس وہ تاریکی ان کے پیٹوں اور گھروں میں داخل ہو گئی۔ پس وہ بھی اس کی دعوت میں داخل ہو گئے۔ پھر اس نے اہل مغرب سے بہت بڑا لشکر تیار کیا۔ وہ ان کو لے کر چلا حتی کہ ہاویل قوم کے پاس پہنچا ان کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو ناسک قوم کے ساتھ کیا تھا۔ پھر وہ سورج کے طلوع ہونے کی جگہ منسک قوم کے پاس پہنچا، ان سے بھی وہ معاملہ کیا جو پہلی امتوں کے ساتھ کیا تھا پھر وہ قاویل قوم کے پاس آیا۔ ان سے بھی پہلی امتوں جیسا سلوک کیا پھر وہ ان امتوں کی طرف متوجہ ہوا جو زمین کے وسط میں تھیں۔ جب وہ وہاں پہنچا جہاں مشرقی سمت ترکوں کا علاقہ ختم ہوتا ہے تو انسانوں میں سے ایک نیک گروہ اس کے پاس آیا اور کہا اے ذوالقرنین ان دو پہاڑوں کے درمیان ایک مخلوق ہے جو چوپایوں کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 97-596 (الفکر) 2۔ ایضاً، صفحہ 597 3۔ ایضاً

مثل ہے، جانوروں اور چوپایوں کو چیرتے پھاڑتے ہیں۔ان کے درندوں کی طرح لمبے لمبے دانت اور داڑھیں ہیں، وہ سانپ اور بچھو کھاتے ہیں اور ہر ذی روح جسے اللہ نے زمین پر پیدا کیا ہے اسے کھا جاتے ہیں۔کوئی مخلوق ان کے بڑھنے کی طرح نہیں بڑھتی۔اسمیں کوئی شک نہیں وہ زمین کے مالک بن جاتے ہیں، اس پر غلبہ پالیتے ہیں اور فساد برپا کرتے ہیں۔کیا ہم تیرے لئے چندہ اکٹھا کریں اس شرط پر کہ تو ہمارے اور ان کے درمیان ایک دیوار بنا دے۔ذوالقرنین نے کہا میرے رب نے مجھے جو قوت عطا کی ہے وہ تمہاری ان کوڑیوں سے کہیں بہتر ہے۔فرمایا تم پتھر، لوہا اور تانبا اکٹھا کرو میں ان کی خبر لے کر آتا ہوں۔ذوالقرنین چلا گیا حتی کہ ان کے شہروں کے اندر داخل ہو گیا۔اس نے اس قوم کو ایک ہی مقدار میں پایا ہم میں سے ٹھگنا (پست قد) کے نصف قد کے برابر ان کا قد تھا۔ہمارے ہاتھوں کے ناخنوں کی طرح ان کے پنجے تھے اور دانت کچلیاں درندوں کی طرح تھیں، ان کے جسموں پر سخت بال تھے جو انہیں سردی گرمی سے بچاتے تھے ان کے کان بڑے لمبے تھے۔ایک کو بچھونا اور ایک کو اوڑھنا بناتے تھے ایک میں موسم گرما گزارتے دوسرے میں موسم سرما۔جہاں جمع ہوتے جانوروں کی طرح جماع کرتے۔جب ذوالقرنین نے ان کی عادات واطوار کا جائزہ لے لیا تو دونوں پہاڑوں کی طرف واپس آیا۔ان کے درمیان کی پیمائش کی پھر پانی تک بنیاد کھدوائی، اس کے اندر پتھر ڈلوائے، تانبے سے مصالحہ تیار کیا اور اسکو ان پتھروں کے اوپر ڈال دیا پس وہ اس طرح ہو گیا گویا زمین کے نیچے سے پہاڑ نکل آیا ہے(1)۔

2 یعنی یاجوج و ماجوج ہماری زمین میں قتل، تخریب کاری، کھیتوں کی تباہی کر کے فساد پھیلاتے ہیں۔کلبی کہتے ہیں وہ موسم ربیع میں زمینوں کی طرف نکلتے اور ہر سبز و تر چیز کو کھا جاتے ہیں اور ہر خشک چیز کو اٹھا کر ساتھ لے جاتے۔اس سے لوگوں کو بہت تکلیف ہوتی۔بعض علماء فرماتے ہیں وہ لوگوں کو بھی کھا جاتے تھے(2)۔

3 حمزہ اور کسائی نے یہاں اور سورۃ المومنون میں خراجاً الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر الف کے پڑھا ہے۔یہ دونوں لغتیں ہیں اور دونوں کا معنی ایک ہے، یعنی ہم اپنے اموال سے ایک حصہ نکالیں گے۔ابو عمرو کہتے ہیں الخرج کا معنی جس کے ذریعے سے رغبت دی جائے اور خراج جس کا ادا کرنا لازمی ہو اور الخرج افراد پر ہوتا ہے اور خراج زمینوں پر ہوتا ہے۔عرب کہتے ہیں اپنے سر کا خرج ادا کرو اور اپنے شہر کا خراج ادا کرو۔بعض علماء فرماتے ہیں الخراج زمین پر ٹیکس ہوتا ہے اور الخرج مصدر ہے۔

4 نافع، ابن عامر اور ابوبکر نے سین کے ضمہ کے سدا اور باقی قراء نے سدا سین کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔یعنی ان کے سامنے کوئی بند باندھ دیجئے۔

قَالَ مَا مَكَّنِّي فِيهِ رَبِّي خَيْرٌ فَأَعِينُونِي بِقُوَّةٍ أَجْعَلْ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ رَدْمًا ﴿٩٥﴾

"وہ بولا وہ دولت جس میں میرے رب نے مجھے اختیار دیا ہے وہ بہتر ہے پس تم میری مدد کرو جسمانی مشقت سے میں بنا دوں گا تمہارے اور ان کے درمیان ایک مضبوط آڑ 1۔"

1 قال کا فاعل ذوالقرنین ہے۔مکنی کو ابن کثیر نے بغیر ادغام کے اصل پر دونوں نونوں کیساتھ تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔پہلے نون کو مفتوح اور دوسرے کو مکسور پڑھا ہے۔جبکہ دوسرے قراء نے نون مشدد مکسور کے ساتھ مدغم پڑھا ہے یعنی جو میرے رب نے مجھے مال اور ملک میں سے عطا فرمایا ہے وہ تمہارے خراج سے کہیں بہتر ہے تم کام کر کے یا جن آلات کی مجھے ضرورت ہے ان کے ذریعے میری مدد کرو۔میں ایک مضبوط دیوار بنا دیتا ہوں، وہ دیوار دو پہاڑوں سے بلند تھی۔عرب کہتے ہیں ثَوبٌ مُرَدَّمٌ جب اس پر تہہ در تہہ ٹکڑے لگے ہوئے ہوں۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 597 (الفکر)　2۔ایضاً، صفحہ 598

اٰتُوۡنِیۡ زُبَرَ الۡحَدِیۡدِ ؕ حَتّٰۤی اِذَا سَاوٰی بَیۡنَ الصَّدَفَیۡنِ قَالَ انۡفُخُوۡا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَعَلَہٗ نَارًا ۙ قَالَ اٰتُوۡنِیۡۤ اُفۡرِغۡ عَلَیۡہِ قِطۡرًا ﴿۹۶﴾ؕ

”تم لے آؤ میرے پاس لوہے کی چادریں[1] (چنانچہ کام شروع ہوگیا) یہاں تک کہ جب ہموار کر دیا گیا وہ خلا جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا[2] تو اس نے حکم دیا دھونکو یہاں تک کہ جب وہ لوہا آگ بنا دیا[3] تو اس نے کہا لے آؤ میرے پاس پگھلا ہوا تانبا[4] کہ میں اسے اس پگھلے ہوئے لوہے پر انڈیلوں[5]“

[1] اتونی کو جمہور قراء نے ہمزہ قطعی کے ساتھ ایتاء سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی دینا اور عطا کرنا ہے۔ اس مطالبہ اور خراج کے واپس کرنے اور بدنی مشقت پر اکتفاء کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے کیونکہ آلات مہیا کرنا اعانت ہے۔ عمل پر خراج نہیں۔ ورش نے اپنی اصل پر ہمزہ کی حرکت ماقبل تنوین کو دے کر پڑھا ہے ابوبکر نے ردما ن اتونی یعنی تنوین کے کسرہ اور اس کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس کا معنی جیئونی ہے۔ ابتداءً ہمزہ پر کسرہ تھا پھر اجتماع ہمزتین کی وجہ سے ہمزہ یاء سے بدل گیا جن میں پہلا مکسور تھا اور دوسرا ساکن تھا۔ زبرۃ بڑے ٹکڑے کو کہتے ہیں۔ ابوبکر کی قراءت پر اس کی اصل بزبر الحدید تھی کیونکہ اتیان مصدر لازم ہے۔ پھر باء کو حذف کیا گیا جیسے امرتک الخیر میں باء کو حذف کیا گیا ہے۔ وہ لوگ ذوالقرنین کے حکم کے مطابق لوہے کی چادریں، لکڑی اور کوئلہ لے آئے۔ اس نے انہیں ایک دوسرے پر جوڑ دیا۔ وہ متواتر لوہے کی چادریں لکڑی اور کوئلے پر ڈالتا رہا اور اسی طرح لکڑی اور کوئلے پر لوہے کی چادریں ڈالتا رہا۔

[2] ابن کثیر، ابو عمرو اور ابن عامر نے الصدفین کو صاد اور دال کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوبکر نے صاد کے ضمہ اور دال کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور باقی قرأ نے صاد اور دال دونوں پر فتحہ پڑھا ہے۔ یہ تمام لغتیں موجود ہیں اور یہ الصدف سے ہے جس کا معنی المیل ہے کیونکہ ہر ایک پہاڑ دوسرے کی طرف مائل تھا۔ اسی سے التصادف بمعنی التقابل ہے۔

[3] ذوالقرنین نے مزدوروں کو کہا اس سارے ملبہ میں آگ لگاؤ اور پھر اس کو دھونکو۔ یہ سلسلہ شروع رہا حتی کہ وہ ملبہ بالکل آگ کی طرح بنا دیا گیا۔ بنانے کی نسبت ذوالقرنین کی طرف کی ہے حالانکہ بنانے والے تو مزدور تھے اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ کام ذوالقرنین کے حکم سے ہوا تھا۔

[4] اتونی کو حمزہ اور کسائی نے قال کی لام کے بعد ہمزہ ساکنہ کے ساتھ جیئنی کے معنی میں پڑھا ہے اور جب ابتداءً پڑھتے ہیں تو ہمزہ وصلی کو کسرہ اور ہمزہ ساکنہ کو ما سے بدل کر پڑھتے ہیں۔ باقی قراء نے دونوں حالتوں میں اعطاء کے معنی میں ہمزہ قطعی اور مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

[5] افراغ کا معنی انڈیلنا ہے اور قطراً پگھلا ہوا تانبا ہے، یعنی تم تانبا لے آؤ، میں اس پگھلے ہوئے تانبے کو لوہے پر ڈالوں گا پس آگ لکڑی اور کوئلے کو کھا گئی۔ اور پگھلا ہوا تانبا لکڑی کی جگہ ہوگیا حتی کہ لوہا اور تانبا آپس میں چمٹ گئے، لوہا اینٹ بن گیا اور تانبا مٹی کے قائم مقام ہوگیا پس وہ مضبوط پہاڑ بن گیا۔

امام بغوی فرماتے ہیں اس دیوار کا عرض پچاس ہاتھ، اونچائی دو سو ہاتھ اور لمبائی ایک فرسخ تھی (1)۔

قطراً اسم ہے جس میں اتونی اور افرغ دونوں عمل کا تقاضا کرتے ہیں۔ بصری علماء دوسرے فعل کو عمل کراتے ہیں اور فرماتے ہیں پہلے فعل کا مفعول حذف ہوتا ہے جس پر دوسرے فعل کا مفعول دلالت کر رہا ہوتا ہے اور بصری علماء اپنے مذہب کے مختار ہونے کی دلیل

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 599 (الفکر)

یہ دیتے ہیں کہ دوسرا فعل مفعول کے قریب ہوتا ہے اس لئے اس کو عمل کرانا اولیٰ ہے اور اگر پہلے فعل (اتونی) کا قطراً کو مفعول بنایا جائے دوسرے فعل (افرغ) کے مفعول کے لئے ضمیر نکالنی لازم ہوگی۔ اس التباس سے بچنے کے لئے دوسرے فعل کو عمل کرانا ہی بہتر ہے۔ کوئی علماء فرماتے ہیں پہلا فعل مقدم ہوتا ہے اس کا تقدم عمل کا تقاضا کرتا ہے۔ اس لئے یہاں بھی قطراً اتونی کا مفعول ہوگا اور افرغ کا مفعول محذوف ہوگا۔ دونوں صورتوں میں کوئی التباس نہیں ہے۔

فَمَا اسْطَاعُوْٓا اَنْ یَّظْهَرُوْهُ وَمَا اسْتَطَاعُوْا لَهٗ نَقْبًا ﴿۹۷﴾

"سو یاجوج وماجوج بڑی کوشش کے باوجود اسے سر نہ کر سکے اور نہ ہی اسمیں سوراخ کر سکے [1]"

[1] اسطاعوا اصل میں استطاعوا ہے جمہور نے دو قریب المخرج حروف کے اتصال سے بچنے کے لئے تاء کو حذف کر کے پڑھا ہے۔ حمزہ نے تاء کو طاء میں ادغام کر کے مشدد اور اجتماع الساکنین علی غیر حدہ کر کے پڑھا ہے۔ یعنی وہ اس دیوار کی بلندی اور ملائمت کی وجہ سے نہ اس کے اوپر چڑھ سکے اور اس کی شدت وصلابت کی وجہ سے نہ نیچے سے سوراخ کر سکے۔

قَالَ هٰذَا رَحْمَةٌ مِّنْ رَّبِّیْ ۚ فَاِذَا جَآءَ وَعْدُ رَبِّیْ جَعَلَهٗ دَكَّآءَ ۚ وَكَانَ وَعْدُ رَبِّیْ حَقًّا ﴿۹۸﴾

"ذوالقرنین نے کہا یہ میرے رب کی رحمت ہے (کہ اس نے مجھے یہ توفیق بخشی) اور جب آجائے گا میرے رب کا وعدہ تو وہ اسے ریزہ ریزہ کر دے گا اور میرے رب کا وعدہ (ہمیشہ) سچا ہوا کرتا ہے [1]"

[1] یعنی ذوالقرنین نے کہا۔ یہ دیوار یا یہ خلا پر کرنے کی قدرت رب کی اپنے بندوں پر خاص رحمت ہے۔ لیکن جب یاجوج وماجوج کے نکلنے کا وقت میرے پروردگار کی طرف سے آجائے گا یا یہ معنی کہ قیامت جب قریب آجائے گی تو یہ دیوار زمین میں بوس ہو جائے گی۔ کوفیوں نے دکاء کو مد اور ہمزہ کے ساتھ بغیر تنوین کے پڑھا ہے اور باقی قراء نے بغیر ہمزہ اور مد کے تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ مصدر بمعنی مفعول ہے، یعنی وہ اسے کوٹی ہوئی ریزہ ریزہ اور زمین کے برابر کر دے گا۔

ذوالقرنین کا قصہ یہاں ختم ہوا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ ذوالقرنین ظلمت میں داخل ہوا پھر جب واپس آیا تو شہر زور میں اس کا وصال ہو گیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اس کی عمر تیس سال سے کچھ زائد تھی(1)۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت قتادہ نے عن ابی رافع عن ابی ہریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سلسلہ سے روایت کیا ہے کہ یاجوج اور ماجوج ہر روز اس دیوار کو کھودتے ہیں حتیٰ کہ جب سورج کی شعاع نظر آتی ہے تو ان کا سردار کہتا ہے اب واپس چلے جاؤ بقیہ کل کھودیں گے لیکن اللہ تعالیٰ اسے پھر مکمل فرما دیتا ہے۔ لیکن جب فیصلہ الٰہی کا وقت آجائے گا اور وہ اسی طرح کھودیں گے کہ سورج کی شعاعوں کا ظہور ہونے لگے گا تو ان کا سردار کہے گا اب واپس جاؤ بقیہ کل ان شاء اللہ کھودیں گے۔ ان شاء اللہ کہنے کے بعد دوسرے دن واپس آئیں گے تو ویسے ہی پائیں گے جیسے چھوڑ کر گئے تھے، پس وہ اس بقیہ حصہ کو کھود دیں گے اور لوگوں پر نکل پڑیں گے۔ پہلے وہ پانیوں کا رخ کریں گے، لوگ ان کے خوف سے قلعوں میں چھپ جائیں گے۔ وہ یاجوج وماجوج اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، وہ خون آلود ہو کر واپس آئیں گے۔ وہ کہیں گے ہم اہل زمین پر غالب آگئے اور اھل السماء پر بھی غالب آگئے۔ اللہ تعالیٰ انکی گدیوں میں ایک کیڑا پیدا فرما دے گا جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جائیں گے۔ زمین کے کیڑے موٹے ہو جائیں گے اور ان کے گوشت کھانے کی وجہ سے وہ

1۔ تفسیر بغوی جلد 3، صفحہ 602

اللہ تعالیٰ کا خوب شکر ادا کریں گے(1)۔

مسلم نے نواس بن سمعان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک دن رسول اللہ ﷺ نے دجال کا ذکر کیا، دوران گفتگو آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی۔ اور کبھی بلند ہو جاتی ہمیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعظ سے یوں محسوس ہونے لگا کہ دجال کھجوروں کے جھنڈ میں ہے۔ پھر جب ہم آپ ﷺ کے پاس آئے تو آپ ﷺ نے ہمارے چہروں سے دجال کا خوف پہچان لیا۔ آپ ﷺ نے پوچھا تمہارے چہروں پر یہ خوف و ہراس کے آثار کیوں ہیں۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ آپ ﷺ نے دجال کا تذکرہ فرمایا۔ آپ ﷺ کی آواز کبھی پست ہو جاتی تھی اور کبھی بلند ہو جاتی تھی۔ ہم نے گمان کیا کہ وہ کھجوروں کے اس جھنڈ میں ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر دجال سے زیادہ کسی اور چیز کا خوف ہے جو (قرب قیامت میں) ظاہر ہوگی۔ اگر دجال نکلے گا اور میں تمہارے درمیان موجود ہوں گا تو میں اس سے جھگڑوں گا۔ اور اگر میری عدم موجودگی میں نکلے گا تو ہر شخص خود اس سے مقابلہ کرے گا۔ اللہ کریم میری طرف سے اس سے ہر مسلمان کی حفاظت فرمائے گا۔ وہ چھوٹے چھوٹے بالوں والا جوان ہوگا، اس کی آنکھ کا ڈھیلا باہر نکلا ہوا ہوگا اور میں اسے عبد العزی بن قطن کی طرح دیکھتا ہوں۔ جو تم میں سے دجال کو پائے وہ سورۂ کہف کی پہلی آیات کی تلاوت کرے، وہ شام اور عراق کے درمیان سے پھوٹے گا۔ وہ دائیں بائیں فساد پھیلائے گا۔ اے اللہ کے بندو! ثابت قدم رہنا۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ! وہ زمین میں کتنا عرصہ ٹھہرے گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا چالیس دن۔ (اس وقت) ایک دن سال کی طرح ہوگا۔ ایک دن ایک مہینہ کی طرح ہوگا، ایک دن جمعہ کی طرح ہوگا، اس کے تمام دن تمہارے دنوں کی طرح ہوں گے۔ ہم نے عرض کی حضور ﷺ! ایک دن جو سال کا ہوگا کیا اسمیں ہمارے لئے ایک دن نمازیں کافی ہوں گی۔ فرمایا نہیں بلکہ تم اندازہ سے نماز ادا کرنا۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ وہ زمین میں کتنا جلدی چلے گا؟ فرمایا وہ اس بادل کی طرح تیز چلے گا جس کو پیچھے سے ہوا دھکیل رہی ہوتی ہے۔ وہ دجال ایک قوم کے پاس آئے گا وہ انہیں اپنی طرف بلائے گا تو وہ اس پر ایمان لے آئیں گے اور اسکی بات کو قبول کر لیں گے۔ وہ آسمان کو حکم دے گا تو وہ بارش برسا دے گا' زمین کو حکم دے گا تو وہ اناج و سبزہ اگا دے گی۔ ان کے اونٹ شام کو واپس آئیں گے تو ان کی کوہانیں پہلے کی بنسبت لمبی ہوں گی۔ ان کی اونٹنیوں کی کھیری مکمل بھری ہوئی ہوں گی اور ان کے پہلو لمبے ہو چکے ہوں گے۔ پھر وہ ایک قوم کے پاس آئے گا، انہیں اپنی الوہیت کی دعوت دے گا وہ اس کی بات کو رد کر دیں گے۔ فرمایا وہ ان سے مڑے گا تو وہ سب قحط میں مبتلا ہو جائیں گے، ان کے مال میں سے کچھ بھی نہیں رہے گا۔ پھر وہ ایک بنجر زمین پر آئے گا، اسے کہے گا اپنے خزانے اگل دے' پس اس کے خزانے نکل کر شہد کی مکھیوں کی طرح اس کے پیچھے پیچھے چل پڑیں گے۔ پھر وہ ایک جوان آدمی کو بلائے گا اور اسے تلوار کے ساتھ مارے گا تو اسے دو ٹکڑے کر دے گا پھر وہ اس کو بلائے گا تو وہ مقتول شخص ہنستا' مسکراتا اس کے پاس آ جائے گا۔

اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کو معبوث فرمائیں گے، وہ دمشق کی مشرقی جانب سفید مینارہ کے پاس فرشتوں کے پروں پر ہاتھ رکھے ہوئے اتریں گے۔ جب آپ سر جھکائیں گے تو بارش کی طرح قطرے گریں گے اور جب سر بلند کریں گے تو آپ سے موتیوں کی طرح قطرے ٹپکیں گے۔ اور آپ کی سانس کسی کافر کے لئے حلال نہ ہوگی۔ اس لئے جس کافر کو لگے گی وہ مر جائے گا اور آپ کی سانس کا اثر حد نظر تک ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دجال کو تلاش کریں گے حتی کہ لد کے دروازے پر اسے پائیں گے اور اسے قتل کر دیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام ایک قوم کے پاس آئیں گے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس دجال کے شر سے محفوظ رکھا ہوگا۔ ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 600 (الفکر)

چہروں پر ہاتھ پھیریں گے اور جنت میں ان کے درجات انہیں بتائیں گے۔ اسی اثناء میں اللہ تعالیٰ عیسیٰ علیہ السلام کی طرف وحی فرمائیں گے کہ میں نے کچھ ایسے بندے (یاجوج و ماجوج) نکالے ہیں جن سے کسی کو جنگ کرنے کی طاقت نہیں ہے، تم میرے بندوں کو طور کی طرف لے جاؤ۔ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کو نکالے گا وہ ہر ٹیلے سے نکل پڑیں گے، انکا پہلا گروہ بحیرہ طبریہ پر پہنچ جائے گا، وہ اس کا سارا پانی پی جائے گا۔ پھر آخری گروہ آئے گا وہ کہیں گے کبھی یہاں پانی تھا۔ عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی (طور پر) محصور ہو جائیں گے، ہر چیز کا اتنا کال پڑے گا کہ ایک بیل کا سر کسی کے لئے اتنا عظیم ہوگا جیسے آج تمہارے لئے سو دینار ہیں۔ اللہ کے نبی عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی سب اللہ کی بارگاہ میں گڑگڑاتے رہیں گے حتی کہ اللہ تعالیٰ یاجوج و ماجوج کی گردنوں میں ایک کیڑا پیدا فرمائے گا اس کی وجہ سے وہ ایک شخص کی موت کی طرح سب مر جائیں گے۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام اور انکے ساتھی زمین پر اتریں گے۔ زمین پر کوئی ایک بالشت کے برابر جگہ بھی ان کی بدبو اور تعفن سے خالی نہیں پائیں گے۔ عیسیٰ علیہ السلام اور آپ کے ساتھی اللہ کریم کی بارگاہ میں اس مصیبت سے نجات کی التجا کریں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کی فریاد کو قبول فرمائیں گے اور بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح پرندے بھیجیں گے، وہ پرندے یاجوج و ماجوج کے جسموں کو اٹھا کر وہاں پھینک آئیں گے جہاں اللہ چاہے گا۔ پھر اللہ کریم بارش برسائیں گے جس سے مٹی کا گھر اون سے بنا ہوا خیمہ کوئی بھی محروم نہیں رہے گا۔ زمین دھل جائے گی اور صاف وشفاف ہو جائے گی پھر زمین کو حکم ہوگا اپنی برکت اگا دے۔ اس وقت پھراتنی برکت ہو جائے گی کہ ایک انار کو پوری ایک جماعت کھائے گی، اس کے چھلکے سے لوگ سایہ حاصل کریں گے۔ دودھ میں بڑی برکت ہوگی حتی کہ دودھ دینے والی ایک اونٹنی لوگوں کے کئی گروہوں کے لئے کافی ہوگی اور ایک گائے ایک قبیلہ کے لئے کافی ہوگی، ایک بکری ایک خاندان کے لئے کافی ہوگی۔ اسی دوران اللہ تعالیٰ ایک پاکیزہ ہوا چلائیں گے۔ وہ ہوا ہر مومن و مسلمان کی بغل کے نیچے لگے گی تو اس کی روح پرواز کر جائے گی۔ صرف برے لوگ باقی رہ جائیں گے جو گدھوں کی طرح لڑتے ہوں گے۔ ان پر ہی قیامت قائم ہوگی (1)۔

مسلم کی ایک روایت میں ہے دوسرا یاجوج و ماجوج کا گروہ آئے گا تو وہ کہے گا یہاں کبھی پانی تھا پھر وہ چل کر جبل خمر تک پہنچیں گے۔ یہ بیت المقدس کا پہاڑ ہے اور کہیں گے ہم نے زمین والوں کو قتل کر دیا۔ آؤ اب ہم آسمان والوں کو قتل کریں، وہ اپنے تیر آسمان کی طرف پھینکیں گے، اللہ تعالیٰ انہیں خون آلود واپس لوٹائے گا۔

ترمذی کی روایت بھی اسی طرح ہے۔ اس میں ہے کہ اللہ تعالیٰ بختی اونٹوں کی گردنوں کی طرح بڑے بڑے پرندے بھیجے گا جو انہیں (یاجوج و ماجوج) اٹھا کر لے جائیں گے اور گڑھے میں پھینک دیں گے اور مسلمان ان کے تیروں، کمانوں اور ترکشوں کو سات سال تک جلاتے رہیں گے پھر اللہ تعالیٰ بارش برسائے گا۔ الخ۔ امام بغوی نے یہ حدیث ذکر کی ہے اور پھر لکھا ہے کہ حضرت وہب فرماتے ہیں پھر یاجوج و ماجوج سمندر پر آئیں گے اور اسکا سارا پانی پی جائیں گے اور اسکے جانور کھا جائیں گے پھر وہ لکڑیاں، درخت اور لوگوں میں سے جو انہیں مل جائے گا اسے کھا جائیں گے لیکن وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ طیبہ اور بیت المقدس میں داخل نہ ہو سکیں گے (2)۔ امام بخاری نے ابوسعید الخدری کے حوالہ سے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا یاجوج و ماجوج کے نکلنے کے بعد بھی حج اور عمرہ کیا جائے گا (3)۔

وَتَرَكْنَا بَعْضَهُمْ يَوْمَئِذٍ يَمُوجُ فِي بَعْضٍ وَنُفِخَ فِي الصُّورِ فَجَمَعْنَاهُمْ جَمْعًا ﴿٩٩﴾

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 400 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 3، صفحہ 602 (الفکر) 3۔ ایضاً

''اور ہم واگزار کردیں گے بعض کو اس دن کہ وہ (تند موجوں کی طرح) دوسروں میں گھس جائیں گے اور صور پھونکا جائے گا تو ہم سب کو اکٹھا کردیں گے۔ لے''

لے بعض علماء فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس دیوار کے ریزہ ریزہ ہو جانے کے بعد یاجوج و ماجوج پانی کی موجوں کی طرح ایک دوسرے میں داخل ہوں گے اور کثرت اور دوڑنے میں سبقت لیجانے کی وجہ سے وہ ایک دوسرے میں خلط ملط ہوں گے اور بعض علماء فرماتے ہیں یہ قیامت کا منظر بیان ہو رہا ہے کہ جن و انس ایک دوسرے میں اس وقت حیران و پریشان داخل ہوں گے۔ اس آخری قول کی تائید نفخ فی الصور کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ہم صور پھونکیں گے اور ساری مخلوق کو حساب و کتاب کی خاطر ایک مٹی میں جمع کردیں گے۔

وَّعَرَضْنَا جَهَنَّمَ يَوْمَئِذٍ لِّلْكٰفِرِيْنَ عَرْضًا ﴿١٠٠﴾

''اور ہم ظاہر کریں گے جہنم کو اس دن کفار کے لئے بالکل عیاں۔ لے''

لے یعنی کافر اپنی آنکھوں سے جہنم کا مشاہدہ کریں گے۔

الَّذِيْنَ كَانَتْ اَعْيُنُهُمْ فِيْ غِطَآءٍ عَنْ ذِكْرِيْ وَكَانُوْا لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ سَمْعًا ﴿١٠١﴾

''وہ کافر جن کی آنکھوں پر پردے پڑے تھے میری یاد سے اور جو (کلمہ حق) سن بھی نہیں سکتے تھے۔ لے''

لے غطاء سے مراد ہر وہ چیز ہے جو کسی دوسری چیز کو ڈھانپ دے۔ ذکر سے مراد وجود باری تعالیٰ اور صفات باری تعالیٰ کے دلائل و آیات ہیں۔ یعنی حق کا مشاہدہ کرنے اور حق بات سننے سے محروم اس لئے تھے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کے حق میں شقاوت لکھ دی ہے اور ان کے دلوں پر پردے ڈال دیئے ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ رسول اللہ ﷺ سے بغض و عناد رکھتے ہیں اور جو اُس کے نائبین ہیں ان سے بھی عداوت رکھتے ہیں اور ان پر صفت اضلال کا عکس پڑا ہے اور ان کا مبدء تعین اسم مضل ہے۔ اس لئے یہ حق کی نہ روشنی دیکھ سکتے ہیں اور نہ حق کی آواز سن سکتے ہیں۔

اَفَحَسِبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنْ يَّتَّخِذُوْا عِبَادِيْ مِنْ دُوْنِيْٓ اَوْلِيَآءَ ۭ اِنَّآ اَعْتَدْنَا جَهَنَّمَ لِلْكٰفِرِيْنَ نُزُلًا ﴿١٠٢﴾

''کیا گمان کرتے ہیں کفار کہ وہ بنالیں گے میرے بندوں کو لے میرے بغیر حمایتی ۲ے (یہ ناممکن ہے) بیشک ہم نے تیار کر رکھا ہے جہنم کو کفار کی رہائش کے لئے ۳ے''

لے عبادی سے مراد ملائکہ مسیح اور عزیر علیہم السلام ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں عبادی سے مراد شیاطین ہیں جن کی اتباع کافر کرتے تھے مقاتل فرماتے ہیں بت مراد ہیں اور یہاں بتوں کو عباد اسی طرح کہا گیا ہے جیسا کہ ذیل کی آیت میں ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ۔ ترجمہ: بیشک وہ جنہیں تم پوجتے ہو اللہ کے سوا بندے ہیں تمہاری طرح (1)۔

۲ے دونی کو نافع' ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور ترکیب نحوی کے اعتبار سے من دونی حال ہے اولیاء سے مراد رب یا شفیع ہیں۔ عبادی اور اولیاء لیتخذوا کے مفعول ہیں اور پھر ان موصول اپنے صلہ سے مل کر حسب کے دو مفعولوں کے قائم مقام ہے اور یہاں استفہام انکاری ہے، یعنی معاملہ اس طرح نہیں ہے بلکہ میرے بندے ان کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ)

دوست نہیں دشمن ہیں، وہ ان کی نازیبا اور لایعنی حرکتوں سے ہمیشہ براءت کا اظہار کرتے ہیں کیونکہ نیک بندے طبعًا کافروں شیطانوں اور بتوں سے نفرت کرتے ہیں اور ان سے دشمنی رکھتے ہیں۔ جب قیامت کا ہولناک ہنگامہ برپا ہوگا، یہ کافر بت اور شیاطین ایک دوسرے کا انکار کریں گے اور ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور اپنے عبادت گزاروں سے براءت کا اظہار کریں گے یا حسب کا دوسرا مفعول محذوف ہے اور قرینہ کی بناء پر خبر کی طرح اس کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ یعنی کیا یہ کافر یہ خیال کرتے ہیں کہ میرے بندوں کو میرے بغیر حمایتی بنانا ان کے لئے نفع مند ہوگا (نہیں ہرگز نہیں) ابن عباس فرماتے ہیں اسکا یہ مفہوم ہے کہ کیا کافروں کا یہ گمان ہے کہ میرے بغیر حمایتی بنانے سے مجھے غصہ وغضب نہیں آئے گا اور میں ان کو سزا نہیں دوں گا(1) (یہ ان کی سوچ کتنی احمقانہ اور غلط ہے) اس تاویل پر حسب کے دونوں مفعول محذوف ہوں گے، جوانی لا اغصب ہے اور یہ جملہ دونوں مفعولوں کے قائم مقام ہے۔ اور ان یتخذوا حرف جر مقدر کے ساتھ کفروا کے متعلق ہے۔ یعنی جنہوں نے میرے بغیر ان کو حمایتی بنایا اس سبب سے انہوں نے کفر کیا۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ تقدیر کلام ابن عباس کے قول پر ہو کہ میرے بغیر میرے بندوں کو ان کا حمایتی بنانا مجھے ناراض نہیں کرے گا۔ ہرگز نہیں میں ان کو اس پر سخت سزا دوں گا۔ اس تقدیر پر دوسرا مفعول محذوف ہوگا۔

ؔ نزلاً سے مراد منزل ہے یا وہ جگہ جو مہمان کی آمد سے پہلے تیار کی جاتی ہے۔ اس ارشاد میں ان سے استہزاء اور انہیں تنبیہ ہے کہ جس عذاب کو وہ حقیر سمجھتے ہیں وہ ان کے لئے بالکل تیار ہے (ان کے وقت مقررہ کے آنے کی دیر ہے پہنچتے ہیں جہنم کے بھڑکتے شعلوں سے ان کی تواضع کی جائے گی)

قُلْ هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ﴿۱۰۳﴾

”فرمایئے (اے لوگو) کیا ہم مطلع کریں تمہیں ان لوگوں پر جو اعمال کے لحاظ سے گھاٹے میں ہیں۔ ؎“

؎ اعمالا پر نصب تمیز کی بناء پر ہے اور جمع اس لئے کہ اسم جنس اگر ذکر کیا جاتا تو وہ فاعل کے اختلاف یا اپنے مدلول کے متنوع ہونے پر دلالت نہ کرتا اگرچہ وہ اپنے مدلول کی ہر اکائی پر دلالت کرتا، اس لئے عمل کو جمع (اعمال) ذکر فرمایا تاکہ مذکورہ دونوں امروں میں سے ایک پر دلالت کرے۔

اَلَّذِيْنَ ضَلَّ سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَهُمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ يُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ﴿۱۰۴﴾

”یہ وہ لوگ ہیں جنکی ساری جدوجہد دنیوی زندگی کی آرائشگی میں کھو کر رہ گئی ہے اور وہ یہ خیال کر رہے ہیں کہ وہ کوئی بڑا عمدہ کام کر رہے ہیں۔ ؎“

؎ ضل کا معنی ضائع ہونا ہے۔ سعی کا معنی کوشش اور کاوش ہے فی الحیاۃ الدنیا، سعیھم کے متعلق ہے۔ صنعا کا معنی عمل اور کام ہے۔ الذین اسم موصول محل رفع میں ہے کیونکہ یہ مبتدا محذوف ھم کی خبر ہے، یہ سوال کا جواب ہے یا من الاخسرین سے بدل کی بناء پر مجرور ہے یا مذمت کی بناء پر منصوب ہے۔

ابن عباسؓ سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں جن کی ساری کوششیں رائیگاں ہیں وہ یہود ونصاریٰ ہیں، وہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتے ہیں حالانکہ ان کے دین منسوخ ہو چکے ہیں۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد وہ راہب ہیں جو اپنے گرجا گھروں میں رہتے ہیں(2) اور یہ خیال کرتے ہیں کہ انہوں نے آخرت کی نعمتوں کی امید پر دنیا کی ساری لذتوں کو چھوڑ رکھا ہے۔ لیکن ان کی یہ ساری جدوجہد رائیگاں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

ہے کیونکہ وہ عقیدہ کفر پر ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ بن ابی طالب فرماتے ہیں اس سے مراد خارجی ہیں(1) کیونکہ یہ پہلا فرقہ ہے جنہوں نے اہل سنت و جماعت، یعنی صحابہ کرام اور ان کے ساتھیوں سے بغاوت کی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قول کا مفہوم یہ ہے کہ یہ وہ بدعتی ہیں جو نفس کے پجاری ہیں اور انہوں نے اہل سنت و جماعت کی مخالفت کی ہے۔ پس اس میں سب فرقے رافضی معتزلہ اور دوسرے تمام گمراہ فرقے شامل ہیں۔ میں کہتا ہوں اس سے مراد کافر ہیں جو قیامت اور دوبارہ اٹھنے پر ایمان و یقین نہیں رکھتے اور صرف وہی اعمال کرتے رہے جو ان کے لئے دنیا میں نفع بخش ہوتے ہیں، انہیں آخرت کی کوئی فکر ہی نہیں اور نہ وہ دنیا کے بعد کسی چیز کا عقیدہ و تصور رکھتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں جو دنیا میں آخرت کے اعمال میں سے کوئی ایسا عمل کرتا ہے جو دنیا میں اسکے گھاٹے اور خسارے کا باعث ہے (جیسے صدقہ و خیرات' حج) تو وہ پاگل ہے۔ میری اس توجیہہ کی تائید آئندہ آیت بھی کرتی ہے۔

أُولَٰئِكَ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَلِقَائِهِ فَحَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا ﴿١٠٥﴾

"یہی وہ (بدنصیب) ہیں جنہوں نے انکار کیا اپنے رب کی آیتوں کا 1 اور اس کی ملاقات کا تو ضائع ہو گئے ان کے اعمال 2 تو ہم ان (کے اعمال تولنے) کے لئے روز قیامت کوئی ترازو نصب نہیں کریں گے 3"

1 اس آیت کریمہ میں ان لوگوں کو سخت قسم کی تنبیہ کی گئی ہے جو قیامت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں اور پھر دنیا کے اعمال کو آخرت کے اعمال پر ترجیح دیتے ہیں اور صبح و شام دنیا کے لئے سرگرداں رہتے ہیں لیکن آخرت کو سنوارنے کے لئے کچھ نہیں کرتے۔ مغفرت الٰہی اور اس کے فضل و رحمت کے حصول کے لئے کبھی کوشش نہیں کرتے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا دانشمند وہ ہے جس نے اپنے نفس کو اپنا مطیع بنایا اور مرنے کے بعد کی زندگی کو سنوارنے کے لئے نیک عمل کئے اور عاجز (کم عقل) وہ ہے جس نے اپنے نفس کی پیروی کی اور اللہ پر (جھوٹی) امید لگائے رہا(2)۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی' ابن ماجہ اور حاکم نے صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کیا ہے۔ اگر آیت میں مراد یہود و نصاریٰ ہوں تو معنی یہ ہوگا کہ وہ قیامت کا صحیح عقیدہ نہیں رکھتے اور اسکے عذاب کے ملنے کا نظریہ نہیں رکھتے۔

2 ایسے بدعقیدہ اور کمزور عقیدہ لوگوں کے اعمال جو انہوں نے دنیا کی خاطر کئے یا ثواب کی امید سے کئے سب رائیگاں ہو جائیں گے۔ ان کے کفر کی وجہ سے انہیں ان کا کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا کیونکہ نیکیوں کی قبولیت کے لئے ایمان کی نعمت کا ہونا شرط ہے۔

3 ایسے بدمذہبوں کیلئے اللہ کی بارگاہ میں کوئی قدر و منزلت نہ ہوگی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ کی بارگاہ میں (قیامت کے روز) ایک موٹا بھاری بھرکم آدمی آئے گا لیکن اللہ کی بارگاہ میں مچھر کے پر کے برابر بھی اس کا وزن نہ ہوگا اور فرمایا یہ آیت پڑھو۔ فَلَا نُقِيمُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَزْنًا(3)۔ یہ حدیث بخاری و مسلم نے نقل کی ہے۔ ابو نعیم اور الآجری نے اس آیت کے تحت جو حدیث نقل کی ہے وہ اس طرح ہے کہ ایک طاقتور بہت زیادہ کھانے والا شخص میزان میں رکھا جائے گا تو اسکا وزن ایک جو کے برابر بھی نہ ہوگا اور فرشتہ ایسے ستر آدمیوں کو ایک دھکا دے کر پھینک دے گا یا یہ معنی کہ ہم ایسے لوگوں کے لئے میزان قائم ہی نہیں کریں گے کہ ان کے اعمال کا وزن کیا جائے۔ کیونکہ ان کے سارے اعمال ضائع ہو چکے ہوں گے بلکہ بغیر وزن اور تول کے انہیں دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ جن اعمال کو وہ نیکیاں خیال کرتے ہیں ان کا میزان میں کوئی وزن نہ ہوگا۔ امام بغوی فرماتے ہیں

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 191 (التجاریۃ) 2۔ جامع ترمذی، جلد 4، صفحہ 550 (العلمیۃ)
3۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 691 (وزارت تعلیم)

حضرت ابوسعید خدری نے فرمایا لوگ قیامت کے روز اپنے اعمال لے کر آئیں گے ان کے پاس اعمال تہامہ پہاڑ کی طرح بڑے بڑے ہوں گے، جب ان کا وزن کیا جائیگا تو انکا کچھ وزن نہ ہوگا۔ ارشاد باری تعالیٰ فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزناً کا یہ مراد ہے (1)۔

امام سیوطی فرماتے ہیں اہل علم کا اختلاف ہے کہ کیا مؤمنین کے لئے میزان خاص ہے یا کفار کے اعمال کا بھی وزن کیا جائے گا۔ پہلے قول کے مؤید آیت کریمہ فلا نقیم لھم یوم القیامۃ وزناً کو دلیل بناتے ہیں اور دوسرے قول کے حمایتی یہ جواب دیتے ہیں کہ یہ ارشاد ان کے اعمال کی کوئی حیثیت نہ ہونے سے مجاز ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فِيْ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ الایۃ الی قولہ اَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَكُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ۔ ترجمہ: اور جن کے پلڑے ہلکے ہوں گے تو وہ ہی لوگ ہیں جنہوں نے نقصان پہنچایا اپنے آپ کو وہ جہنم میں ہمیشہ (جلتے) رہیں گے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ ہر شخص کے اعمال کا میزان ہونا ضروری نہیں، وہ لوگ جو بغیر حساب و کتاب کے جنت میں داخل ہوں گے ان کے لئے میزان نصب نہ ہوگا۔ اسی طرح جنہیں جلدی جلدی بغیر حساب و کتاب دوزخ میں ڈالا جائے گا ان کے لئے بھی میزان نہ ہوگا۔ اور ایسے لوگوں کا ذکر اس ارشاد میں ہے۔ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ۔ علامہ قرطبی کا یہ قول دونوں قولوں اور آیتوں کو جمع کر دیتا ہے اور وہ فریق جنہیں جلدی بھیجا جائے گا ان کے لئے میزان نہ ہوگا اور بقیہ کفار کیلئے میزان ہوگا۔ امام سیوطی نے اسی طرح لکھا ہے۔ میں کہتا ہوں آیت میں مذکورہ کفار کو منافقین اور اہل کتاب کے ساتھ خاص کرنے کا بھی احتمال ہے کیونکہ منافقین ابتداءً مسلمانوں میں رہیں گے اور ہر قوم کے اپنے معبود کے پیچھے جانے کے بعد اہل کتاب میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔

ذٰلِكَ جَزَآؤُهُمْ جَهَنَّمُ بِمَا كَفَرُوْا وَاتَّخَذُوْٓا اٰيٰتِيْ وَرُسُلِيْ هُزُوًا ﴿۱۰۶﴾

''یہ ہے ان کی جزا جہنم اس وجہ سے کہ انہوں نے کفر کیا اور میری آیتوں اور رسولوں کو مذاق بنالیا۔ 1''

1۔ ذالک کا مشار الیہ۔ ان کے اعمال کا سقوط اور ان کا بے قدر ہونا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے (یعنی ذالک مبتدا محذوف کی خبر ہے) اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاءھم مبتدا ثانی ہو اور جہنم خبر ہو پھر جملہ اسمیہ ذالک کی خبر ہو اور ضمیر عائد محذوف ہو اور یہ بھی جائز ہے کہ ذالک مبتدا ہو اور جزاء ھم اس کا بدل ہو اور جھنم کی خبر ہو۔ یا جزاء ھم ذالک کی خبر ہو اور جھنم خبر کا عطف بیان ہو۔ ھزواً کا معنی مذاق کرنا ہے اور یہاں مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ﴿۱۰۷﴾

''یقیناً وہ لوگ جو ایمان لائے اور نیک عمل (بھی) کرتے رہے تو فردوس کے باغات ان کی رہائش گاہ ہوں گے۔ 1''

1۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے فرمایا جب اللہ تعالیٰ سے سوال کرو تو فردوس کا سوال کرو کیونکہ وہ بہتر جنت ہے، اور اعلیٰ جنت ہے، اس کے اوپر رحمٰن کا عرش (عظیم) ہے، اسی سے جنت کی نہریں پھوٹتی ہیں (متفق علیہ) (2) ترمذی اور حاکم نے عبادہ بن الصامت سے اور بیہقی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا جنت کے سو درجے ہیں اور ہر دو درجوں کے درمیان زمین اور آسمان جیسا فاصلہ ہے۔ فردوس جنت کا اعلیٰ درجہ ہے اور اس کے اوپر عرش ہے اور اس سے جنت کی چار نہریں نکلتی ہیں جب تم اللہ سے سوال کرو تو اس سے فردوس کا سوال کرو۔

بزار نے عرباض بن ساریہ سے، طبرانی نے ابی امامہ سے اسی طرح روایت کی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ) 2۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 391 (وزارت تعلیم)

جب تم اللہ تعالیٰ سے مانگو تو فردوس مانگو کیونکہ وہ جنت کا اعلیٰ مقام ہے(1)۔حضرت ابی امامہ کی حدیث میں یہ زائد ہے کہ اہل فردوس عرش کی چر چراہٹ کو سنتے ہیں۔امام بغوی فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا جنتوں میں سے فردوس سے کوئی اعلیٰ جنت نہیں ہے، اسمیں نیکی کا حکم کرنیوالے اور برائی سے روکنے والے داخل ہونگے۔مقاتل فرماتے ہیں فردوس جنت کا بلند، بہتر، افضل اور نعمتوں سے لبریز مقام ہے(2)۔

احمد طیالسی اور بیہقی نے ابوموسیٰ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جنت الفردوس چار ہیں، دوسونے کی ہیں جن کے زیور، مکان اور ہر چیز سونے کی ہے اور دو جنتیں چاندی کی ہیں۔الحدیث۔یہ حدیث دلالت کرتی ہے کہ ہر جنت کو فردوس کہا جاتا ہے۔ لیکن پہلا قول صحیح ہے، اس حدیث میں راوی سے سہو ہوا ہے یا یہاں فردوس کا لغوی معنی مراد ہے۔کعب فرماتے ہیں فردوس ایک باغ ہے جس میں انگور ہیں۔مجاہد فرماتے ہیں فردوس رومی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی باغ ہے۔عکرمہ فرماتے ہیں یہ حبشی زبان میں باغ کے لئے استعمال ہوتا ہے۔زجاج فرماتے ہیں یہ رومی لفظ ہے عربی کی طرف منتقل ہو کر آیا ہے۔ضحاک فرماتے ہیں فردوس سے مراد ایسا باغ ہے جس کے درخت بہت گھنے ہوں۔بعض فرماتے ہیں اس سے مراد خوبصورت باغ ہے۔بعض فرماتے ہیں فردوس سے مراد وہ باغ ہے جس میں قسم قسم کے پودے ہوں اور اس کی جمع فرادیس ہے(3)۔تو ابوموسیٰ کی روایت میں فردوس کا لفظ لغوی معنی کے اعتبار سے مستعمل ہوا ہے لیکن معنی علمی کے اعتبار سے جنت کا اعلیٰ مقام ہے اگر آیت میں لغوی معنی مراد ہو تو اسم موصول اپنے عموم پر ہوگا، یعنی عام مومنین مراد ہوں گے اور اگر معنی علمی مراد ہو تو الذین امنوا سے مراد وہ لوگ ہوں گے جن کے پاس ایمان کامل موجود ہے۔

بیہقی نے حضرت انس کے حوالہ سے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فردوس کو اپنے دست قدرت سے پیدا فرمایا ہے اور مشرک اور دائمی شراب خور پر اس میں داخلہ ممنوع قرار دیا ہے۔ابن ابی الدنیا نے صفۃ الجنہ میں عبداللہ بن الحارث بن نوفل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے تین چیزوں کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا ہے۔آدم علیہ السلام کو اپنے ہاتھ سے پیدا فرمایا، تورات کو اپنے ہاتھ سے لکھا، فردوس کو اپنے ہاتھ سے لگایا۔فرمایا اپنی عزت وجلال کی قسم فردوس میں ہمیشہ شراب پینے والا اور دیوث داخل نہ ہوں گے۔صحابہ کرام نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! دیوث کون ہے؟ فرمایا جو اپنی بیوی میں زنا کی برائی کو دیکھتا ہے اور پھر اس میں سستی کا مظاہرہ کرتا ہے(4)۔

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا لَا يَبْغُوْنَ عَنْهَا حِوَلًا ﴿۱۰۸﴾

''وہ ہمیشہ رہیں گے ان میں (اور) نہیں چاہیں گے کہ وہ اس جگہ کو بدل لیں۔ ۱ ''

۱ خالدین فیھا حال مقدرہ ہے، وہ اس جگہ کو نہیں بدلیں گے کیونکہ جنت الفردوس سے زیادہ عمدہ جگہ ہے ہی نہیں کہ وہ اس کا اشتیاق کریں۔یہ بھی جائز ہے کہ اس جملہ سے مراد ان کے جنت میں ہمیشہ رہنے کی تاکید ہو۔حاکم وغیرہ نے ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ قریش نے یہود سے کہا کہ تم ہمیں کوئی سوال بتاؤ جو ہم اس شخص (محمد ﷺ) سے پوچھیں۔تو یہود نے کہا تم اس سے روح کی حقیقت کے متعلق سوال کرو۔انہوں نے سوال کیا تو يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ ؕ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا۔ کا ارشاد نازل ہوا۔یہود نے کہا ہمیں علم کثیر عطا کیا گیا ہے، ہمیں تورات ملی ہے اور جسے تورات کا علم دیا گیا ہوا سے خیر کثیر عطا کیا گیا ہوتا ہے۔

1۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 457 (العلمیہ) 2۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)
3۔ایضاً 4۔کنز العمال، جلد 6، صفحہ 31-130 (التراث الاسلامی)

اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی۔

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾

"(اے حبیب) آپ فرمائیے کہ اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے رب کے کلمات (لکھنے) کے لئے تو ختم ہو جائے گا سمندر اس سے پیشتر کے ختم ہوں میرے رب کے کلمات اور اگر ہم لے آئیں اتنی اور روشنائی اس کی مدد کو (تب بھی ختم نہ ہوں گے) [1]"

[1] **مداد** کا معنی ہر وہ چیز ہے جس کے ذریعہ سے دوسری شی کی امداد کی جائے جیسے دوات کے لئے سیاہی اور چراغ کے لئے تیل۔ مداد کا اصل معنی زیادتی اور کسی چیز کا یکے بعد دیگرے آنا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اگر سارے سمندر قلم کے لئے سیاہی بن جائیں اور قلم اللہ تعالیٰ کے علوم وحکمت کے کلمات کو لکھنا شروع کر دے (1) تو سارے سمندروں کا پانی ختم ہو جائے گا لیکن اس کے کلمات علم وحکمت کی انتہا نہ ہوگی کیونکہ ہر چیز کی انتہا اور حد ہے لیکن اس کے کلمات علم وحکمت لامحدود اور لا متناہی ہیں، وہ کبھی ختم نہ ہوں گے۔ تنفد کو حمزہ اور کسائی نے یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے۔ فرمایا اگر چہ ہم اس سمندر کی مثل بطور روشنائی ایک اور سمندر بھی لے آئیں تو پھر بھی اس کی شان کو مکمل کرنے سے پہلے وہ ختم ہو جائیں کیونکہ متناہی (ختم ہونے والا) کا مجموعہ بھی متناہی ہوتا ہے۔ اجسام میں سے جو چیز وجود میں داخل ہوتی ہے وہ متناہی ہوتی ہے اور متناہی لامحالہ غیر متناہی سے پہلے ختم ہو جاتا ہے۔ میں کہتا ہوں اگر ہم سمندر یا سات سمندر اور اس کی مثل زائد سمندر فرض کریں اور اس کے ذریعہ سے علم الٰہی کے کلمات کو لکھا جائے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کلمات میں سے ہر جزء جو قلم کے ساتھ قائم ہوگا اس جزء پر گزشتہ زمانہ میں طاری ہونے والے احوال لکھنا قلم کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ اگر چہ وہ احوال متناہی ہی ہوں۔ پس اللہ کی دوسری ممکنات کے متعلق معلومات کا احاطہ کیسے ممکن ہوگا۔ متناہی کے لئے غیر متناہی کا احاطہ کرنا بہت بعید ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا کہ یہود نے کہا تم خود کہتے ہو کہ ہمیں حکمت عطا کی گئی ہے اور تمہاری کتاب قرآن حکیم میں ہے کہ جسے حکمت دی گئی اسے خیر کثیر دیا گیا۔ پھر آپ کہتے ہیں تمہیں تھوڑا علم دیا گیا ہے۔ اس وقت اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی (2) کہ وہ علم جو اس کتاب میں فی نفسہ خیر کثیر ہے کیونکہ اسمیں تمہاری معیشت وآخرت کی صلاح کے تمام احکام موجود ہیں لیکن یہ اللہ تعالیٰ کے کلمات کے سمندروں کا ایک قطرہ ہے۔

بمثلہ میں با تعدیہ کے لئے ہے اور مثلہ جئنا کا مفعول ہے اور مدادا تمیز ہے جیسا کہ علی التمرۃ مثلہا زبدا ہے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿۱۱۰﴾

"(اے پیکر رعنائی وزیبائی!) آپ فرمائیے کہ میں بشر ہی ہوں تمہاری طرح وحی کی جاتی ہے میری طرف کہ تمہارا خدا صرف اللہ وحدہ ہے [1] پس جو شخص امید رکھتا ہے اپنے رب سے ملنے کی [2] تو اسے چاہئے کہ وہ نیک عمل کرے اور نہ شریک کرے اپنے رب کی عبادت میں کسی کو [3]"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)

لے ابن عباس فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول مکرم ﷺ کو اس آیت کریمہ میں اظہار تواضع کا درس دیا ہے تاکہ اس کی مخلوق پر اپنی بڑائی نہ کرتے رہیں۔ حکم دیا کہ خود ہی اقرار کرو کہ میں تمہاری مثل بشر ہوں لیکن مجھے وحی کے لئے مخصوص فرمایا گیا ہے اور مجھے وحی کی عزت عطا کی گئی ہے۔ میری طرف وحی کی گئی کہ تمہارا خدا ایک ہے جس کا ذات وصفات میں کوئی شریک نہیں ہے(1)۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ میں اس فتنہ کا سدباب کیا گیا ہے جس میں نصرانی مبتلا ہوئے تھے، جبکہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھے تھے کہ اندھوں کو بینا کر دیتے ہیں۔ برص شدہ مریضوں کو درست کر دیتے ہیں۔ مردوں کو زندہ کر دیتے ہیں۔ (تو انہوں نے آپ کو خدا کا بیٹا کہنا شروع کر دیا تھا) حضور نبی رحمت ﷺ کو عیسیٰ علیہ السلام سے کئی گنا زیادہ معجزات عطا کئے گئے تھے۔ آپ کے معجزات کو دیکھ کر اس بدعقیدگی میں لوگوں کے مبتلا ہونے کا زیادہ امکان تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا کہ تم اپنی ان ساری عظمتوں اور ان گنت کمالات کے ہوتے ہوئے اعلان کرو کہ میں اللہ کا عبد ہوں۔ وہ میرا معبود ہے۔ اللہ ایک ہے۔ اس کا کوئی شریک وہمسر نہیں ہے۔

۲ے امام بغوی فرماتے ہیں یہاں رجاء کا لفظ خوف وامید کے معنی میں استعمال ہوا ہے جیسا کہ شاعر نے استعمال کیا ہے۔

فلا کل ما ترجو من الخیر کائن و کل ما ترجو من الشر واقع

یعنی جس خیر کی تم امید کرتے ہو ضروری نہیں کہ تمہاری خواہش وامید پوری ہو جائے اور برائی جس کا تمہیں خوف ہے اس کا واقع ہونا بھی یقینی نہیں ہے(2)۔

۳ے جو حسن ثواب اور رؤیت باری تعالیٰ کا متمنی ہے تو اسے چاہئے کہ وہ صرف اس کی رضا کے لئے اعمال صالحہ کرے عمل میں ریاء کاری، نمود و نمائش کا زہر بالکل نہ ہو اور اپنے عمل پر کسی غیر سے جزاء و ثناء کا خواہش مند نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے کتاب الاخلاص میں طاؤس سے روایت کیا ہے کہ ایک شخص نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں موقف حج میں کھڑا ہوتا ہوں اور مقصود اللہ کی رضا ہوتی ہے اور میری یہ بھی خواہش ہوتی ہے کہ میرا یہاں کھڑا ہونا دیکھا جائے (یعنی لوگ مجھے دیکھ لیں) آپ ﷺ نے اس شخص کی بات سن کر کوئی جواب نہ دیا حتی کہ یہ آیت فمن کان یرجو الایہ نازل ہوئی۔ یہ حدیث مرسل ہے۔ حاکم نے مستدرک میں متصل عن طاؤس عن ابن عباس کے سلسلہ سے نقل کی ہے اور شیخین کی شرط پر اسے ضعیف کہا ہے۔

ابن ابی حاتم نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں مسلمانوں میں سے ایک شخص جہاد کرتا تھا اور وہ یہ بھی پسند کرتا تھا کہ اس کے جہاد کو دیکھا جائے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی من کان یرجو لقاء ربہ الایة۔

ابونعیم اور ابن عساکر نے اپنی تاریخ میں سدی الصغیر عن الکلبی عن ابی صالح عن ابن عباس کے طریق سے روایت کیا ہے کہ جندب بن زہیر جب نماز پڑھتے یا روزہ رکھتے یا صدقہ کرتے اور لوگوں میں اپنے عمل کا تذکرہ سنتے تو خوش ہوتے تھے اور اس خوشی میں نیکی میں اور اضافہ کرتے اس پر یہ آیت فمن کان یرجوا الخ نازل ہوئی(3)۔ اگر یہ کہا جائے کہ ترمذی شریف کی روایت میں ہے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں نے عرض کی یارسول اللہ ﷺ میں اپنے گھر میں نماز پڑھ رہا تھا، میرے پاس ایک شخص آیا مجھے یہ بات بڑی اچھی لگی کہ اس نے مجھے نماز کی حالت میں دیکھا ہے۔ رسول کریم ﷺ نے فرمایا اے ابوہریرہ رضی اللہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 192 (التجاریہ)

2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 193 (التجاریہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 69-458 (العلمیہ)

تعالٰی عنہ اللہ تجھ پر رحم فرمائے تیرے لئے دو اجر ہیں ایک خفیہ عبادت کرنے کا اجر دوسرا اعلانیہ عبادت کا اجر۔

مسلم میں ابوذر سے روایت ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا گیا حضور بتائیں کہ جو شخص نیک عمل کرتا ہے اور لوگ اس کی اس عمل پر تعریف کرتے ہیں (اس کو اجر ملے گا) فرمایا یہ مومن کو جلدی ملنے والی بشارت ہے (1)۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ دونوں احادیث آیت کے شان نزول میں ذکر کی گئی، احادیث کے منافی ہیں ان میں تطبیق کس طرح ہوگی۔

ہم کہتے ہیں ان دونوں قسم کے ارشادات میں کوئی تضاد اور تخالف نہیں ہے کیونکہ آیت کے شان نزول میں جو احادیث نقل کی گئی ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ جو نیک عمل کرتا ہے اور یہ چاہتا ہے کہ لوگ اس کے عمل کو دیکھیں اور اس کے عمل کی تعریف کریں یا وہ عمل میں زیادتی کرتا ہے جب اس کو لوگ دیکھیں تو یہ سب ریاکاری اور شرک خفی ہے۔ اور جو شخص نیک عمل کرتا ہے، لوگ اس کو دیکھ کر اس کی تعریف کرتے ہیں اور وہ اس پر خوش ہوتا ہے، جبکہ اس کا مقصود اس عمل سے لوگوں کی ثناء اور ان سے اجر لینا نہیں ہے اور ان کی خاطر وہ عمل میں زیادتی نہیں کرتا۔ تو یہ اس کو جلدی ملنے والی بشارت ہے اور اس کو خفی اور اعلانیہ عبادت کا دوہرا اجر بھی ملے گا۔ واللہ اعلم۔

جندب سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو لوگوں کو سنانے کے لئے عمل کرتا ہے اللہ تعالٰی اس کو سنانے کی جزا دیتا ہے اور جو ریاءکاری کا عمل کرتا ہے تو اللہ تعالٰی اسے ریاءکاری کی سزا دیتا ہے۔ (بخاری و مسلم) (2)

محمد بن لبید سے مروی ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا مجھے تم پر سب سے زیادہ خوف شرک اصغر کا ہے۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ شرک اصغر (چھوٹا) کیا ہے۔ فرمایا ریاءکاری۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے بیہقی نے شعب الایمان میں یہ مفہوم زائد لکھا ہے کہ اللہ تعالٰی اپنے بندوں کو نیک اعمال کی جزاء عطا فرما رہا ہوگا' تو ریاءکاروں سے فرمائے گا تم اپنے اعمال کا اجر طلب کرنے کے لئے ان لوگوں کے پاس جاؤ جن کو تم دکھانے کے لئے دنیا میں عمل کرتے تھے اور دیکھو کیا تم انکے پاس جزاء اور خیر پاتے ہو (3)۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالٰی عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں شرک اصغر سے بچو پوچھا گیا شرک اصغر کیا ہے فرمایا ریاءکاری۔ اس اثر کو ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں، اصبہانی نے ترتیب و ترغیب میں روایت کیا ہے۔

ابوہریرہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالٰی فرماتے ہیں میں شریکوں کے شرک سے مستغنی ہوں۔ جس نے کوئی عمل کیا اور اس میں میرے ساتھ غیر کو شریک کیا تو میں اسے اور اس کے شرک کو چھوڑ دیتا ہوں۔ ایک روایت میں ہے کہ میں اس سے بری ہوں، وہ اس کے لئے ہے جس کے لئے اس نے عمل کیا (4) اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابوسعید بن ابی فضالہ رسول اللہ ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالٰی قیامت کے دن لوگوں کو جمع فرمائے گا جس دن کے آنے میں کوئی شک نہیں ہے تو ایک ندا دینے والا ندا دے گا جس نے کسی نیک عمل میں کسی غیر اللہ کو شریک کیا آج اسے چاہئے کہ غیر اللہ سے اپنا ثواب طلب کرے۔ اللہ تعالٰی نے فرمایا میں شرکاء اور شرک سے بے نیاز ہوں (5)۔ اس حدیث کو امام احمد' ترمذی' ابن ماجہ' ابن حبان اور بیہقی نے روایت کیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جو شخص نیک عمل لوگوں کو سنانے کے

1۔ مشکاۃ المصابیح، صفحہ 454 (قدیمی) 2۔ ایضاً 3۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 333 (العلمیہ)
4۔ ایضاً، صفحہ 229 5۔ ایضاً، صفحہ 330

لئے کرے گا اللہ تعالیٰ اسے سنانے کی سزا دے گا۔ اللہ تعالیٰ اسے حقیر فرمائے گا اور اسکو رسوا کرے گا(1)۔ اس حدیث کو امام احمد اور بیہقی نے شعب الایمان میں روایت کیا ہے۔

حضرت شداد بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جس نے ریاء کاری سے نماز پڑھی اس نے شرک کیا۔ جس نے ریا کاری سے روزہ رکھا اس نے شرک کیا۔ جس نے ریا کاری سے صدقہ دیا اس نے شرک کیا(2)۔ اس حدیث کو امام احمد نے روایت کیا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز سربمہر صحیفے لائے جائیں گے اللہ تعالیٰ فرمائے گا ان صحیفوں کو پھینک دو اور ان کو قبول کرلو فرشتے عرض کریں گے تیری عزت کی قسم ہم نے ان اعمال ناموں میں وہ کچھ لکھا ہے جو انہوں نے کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا یہ اعمال میری رضا کے لئے نہیں تھے اور نہ میں آج انہیں قبول کرتا ہوں اور نہ ان اعمال میں میری خوشنودی مطلوب تھی(3)۔ اس حدیث کو بزار طبرانی نے الاوسط میں دارقطنی' اصبہانی نے الترغیب میں روایت کیا ہے۔

شہر بن عطیہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص کو قیامت کے روز حساب کے لئے پیش کیا جائے گا، اس کے نامہ اعمال میں پہاڑوں کی مثل نیکیاں ہوں گی۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا تو نے فلاں دن اس لئے نماز پڑھی تھی کہ تجھے نمازی کہا جائے۔ میں اللہ ہوں میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے، خالص دین میرے لئے ہے اور تو نے فلاں دن روزہ رکھا تھا کہ تجھے روزہ دار کہا جائے، میں اللہ ہوں 'میرے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور خالص دین میرے لئے ہے پھر یکے بعد دیگرے اس کے سارے ریاء کاری والے عمل مٹا دیئے جائیں گے۔ فرشتے اسے کہیں گے تو نے غیر اللہ کے لئے عمل کئے تھے۔

شداد بن اوس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ پہلے اور پچھلے تمام لوگوں کو حد نظر تک ایک جگہ جمع فرمائے گا۔ ایک پکارنے والا لوگوں کو یہ بات سنائے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میں شریک سے بہتر ہوں ہر وہ عمل جو دنیا میں میرے لئے کیا گیا اور اس میں غیر کو بھی شریک کیا گیا' تو آج میں اپنے شریک کو ترک کرتا ہوں اور آج میں کوئی عمل قبول نہیں کرتا مگر وہ جو خالصاً میری رضا کے لئے کیا گیا تھا(4)۔ اس حدیث کو اصبہانی نے روایت کیا ہے۔

حضرت ابن عباس سے مروی ہے کہ جس نے دوسروں کو دکھانے کے لئے کوئی عمل کیا تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کام کو اسی کے سپرد کرے گا جس کے لئے اس نے عمل کیا تھا اور فرمائے گا دیکھ شریک تجھے کچھ نفع پہنچا سکتا ہے۔ صوفیاء کرام اس آیت کی تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ جو دنا فتدلیٰ فکان قاب قوسین او ادنیٰ پر بلاکیف قرب الٰہی چاہتا ہے، اسے چاہئے کہ فنا نفس اور رذائل نفس کے ازالہ کے بعد عمل صالح کرے کیونکہ نفس کے رذائل عمل کو فاسد کر دیتے ہیں اور عمل کی اصلاح صرف فناء نفس کے بعد ہوتی ہے۔ ولا یشرک بعبادۃ ربہ احداً کا مطلب یہ ہے کہ اس شخص کا غیر اللہ کے ساتھ نہ قلبی تعلق ہو نہ علمی علاقہ ہو اور نہ محبت کا تعلق ہو کیونکہ دل کے علمی تعلق سے مراد ذکر ہے اور ذکر عبادت ہے۔ محبت عبادت کا تقاضا کرتی ہے اور محبوب وہ ہے جو معبود ہے کیونکہ عبادت انتہا درجہ کی تواضع اور ذلت کو کہتے ہیں۔ انسان اپنے نفس کی تذلیل کرتا اور اپنے محبوب کی بارگاہ میں انتہا درجہ کی تواضع کرتا ہے۔ اور یہ خیر فناء

1۔ شعب الایمان، جلد 5، صفحہ 331 (العلمیہ)
2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 460 (ایضاً)
2۔ معجم اوسط از طبرانی، جلد 3، صفحہ 287 (المعارف)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 459 (العلمیہ)

قلب کے بعد حاصل ہوتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ غیر اللہ کے ساتھ علمی تعلق تو اولیاء کرام بلکہ انبیاء کو بھی ہوتا ہے تو ہم اس کے جواب میں یہ کہیں گے کہ علم جو فناء قلب کے بعد ہوتا ہے اس کا محل قلب نہیں ہوتا بلکہ اس کا دل تو اس مقام پر رحمٰن کی تجلیات کا مرکز ہوتا ہے لیکن علم کا تعلق اس محل کے علاوہ کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ حکمت کے تقاضا کے مطابق تکلیف احکام کا مادہ اب بھی باقی ہوتا ہے۔

فصل

حضرت ابوالدرداء نبی کریم ﷺ سے روایت فرماتے ہیں کہ سورۂ کہف کی پہلی دس آیتیں جسے یاد ہوں گی وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ رہے گا (1)۔ اس حدیث کو مسلم، احمد، ابوداؤد اور نسائی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے ابودرداء سے اس طرح روایت کی ہے کہ جو سورۂ کہف کی پہلی تین آیات پڑھے گا وہ دجال کے فتنہ سے بچ جائے گا۔ امام ترمذی فرماتے ہیں یہ حدیث حسن صحیح ہے۔ حضرت سہل بن معاذ حضرت انس سے اور وہ حضور سے روایت کرتے ہیں کہ جو سورۂ کہف کا اول و آخر پڑھے گا وہ اس کیلئے پاؤں سے سر تک نور اور جو ساری سورت تلاوت کرے گا وہ اس کے لئے زمین سے آسمان تک نور ہوگی۔ امام احمد، مسلم اور نسائی نے اس طرح روایت کی ہے جس نے سورۂ کہف کی آخری دس آیات پڑھیں وہ دجال کے فتنہ سے محفوظ ہوگا۔

نبی کریم ﷺ سے مروی ہے جس نے اپنے بستر پر سورۂ کہف پڑھی تو اس کی سونے کی حالت میں ایک نور ہوگا جو اس کے لئے اس کے بستر سے مکہ تک جگمگائے گا اور اس نور کے اندر فرشتے ہوں گے جو اس کے اٹھنے کے وقت تک اس کے لئے دعا مغفرت کرتے رہیں گے۔ اگر اس کا سونے کا مقام مکہ میں ہوگا تو اس کے لئے نور ہوگا جو اس کے بستر سے بیت المعمور تک چمکے گا، اس میں فرشتے ہوں گے جو اس کے بیدار ہونے تک اس کے لئے دعا کرتے رہیں گے۔ اس حدیث کو ابن مردویہ نے نقل کیا ہے۔ حضرت ابو سعید سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو سورۂ کہف جمعہ کے دن تلاوت کرے گا تو اس جمعہ اور آئندہ جمعہ کے درمیان اس کے لئے وہ نور روشنی کرے گا (2)۔ اس حدیث کو حاکم نے روایت کیا ہے اور صحیح کہا ہے اور بیہقی نے دعوات کبیر میں نقل کی ہے۔

بیہقی نے شعب الایمان میں اس طرح روایت کی ہے کہ جو جمعہ کے دن سورۂ کہف کی تلاوت کرنے گا اس کے پاس سے کعبہ تک اس کے لئے نور چمکتا رہے گا۔ براء بن عازب سے مروی ہے، فرماتے ہیں ایک شخص سورۂ کہف کی تلاوت کر رہا تھا اور اسکے قریب ایک گھوڑا دو رسیوں سے باندھا ہوا تھا۔ پس ایک بادل اس پر چھانے لگا اور چکر لگانے لگا اور قریب آنے لگا۔ اور اس کے گھوڑے نے اس بادل کے قریب ہونے کی وجہ سے بدکنا شروع کر دیا۔ صبح وہ شخص نبی کریم ﷺ کی بارگاہ میں حاضر ہوا، اس نے رات کا ماجرا عرض کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا یہ (بادل) وہ سکینت تھی جو تلاوت قرآن کے وقت نازل ہوتی ہے (2)۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے روایت کیا ہے۔ حضرت عمر بن خطاب سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص رات کو فمن کان یرجوا لقاء ربه الایه تلاوت کرے گا، اس کے لئے عدن سے مکہ تک نور ہوگا جس میں فرشتے بھرے ہوں گے (ازالۃ الخفاء)

اللہ تعالیٰ کی تائید و توفیق سے سورۂ کہف کا ترجمہ بروز اتوار دس بج کر بیس منٹ پر صبح ختم ہوا۔

الحمد للّٰه رب العالمین الصلوٰۃ والسلام علیٰ سید المرسلین

1۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 271 (قدیمی) 2۔ مستدرک حاکم، جلد 2، صفحہ 399 (العلمیۃ)

اللهم انی اعوذبک من الهم والحزن واعوذبک من العجز والکسل واعوذ
اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں حزن وملال سے تجھ سے پناہ مانگتا ہوں عجز اور سستی سے اور
بک من الجبن والبخل واعوذبک من غلبة الدین وقهر الرجال
تجھ سے پناہ مانگتا ہوں بزدلی اور بخل سے اور تجھ سے پناہ مانگتا ہوں قرض کے غلبہ اور انسان کے قہر سے۔

اللّٰهم انی اعوذبک من ان اشرک بک وانا اعلم واستغفر لما لا اعلم
اے اللہ میں تجھ سے پناہ مانگتا ہوں کہ میں تیرے ساتھ دانستہ شرک کروں اور میں تجھ سے مغفرت طلب کرتا ہوں اس شرک سے جو نادانستہ مجھ سے سرزد ہو۔

اللّٰهم امین بجاه سیدالانبیاء والمرسلین صلی اللّٰه علیه وآله واصحابه وازواجه وعلماء امته و اولیاء ملته اجمعین۔

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 749 (وزارت تعلیم)

سورۂ مریم

آیاتہا ۹۸ سُورَةُ مَرْيَمَ مَكِّيَّةٌ ۱۹ رکوعاتہا ۶

سورۂ مریم مکی ہے،اس میں 6 رکوع اور 98 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

كٓهٰيٰعٓصٓ ۝

''کاف۔ہا۔یا۔عین۔ص۔ لے''

لے ابوبکر اور کسائی نے ھا اور یاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ابن کثیر اور حفص نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ،ابن عامر اور حمزہ نے ھا کے فتحہ اور یاء کے امالہ کے ساتھ،نافع نے ھا کو امالہ کے ساتھ اور یاء کو بین بین پڑھا ہے۔

ذِكْرُ رَحْمَتِ رَبِّكَ عَبْدَهٗ زَكَرِيَّا ۝

''یہ ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی۔ لے''

لے حضرت نافع اور عاصم ذکر سے پہلے صاد کو ظاہر کرتے ہیں اور باقی قراء صاد کو ذال میں ادغام کرتے ہیں۔

اگر حروف مقطعات سے مراد سورت یا قرآن ہو تو ذکر رحمت ربک الخ خبر ہوگا یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ھذا المتلو ذکر رحمت ربک (یہ تلاوت کیا گیا ذکر ہے آپ کے رب کی رحمت کا) یا ذکر رحمت ربک (یعنی جو تجھ پر پڑھا گیا ہے اس میں تیرے رب کی رحمت کا ذکر ہے) عبدہ' رحمت یا ذکر کا مفعول ہے،اس تقدیر پر کہ رحمت' ذکر کا فاعل ہو جیسا کہ اس جملہ میں ہے ذکرنی جود زید اور زکریا' عبدہ سے بدل ہے یا عطف بیان ہے **ذکر** کو حمزہ' کسائی اور حفص نے قصر کے ساتھ اور دوسرے قراء نے مد کے ساتھ پڑھا ہے۔

اِذْ نَادٰى رَبَّهٗ نِدَآءً خَفِيًّا ۝

''جب اس نے پکارا اپنے رب کو چپکے چپکے۔ لے''

لے اذ ظرف ہے جو رحمت یا ذکر کے متعلق ہے۔یعنی حضرت زکریا علیہ السلام نے اپنی عبادت گاہ میں آدھی رات کے وقت آہستہ آہستہ اپنے کریم رب کے حضور التجاء کی۔آہستہ اور خفیہ لہجہ میں اس لئے دعا کی کیونکہ سری اور خفی دعا میں اخلاص زیادہ ہوتا ہے۔اخفاء دعا کی سنت ہے۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ وَهَنَ الْعَظْمُ مِنِّيْ وَاشْتَعَلَ الرَّاْسُ شَيْبًا وَّلَمْ اَكُنْۢ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا ۝

''عرض کی اے میرے رب لے میری حالت یہ ہے کہ کمزور و بوسیدہ ہوگئی ہیں میری ہڈیاں اور بالکل سفید ہوگیا ہے (میرا) سر بڑھاپے کی وجہ سے ٣ے اور اب تک ایسا نہیں ہوا کہ میں نے تجھے پکارا ہو اے میرے رب! اور میں نامراد رہا

ہوں۔[3]''

[1] یہاں سے حضرت زکریا علیہ السلام کی درد مندانہ التجاء کا ذکر ہو رہا ہے۔ رب اصل میں یاربی تھا۔ حرف ندا اور مضاف الیہ کو اختصار کی خاطر حذف کیا گیا ہے۔ وھن کا معنی کمزور اور نرم ہونا ہے۔ وھن کی نسبت العظم (ہڈی) کی طرف کی گئی ہے کیونکہ ہڈیاں جسم کا مدار اور بدن کی اصل ہیں یا اس لئے کہ بدن کے اعضاء میں سے ہڈیاں مضبوط ترین عضو ہیں' جب ہڈیاں ناتواں اور کمزور ہوگئی ہیں تو بقیہ اعضاء زیادہ کمزور ہوں گے۔ اور **العظم** (ہڈی) کو مفرد ذکر فرمایا ہے لیکن مراد جنس ہے۔

[2] بڑھاپے کو آگ کے ساتھ تشبیہ دی ہے کیونکہ وہ بھی سفید ہوتا ہے اور آگ کے اشتعال کی طرح بالوں میں پھیل جاتا ہے۔ مبالغہ کے لئے اشتعال کی نسبت سر کی طرف فرمائی اور شیبا کو بطور تمیز ذکر فرمایا اور اس جملہ میں اشارہ فرما دیا کہ بڑھاپا پورے سر کو گھیر چکا ہے سب بال اولوں کی طرح سفید ہو چکے ہیں۔ الراس پر الف لام مضاف الیہ کے عوض میں ہے۔ الف لام پر اکتفاء فرمایا اور مضاف الیہ کو ذکر نہیں فرمایا کیونکہ مراد کا ظہور تقیید سے مستغنی کر دیتا ہے (مخاطب کا علم قید لگانے سے مستثنیٰ کر دیتا ہے کیونکہ آپ اپنے سر کی حالت بیان فرما رہے تھے کسی غیر کے سر کی نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے میرے پروردگار میں بوڑھا ہو چکا ہوں (اس جملہ میں جو لطائف ہیں ان کی وجہ سے بلاغت کے اعتبار سے انتہائی بلند درجے پر ہے)

علماء کا اختلاف ہے کہ جب آپ نے یہ التجاء کی تھی اس وقت آپ کی عمر کتنی تھی۔ بعض علماء فرماتے ہیں آپ کی عمر مبارک ساٹھ سال تھی۔ ابن ابی حاتم نے ابن المبارک سے یہی قول روایت کیا ہے۔ بعض فرماتے ہیں ستر سال تھی۔ یہ قول عبدالرزاق اور ابن ابی حاتم نے ثوری سے نقل کیا ہے۔ المحلی فرماتے ہیں آپکی عمر مبارک ایک سو بیس سال تھی اور آپ کی اہلیہ محترمہ اٹھانوے سال کو پہنچ چکی تھیں۔

[3] اے میرے کریم رب ماضی میں جب بھی میں نے تیری بارگاہ بے نیاز میں دست طلب دراز کیا تو تو نے ہمیشہ میری التجاؤں کو شرف قبولیت بخشا تو نے کبھی مجھے نامراد و مایوس نہیں لوٹایا۔ میری آرزوؤں کی شاخ کو ثمر بار کرنا ہمیشہ سے تیری سنت رہی ہے۔ آج بھی میں تجھ سے قبولیت کی امید لے کر آیا ہوں۔ کریم اپنے در کرم کے امیدواروں کو کبھی نامراد نہیں لوٹاتا۔ دعا مصدر ہے جو اپنے مفعول کی طرف مضاف ہے تقدیر اس طرح ہے بدعائی ایاک۔ اور یہ بھی جائز ہے کہ فاعل کی طرف مضاف ہو۔ اس تاویل پر معنی یہ ہوگا کہ جب تو نے مجھے ایمان کے لئے دعوت دی تو میں تجھ پر ایمان لے آیا۔ ایمان کی روشنی کو ترک کر کے میں بدبخت و نامراد نہ ہوا۔ پس اس ایمان اور میرا تیری دعوت ایمان کو قبول کرنا ان کی برکت سے میری دعا کو شرف قبولیت عطا فرما۔ الم اکن کا جملہ پہلی کلام پر معطوف ہے یا ضمیر متکلم سے حال ہے کیونکہ معنی میں ضمیر متکلم فاعل ہے کیونکہ سابقہ جملوں کا معنی شبت ہے (یعنی میں بوڑھا ہو چکا ہوں)

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝

''اور میں ڈرتا ہوں (اپنے بے دین) رشتہ داروں سے (کہ وہ) میرے بعد (دین ضائع نہ کر دیں)[1] اور میری بیوی بانجھ ہے پس بخش دے مجھے اپنے پاس سے ایک وارث۔[2]''

[1] موالی سے مراد چچا کے بیٹے ہیں۔ من ورائی یعنی میرے مرنے کے بعد، یہ محذوف کے متعلق ہے۔ یعنی مجھے اپنے رشتہ داروں یا جو میرے بعد میرے جانشین بننے والے ہیں ان سے اندیشہ ہے کہ میرے وصال کے بعد وہ میری جانشینی کا حق ادا نہیں کریں گے اور میری امت پر دین کو اپنی خواہشات کے مطابق بدل دیں گے۔ یہ جملہ یا تو پہلی کلام پر معطوف ہے یا لم اکن کے فاعل سے حال ہے۔

ع اور میری بیوی بانجھ ہے۔یعنی میں اور میری بیوی عمر کے اس حصہ میں پہنچ چکے ہیں جس میں عادۃً اولاد نہیں ہوتی۔ایسی صورت میں تیرے فضل اور تیرے کمال قدرت سے امید کی جاسکتی ہے۔اس لئے تیری بارگاہ سے عرض ہے کہ تو مجھے ایسا بیٹا عطا فرما جو میرے وصال کے بعد اس منصب کی نازک ذمہ داریوں کو بحسن وخوبی سرانجام دے سکے۔

يَّرِثُنِيْ وَيَرِثُ مِنْ اٰلِ يَعْقُوْبَ ۖ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِيًّا ۝

''جو وارث بنے میرا اور وارث بنے یعقوب (علیہ السلام) کے خاندان کا لے اور بنا دے اسے اے رب! پسندیدہ (سیرت والا) ۲ے''

لے ابوعمرو اور کسائی نے یرثنی اور یرث کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ دعا کا جواب ہیں، جبکہ قراء نے ولیا کی صفت کے اعتبار سے مرفوع پڑھا ہے۔یہاں میراث سے علم اور نبوت کی میراث ہے۔مال کی میراث مراد نہیں ہے کیونکہ انبیاء کرام مال کا وارث نہیں بناتے۔رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے علماء انبیاء کرام کے وارث ہیں اور انبیاء کرام کسی کو درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے۔وہ تو صرف علم کا وارث بناتے ہیں۔جس نے ان کے علم سے کچھ حاصل کیا تو اس نے نبوت کی میراث کا بڑا حصہ لیا(1)۔اس حدیث کو امام احمد، ابو داؤد، ابن ماجہ اور دارمی نے کثیر بن قیس سے روایت کیا ہے۔امام ترمذی نے بھی یہ حدیث روایت کی ہے اور انہوں نے راوی کا نام قیس بن کثیر ذکر کیا ہے۔مذکورہ بالا حدیث اور اس قسم کی دوسری احادیث کی وجہ سے سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو ان کے باپ محمد رسول اللہ ﷺ کی میراث سے حصہ نہیں عطا فرمایا تھا۔جبکہ انہوں نے مالی میراث کا مطالبہ کیا تھا۔اس پر سلف صالحین کا اجماع ہے۔امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے کہ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سیدنا ابوبکر کے پاس آئے اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے اپنی میراث کا مطالبہ کیا۔سیدنا ابوبکر نے ان دونوں کو بتایا کہ میں نے خود رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے سنا ہے کہ ہم (انبیاء کرام) کسی کو وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے لا نورث ما ترکناہ صدقۃ(2)۔

اس طرح امام بخاری نے اپنی الصحیح میں روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ کے وصال کے وقت ازواج مطہرات نے اپنی میراث کے مطالبہ کے لئے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس بھیجنے کا ارادہ کیا۔حضرت عائشہ نے فرمایا کیا حضور ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو کچھ ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے(3)۔(پھر تم کیوں میراث کے مطالبہ کا مشورہ کر رہی ہو)۔امام بخاری نے مالک بن اوس بن الحدثان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس گیا تو ان کا پہرہ دار یرفا آیا اور پوچھا حضرت عثمان، حضرت عبدالرحمٰن، حضرت زبیر اور حضرت سعد آپ سے ملنا چاہتے ہیں، انہیں اندر آنے کی اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں۔ان سب حضرات کو یرفا نے اندر آنے کی اجازت دی (تو وہ اندر تشریف لے آئے) پھر یرفا نے پوچھا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے ہیں، انہیں اجازت ہے؟ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا ہاں اجازت ہے۔حضرت عباس نے عرض کی اے امیر المومنین میرے اور ان کے درمیان فیصلہ فرمائیں۔حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ارشاد فرمایا لوگو! میں تمہیں اس اللہ کی قسم دے کر پوچھتا ہوں جس کے حکم سے

1۔مشکوۃ المصابیح،صفحہ 34 (قدیمی) 2۔صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 995 (وزارت تعلیم) 3۔ایضاً،صفحہ 996

یہ آسمان اور زمین قائم ہیں کیا تم جانتے ہو کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ہم وارث نہیں بناتے جو ہم چھوڑتے ہیں وہ صدقہ ہے۔ (ہم سے مراد حضور ﷺ کی اپنی ذات تھی) پوری مجلس نے کہا بیشک حضور ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس تصدیق کے بعد حضرت علی اور حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی طرف متوجہ ہوئے اور فرمایا کیا تمہیں بھی علم ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایسا فرمایا تھا(1)۔

امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میرے ورثاء میرے وصال کے بعد دینار (مال) تقسیم نہ کریں۔ جو کچھ میری ازواج مطہرات کے خرچ اور میرے خادموں کے خرچ سے بچے وہ صدقہ ہے(2)۔

ایسی ہی احادیث حضرت حذیفہ بن الیمان، زبیر بن العوام اور ابودرداء سے مروی ہیں۔

شیعہ (رافضی) ان احادیث کا انکار کرتے ہیں اور سیدنا صدیق اکبر پر اعتراض کرتے ہیں حالانکہ ان کے اپنے مقتدا محمد بن یعقوب الکلینی نے اپنی جامع (الکافی) میں ابوعبداللہ جعفر الصادق رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ آپ نے فرمایا اِنَّ الْاَنْبِيَاءَ لَمْ يُوَرِّثُوْا دِرْهَمًا وَلَا دِيْنَارًا وَّاِنَّمَا اَوْرَثُوْا اَحَادِيْثَ مِنْ اَحَادِيْثِهِمْ۔ (ترجمہ) انبیاء کرام درہم و دینار کا وارث نہیں بناتے بلکہ وہ اپنے ارشادات کا وارث بناتے ہیں۔

آیت کریمہ کا سیاق بھی اسی بات کا مقتضی ہے کہ یہاں مال کی میراث کی بات نہیں کیونکہ آپ نے دعا فرمائی کہ وہ وارث بنے میرا اور یعقوب علیہ السلام کے خاندان کا۔ حالانکہ حضرت زکریا کے بیٹے کیلئے تمام آل یعقوب کی طرف سے انکے مال کا وارث بننا تو ممکن ہی نہیں تھا۔ نیز یہ مقام نبوت سے بہت بعید ہے کہ زکریا علیہ السلام ہر وقت اسی فکر و اندیشہ میں رہتے ہوں کہ میرے مال کا وارث میرے رشتہ دار اور چچا کے بیٹے بن جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

۲؎ اے میرے پروردگار پھر میرے اس فرزند ارجمند کو قول و عمل میں پسندیدہ بنا دے یا یہ معنی کہ اس کو خوشی اور غم، خیر اور مصیبت ہر حال میں اپنی رضا پر راضی رہنے والا بنا دے۔

يٰزَكَرِيَّآ اِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلٰمِ اسْمُهٗ يَحْيٰى لَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ سَمِيًّا ۝

''اے زکریا ہم مژدہ دیتے ہیں تجھے ایک بچے (کی ولادت) کا اس کا نام یحییٰ ہوگا ہم نے نہیں بنایا اس کا کوئی ہم نام اس سے پہلے۔ ۱؎''

۱؎ اس کلام میں اختصار ہے تقدیر اس طرح ہے کہ فاستجاب الله دعاء ه فقال ز کریا یعنی حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا کو اس قادر مطلق نے شرف قبولیت عطا فرمایا اور پھر یہ خوشخبری سنائی۔ سورۃ آل عمران میں زکریا کو مد اور قصر کی صورت میں پڑھنے کے متعلق اختلاف گزر چکا ہے۔ فرمایا ہم تجھے ایک من موہنے بیٹے کی خوشخبری دیتے ہیں جو تیرا صحیح جانشین ہوگا، تیری مسند کا صحیح اہل ہوگا، اس کا نام بھی ہم خود رکھتے ہیں، اس کا نام یحییٰ ہوگا۔ نام خود رکھ کر اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو شرف و عزت کے مقام بلند پر فائز فرما دیا۔ اسمه یحیی غلام کی پہلی صفت ہے۔ اور لم نجعل الخ یا تو حال ہے یا غلام کی دوسری صفت ہے۔ قتادہ اور کلبی فرماتے ہیں اس سے پہلے یحییٰ کسی کا نام نہ تھا(3)۔ اس میں دلیل ہے کہ غیر معروف اسماء کے ساتھ کسی کا نام رکھنا مسمی (اس ذات) کی تعظیم کے لئے ہوتا

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 996 (وزارت تعلیم) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریۃ)

ہے۔سعید بن جبیر اور عطاء نے یہ معنی کیا ہے کہ ہم نے اس کی کوئی شبیہ اور مثل پیدا نہیں کی جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہَلْ تَعْلَمُ لَهٗ سَمِيًّا۔ کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے(1)۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس کی کوئی مثل نہیں بنائی جس نے نہ اللہ کی نافرمانی کی ہو اور نہ معصیت کا ارادہ کیا ہو(2)۔ میں کہتا ہوں اس سے یہ مراد ہے کہ آپ میں اکثر فضائل جمع تھے۔ اگرچہ بعض جزئی فضیلت کا موجب تھے جیسے آپ کا عورتوں کی خواہش نہ کرنا وغیرہ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آپ پہلے انبیاء کرام سے افضل تھے کیونکہ حضرت خلیل علیہ السلام اور کلیم علیہ السلام جیسے جلیل القدر انبیاء پہلے گزرے ہیں اور وہ حضرت یحییٰ علیہ السلام سے فضائل و کمالات میں افضل تھے۔

علی بن ابی طلحہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی مثل کسی بانجھ عورت نے بچہ نہیں جنا(3)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ظاہر قول یہ ہے کہ یہ عجمی اسم ہے۔ اگر عربی ہے تو پھر فعل سے منقول ہے جیسے یعیش اور یعمر اسم فعال سے منقول ہیں۔ بعض علماء نے آپ کے اس اسم کی توجیہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ آپ کی وجہ سے آپ کی والدہ کا رحم (جو بڑھاپے کی وجہ سے بچہ پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو چکا تھا) زندہ ہو گیا تھا۔ اس وجہ سے آپ کا نام یحییٰ رکھا گیا۔ یا اس وجہ سے کہ آپ کی دعوت و تبلیغ کی وجہ سے اللہ کا دین زندہ ہوا تھا(4)۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّ كَانَتِ امْرَاَتِيْ عَاقِرًا وَّ قَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا ۝

”زکریا نے عرض کی میرے رب! کیسے ہو سکتا ہے میرے ہاں لڑکا حالانکہ میری بیوی بانجھ ہے۔1 اور میں خود پہنچ گیا ہوں بڑھاپے کی انتہا کو۔2“

1۔رب اصل میں یا ربی تھا۔ انی بمعنی کیف ہے۔ و کانت امراتی عاقراً یا حال ہے یا سابقہ کلام پر معطوف ہے۔ یہ زکریا علیہ السلام کا کلام ایک سوال ہے اور حقیقت حال طلب کرنے کیلئے ہے۔ یعنی ہمارے ہاں کیسے بچہ ہو گا؟ ہم دوبارہ جوان ہو جائیں گے یا اس پیرانہ سالی میں ہمارا بچہ پیدا ہو گا۔ اس کلام میں اسباب کو دیکھتے ہوئے اولاد پر تعجب کا اظہار ہے ورنہ آپ کو قدرت خداوندی پر کچھ تعجب نہ تھا۔

2۔عتیا اصل میں عتو تھا جیسے قعود ہے۔ عربوں نے دو متواتر ضموں اور دو واؤ کو ثقیل سمجھا اسلئے تاء کو کسرہ دیا پھر پہلی واؤ کسرہ کے بعد یاء سے بدل گئی پھر دوسری واؤ یاء سے بدل کر ادغام ہو گئی۔ جمہور قراء نے عتیا یعنی عین کے ضمہ اور تاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ حفص اور کسائی نے مابعد کی اتباع کی وجہ سے عین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ العتو کا معنی اطاعت سے انکار کرنا ہے لیکن یہاں مراد انتہائی بوڑھا ہونا ہے کیونکہ ضعیف اپنے نفس کی اطاعت نہیں کرتا اور اپنی مراد حاصل کرنے کی استطاعت بھی نہیں رکھتا۔ قتادہ فرماتے ہیں یہاں مراد ہڈیوں کا خشک اور کمزور ہونا ہے۔ عرب کہتے ہیں عتا الشیخ یعتو عتیا و عسیا۔ جب کوئی شخص اپنی عمر کی انتہا کو پہنچ جائے اور بوڑھا ہو جائے۔ عات اور عاس اسے کہتے ہیں جس کا جسم اور ہڈیاں خشک ہو جائیں(5)۔

قَالَ كَذٰلِكَ ۚ قَالَ رَبُّكَ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَّ قَدْ خَلَقْتُكَ مِنْ قَبْلُ وَ لَمْ تَكُ شَيْـًٔا ۝

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ) 2۔ایضاً 3۔ایضاً

4۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 530 (العلمیہ) 5۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ)

”فرمایا یونہی ہوگا تیرے رب نے فرمایا ہے کہ اس کبرسنی میں بچہ دینا میرے لئے آسان بات ہے [1] اور (دیکھو!) میں نے تمہیں بھی تو پیدا کیا تھا اس سے پیشتر حالانکہ تم کچھ بھی نہ تھے۔ [2]“

[1] قال کا فاعل اللہ تعالیٰ یا وہ فرشتہ ہے جو بشارت دینے آیا تھا۔ حضرت زکریا کی تصدیق کرتے ہوئے فرمایا بات بالکل اسی طرح ہے جیسی آپ نے کی ہے، اسباب کے اعتبار سے بچے کا پیدا ہونا بہت عجیب اور حیران کن ہے لیکن تمہارا رب فرماتا ہے کہ مجھ پر یہ معاملہ آسان ہے، ایسا ہی ہوگا جیسا میں نے تم سے وعدہ کیا ہے۔ مجھے کسی سبب اور واسطہ کی ضرورت نہیں (میں قادر مطلق ہوں) یہ بھی ہوسکتا ہے حضرت زکریا نے فرمایا ہو کہ بات اسی طرح ہے۔ (اس صورت میں کہ جو مثل کے معنی میں ہے، سابق کلام کی تاکید کے لئے زائد ہے اور سابق کلام سے مراد حضرت زکریا کا قول رب انی یکون الخ ہے) یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کذالک منصوب ہو اس قال کیوجہ سے جو قال ربک میں ہے اور دونوں فعل معمول بنانے میں جھگڑ رہے ہیں۔ دوسرے کو عمل کرایا گیا اور پہلے فعل میں مضمر مانا گیا اور اس کا برعکس بھی جائز ہے، یعنی قال ربک کذالک۔ یہ سابق کلام کی طرف اشارہ ہے یعنی یبشرک بغلام الخ یعنی مجھ پر آسان ہے کہ میں تیری قوت جماع لوٹا دوں اور تیری بیوی کے رحم کو علوق کے لئے کھول دوں یا یہ مبہم کی طرف اشارہ ہے جس کی تفسیر ھو علی ھین کا قول کر رہا ہے۔

[2] حمزہ اور کسائی نے خلقناک یعنی تعظیم کے طور پر نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے مفرد کا صیغہ پڑھا ہے۔ یہ علی میں جو ضمیر مجرور ہے اس سے حال ہے اور ھین کے متعلق ہے۔ ولم تک شیئا۔ خلقتک کی ک ضمیر سے حال ہے یعنی میں نے اس سے پہلے تجھے پیدا کیا تھا حالانکہ تو بالکل معدوم تھا۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ معدوم شی نہیں ہے (جیسا کہ اہلسنت اور بعض معتزلہ کا مسلک ہے، جبکہ بعض معتزلہ کہتے ہیں کہ معدوم شی ہے۔ یعنی اہلسنت کے نزدیک معدوم پر شی کا اطلاق نہیں ہوتا، جبکہ بعض معتزلہ کے نزدیک معدوم پر شی کا اطلاق ہوتا ہے)

قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْٓ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَ لَيَالٍ سَوِيًّا ⑩

”زکریا نے عرض کی اے میرے رب ٹھہراؤ میرے لئے کوئی علامت جواب ملا تیری علامت یہ ہے کہ تو بات نہیں کر سکے گا لوگوں سے تین رات تک حالانکہ تو بالکل تندرست ہوگا۔ [1]“

[1] رب اصل میں یا ربی تھا۔ لی کو نافع اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی میرے ایسی علامت ٹھہراؤ جو میری عورت کے حمل پر دلالت کرے۔ ثلاث لیال سے مراد تین دن ہیں جیسا کہ سورۂ ال عمران کی آیت دلالت کرتی ہے۔ حضرت زکریا علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ ان تین دنوں اور تین راتوں میں لوگوں سے آپ کلام نہ کر سکے۔ جب اللہ کا ذکر کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی زبان کو قوت گویائی عطا فرما دیتے۔ آپ ذکر و شکر کے لئے لوگوں سے تنہا ہوگئے تھے۔ سویا تکلم کے فاعل سے حال ہے۔ یعنی آپ صحیح و سلامت ہونے کے باوجود بات نہیں کر سکیں گے۔ نہ آپ گونگے اور بہرے ہوں گے بلکہ صرف بطور علامت آپ سے قوت گویائی سلب کی جائیگی۔ مجاہد فرماتے ہیں کلام سے مانع کوئی مرض نہ ہوگی۔ بعض علماء نے سویا کا معنی متتابعات۔ یعنی متواتر کیا ہے لیکن پہلا معنی صحیح ہے(1)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ)

فَخَرَجَ عَلٰى قَوْمِهٖ مِنَ الْمِحْرَابِ فَاَوْحٰۤى اِلَيْهِمْ اَنْ سَبِّحُوْا بُكْرَةً وَّ عَشِيًّا ⑪

''پھر آپ نکل کر آئے اپنی قوم کے پاس (اپنے) عبادت خانہ سے تو اشارہ سے انہیں سمجھایا کہ تم پاکی بیان کرو (اپنے رب کی) صبح وشام۔ لے''

لے فاء عاطفہ ہے اور یہ مقدم کلام ظہرت پر معطوف ہے۔ یعنی وہ نشانی ظاہر ہوگئی اور آپ کلام نہ کر سکے تو باہر تشریف لائے۔ محراب سے مراد مسجد ہے۔ اس کو محراب اس لئے فرمایا کیونکہ یہ شیطان سے حرب (جنگ) کرنے کی جگہ ہے۔ قاموس میں محراب کے مختلف معانی ذکر ہیں۔ 1۔ کمرہ۔ 2۔ کمرے کا اگلا حصہ۔ 3۔ محترم جگہ۔ 4۔ مسجد میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ۔ 5۔ وہ جگہ جہاں بادشاہ علیحدہ کھڑا ہوتا ہے اور لوگوں سے دور ہوتا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں لوگ محراب کے باہر منتظر تھے کہ آپ دروازہ کھولیں اور اندر داخل ہو کر نماز پڑھیں لیکن اچانک زکریا علیہ السلام باہر تشریف لائے تو رنگ اڑا ہوا تھا لوگوں نے وجہ پوچھی (1) تو آپ نے ان کو اشارہ سے صبح وشام ذکر الٰہی میں مشغول رہنے کا ارشاد فرمایا۔ مجاہد فرماتے ہیں آپ نے یہ حکم زمین پر لکھا (2)۔ سبحوا سے پہلے ان مفسرہ کیونکہ اوحی میں قول کا معنی پایا جاتا ہے یا ان مصدریہ ہے۔

يٰيَحْيٰى خُذِ الْكِتٰبَ بِقُوَّةٍ ؕ وَ اٰتَيْنٰهُ الْحُكْمَ صَبِيًّا ⑫

''اے یحییٰ پکڑ لو اس کتاب کو مضبوطی سے اور ہم نے عطا فرما دی انکو دانائی جبکہ وہ بچے تھے۔ لے''

لے یہاں بھی کلام میں اختصار ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ یحییٰ کی والدہ حاملہ ہوئیں پھر انہوں نے یحییٰ کو جنم دیا پھر جب وہ خطاب الٰہی سننے کے اہل ہو گئے تو ہم نے انہیں حکم دیا۔ محلی فرماتے ہیں حضرت یحییٰ دو سال کے تھے کہ یہ حکم ملا۔ الکتاب سے مراد تورات ہے اور بقوۃ سے مراد مضبوط اور کوشش اور توفیق طلب کرنے کے ساتھ۔ اور الحکم سے مراد حکمت اور کتاب کی سمجھ ہے۔ اتیناہ الحکم صبیا کا عطف یاقلنا یایحییٰ پر ہے۔ صبیاً۔ تین سال کا بچہ۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے بچپن میں تورات پڑھی تھی۔ جو بلوغت سے پہلے قرآن پڑھ لے اس کے متعلق کہتے ہیں فقد اوتی الحکم صبیا۔ اس شخص کو بچپن میں حکمت عطا کی گئی ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو بچپن میں بچوں نے کھیل کی دعوت دی تو آپ نے فرمایا ہمیں کھیل کود کے لئے پیدا نہیں کیا گیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں الحکم سے مراد نبوت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بچپن میں یحییٰ علیہ السلام کو تاج نبوت عطا فرمایا تھا۔

وَّ حَنَانًا مِّنْ لَّدُنَّا وَ زَكٰوةً ؕ وَ كَانَ تَقِيًّا ⑬

''نیز عطا فرمائی دل کی نرمی اپنی جناب سے اور نفس کی پاکیزگی لے اور وہ بڑے پرہیزگار تھے ۲''

لے حنانا کا عطف الحکم پر ہے یعنی اپنی جناب سے ہم نے ان پر رحمت فرمائی یا یہ معنی کہ ہم نے ان کے والدین اور دوسرے لوگوں کے لئے حضرت یحییٰ کے دل میں نرمی پیدا فرما دی۔ یا حنانا کا معنی ہیبت اور وقار ہے۔ یا رزق یا برکت ہے۔ قاموس میں حنان کا معنی رحمت، رزق، ہیبت، وقار، دل کی نرمی ذکر ہے۔ اسی سے اللہ تعالیٰ کا اسم الحنان ہے جس کا معنی رحیم ہے۔ زکوۃ سے مراد گناہوں سے پاک ہونا ہے۔ بعض علماء کے نزدیک طاعت واخلاص ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں زکوٰۃ سے مراد عمل صالح ہے۔ ضحاک کا بھی یہی قول ہے۔ کلبی کہتے ہیں زکوٰۃ سے مراد وہ صدقہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے والدین کو آپ کی صورت میں عطا فرمایا تھا (3)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 194 (التجاریہ) 2۔ ایضاً، صفحہ 195 3۔ ایضاً

ؒ آپ ایک مخلص اور اطاعت شعار مسلمان تھے آپ نے کبھی نہ کوئی گناہ کیا تھا اور نہ گناہ کا ارادہ کیا تھا۔ اس جملہ کا عطف اتیناہ پر ہے۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَيْهِ وَلَمْ يَكُنْ جَبَّارًا عَصِيًّا ﴿۱۴﴾

''اور وہ خدمت گزار تھے اپنے والدین کے اور وہ جابر (اور) سرکش نہ تھے۔ ل''

ل یعنی اپنے والدین سے حسن سلوک سے پیش آنے والے اور ان کے ساتھ احسان کرنے والے تھے اور متکبر نہ تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبار وہ ہوتا ہے جو غصہ میں مارتا ہے اور قتل کرتا ہے عصیا کا معنی گنہگار ہے۔

وَسَلٰمٌ عَلَيْهِ يَوْمَ وُلِدَ وَيَوْمَ يَمُوْتُ وَيَوْمَ يُبْعَثُ حَيًّا ﴿۱۵﴾

''اور سلامتی ہو ان پر جس روز پیدا ہوئے اور جس روز وہ انتقال کریں گے اور جس روز انہیں اٹھایا جائے گا زندہ کر کے۔ ل''

ل یہ جملہ معترضہ ہے۔ یعنی ہر اس چیز سے انہیں اللہ کی طرف سے سلامتی ہو جو تکلیف دیتی ہے۔ پیدائش کے دن یحییٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے چھونے سے محفوظ رکھا۔ حالانکہ ہر پیدا ہونے والے بچہ کو شیطان چوک دیکر رلا دیتا ہے۔ وصال کے بعد عذاب قبر سے سلامت ہوں اور یوم حشر دوزخ کے عذاب اور قیامت کی ہولناکیوں سے محفوظ ہوں۔ سفیان بن عیینہ فرماتے ہیں انسان ان تین حالتوں میں رہتا ہے۔ جس دن پیدا ہوتا ہے تو ایک عالم کو چھوڑ کر دوسرے عالم میں آتا ہے پھر مرتا ہے تو ایسے لوگوں کو دیکھتا ہے جنہیں اس نے پہلے نہیں دیکھا ہوتا ہے۔ پھر جس دن قبر سے زندہ کر کے اٹھایا جائے گا تو اپنے آپ کو ایسے حالات میں پائے گا جس کی مثل پہلے اس نے نہ دیکھے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ نے یحییٰ علیہ السلام کو ان تینوں حالات میں حفاظت و سلامتی کا مژدہ سنا دیا (1)۔

یوم ولد اپنے معطوفات سے مل کر ظرف مستقر کے متعلق ہے۔ جو سلام علیہ میں علیہ ہے۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ ظرف مستقر فعل استقر یا حصل کے متعلق ہے جیسا کہ بصریوں کا مذہب ہے یا حاصل و مستقر (اسم فاعل) کے متعلق ہے۔ کہا جائے جیسا کہ کوفیوں کا مذہب ہے تو دونوں تقدیروں کی صورت میں ایک زمانہ پر دلالت کرے گی۔ یا زمانہ ماضی پر (جبکہ فعل حصل کے متعلق کہا جائے) یا زمانہ حال پر (جب اسم فاعل کے متعلق کیا جائے) پس یوم ولد کی ظرفیت دوسری تقدیر پر اور یوم یموت اور یوم یبعث پہلی تقدیر پر کیسے درست ہوگی (کیونکہ اگر حال کا زمانہ مراد لیا جائے تو یوم ولد ماضی ہے اس کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی اور اگر ماضی کا زمانہ مراد لیا جائے یوم یبعث اور یوم یموت کے ساتھ مناسبت نہیں رہتی۔ ماضی کی صورت میں یوم ولد کے ساتھ معنی درست ہوگا کہ سلامتی قرار پذیر ہو جس دن پیدا ہوئے لیکن دوسرے صیغوں یوم یموت اور یوم یبعث کے ساتھ معنی درست نہ ہوگا۔ پھر معنی ہوگا کہ سلامتی زمانہ ماضی میں قرار پذیر ہو جس دن آپ کا وصال ہوگا اور جس دن آپ کو اٹھایا جائے گا)

محققین اس کے جواب میں فرماتے ہیں کہ ظرف کا عامل معنوی ہوتا ہے اور وہ مصدر حصول اور استقرار ہے اور مصدر میں کسی زمانہ کا اعتبار نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے زید فی الدار قائماً میں حال کا عامل معنوی کہتے ہیں۔ اس کو جو حصل یا حاصل سے تعبیر کرتے ہیں تو یہ مجازاً ہے جیسا کہ ھذا زید قائماً میں کہا جاتا ہے اشیر زیداً قائماً۔ اس میں زمانہ پر کوئی دلالت نہیں ہوتی۔ ظروف زمانیہ کا تعلق تینوں زمانوں سے کرنا جائز ہوتا ہے کیونکہ ان میں فعل کے معنی کی بو ہوتی ہے۔ اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ یہ حصل یا حاصل کے متعلق ہے تو پھر ظرف اس کے قائم ہو جائے گی تو ضمیر محذوف (فعل یا شبہ فعل) سے منتقل ہو کر ظرف کی طرف منتقل ہو جائے گی پھر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (التجاریۃ)

ظرف زمانہ کے معنی سے خالی ہو جائے گی پس تینوں زمانوں کے ساتھ تعلق جائز ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مَرْيَمَ ۘ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيًّا ﴿16﴾

"اور (اے حبیب!) بیان کیجئے کتاب میں مریم (کا حال) جب وہ الگ ہو گئی اپنے گھر والوں سے ایک مکان میں جو مشرق کی جانب تھا۔1"

1۔ واذکر کا عطف کلام سابق کے مضمون پر ہے' کیونکہ مذکور کو اس لئے ذکر کیا جاتا ہے تاکہ مخاطب اس کو جان لے اور اس کی حفاظت کرے گویا یہ اعلم کے قول کو اپنے ضمن میں لئے ہوئے ہے یعنی اس قصہ کو جان لے اور اسکو محفوظ کر لے۔ تقدیر اس طرح ہے اعلم ذکر رحمة ربک زکریا واذکر فی الکتاب مریم الخ۔

الکتاب سے مراد قرآن کریم ہے۔ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے۔ اذانتبذت یا تو مریم سے بدل اشتمال ہے کیونکہ جس کیفیت میں آپ تھیں اس پر وقت مشتمل تھا۔ یا بدل ہے کیونکہ مریم سے مراد مریم کا قصہ ہے اور ظرف سے مراد وہ واقعہ ہے جو اس وقت میں رونما پذیر ہوا تھا۔ وہ دونوں ایک چیز ہیں یا مضاف مقدر کی ظرف ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اذ بمعنی ان مصدریہ ہے جیسا کہ اس جملہ میں ہے اکرمتک اذ لم تکرمنی اس صورت میں لامحالہ بدل ہی ہوگا۔ النبذ کا معنی کسی چیز کو پھینک دینا ہے۔ جو بعد اور دوری کو لازم ہے۔ اسلئے اسکا معنی یہ کیا گیا ہے کہ وہ الگ ہو گئیں۔ دور ہو گئیں اپنے گھر والوں سے ایک ایسے مکان میں جو اسی گھر میں مشرقی جانب تھا۔ سخت سردی کا موسم تھا، آپ دھوپ میں بیٹھ کر اپنے سر سے جوئیں نکال رہی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں آپ اس وقت حیض سے پاک ہوئی تھیں اور غسل کرنے کے لئے گئی تھیں۔ بعض فرماتے ہیں عبادت کی خاطر علیحدہ مشرقی کمرے میں تشریف لے گئی تھیں۔ حضرت حسن بصری فرماتے ہیں اسی وجہ سے نصرانیوں نے مشرق کو اپنا قبلہ بنالیا۔ مکانا ظرف ہے یا مفعول بہ ہے کیونکہ انتبذت بمعنی اتت ہے۔ اسلئے مکانا مفعول بہ ہو سکتا ہے۔

فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا ۖ فَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا ﴿17﴾

"پس بنالیا اس نے لوگوں کی طرف سے ایک پردہ پھر ہم نے بھیجا اس کی طرف اپنے جبرئیل کو1 پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں 2"

1۔ ابن عباس نے حجابا کا معنی سترا یعنی پردا بیان فرمایا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ دیوار کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ مقاتل فرماتے ہیں پہاڑ کے پیچھے بیٹھی تھیں۔ عکرمہ فرماتے ہیں آپ مسجد میں تھیں تو آپ کو حیض شروع ہو گیا۔ آپ اپنی خالہ کے گھر واپس آ گئیں حتیٰ کہ جب خون ختم ہوا اور پاک ہو گئیں تو مسجد کی طرف پھر لوٹ آئیں۔ جب آپ حیض سے طہارت کے لئے غسل کر رہی تھیں اور آپ نے کپڑے اتارے ہوئے تھے تو ایک خوبصورت معتدل جسم اور گھنگھریالے بالوں والے نوجوان کی شکل میں جبرئیل ظاہر ہوئے۔ جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا کہ ہم نے اس کی طرف اپنے جبرئیل کو بھیجا(1)۔ جبرئیل کی اپنی طرف نسبت جبرئیل کو شرف عطا کرنے کے لئے کی۔ آپ کو روح اس لئے کہا جاتا ہے کیونکہ دین آپ کی وجہ سے اور آپ کی وحی کے ذریعے زندہ ہوتا ہے۔

2۔ جبرئیل آپ کے سامنے تندرست امرد جوان کی شکل میں نمودار ہوئے۔ بعض علماء فرماتے ہیں روح سے مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں،

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 195 (التجاریہ)

بشری صورت میں آپ کے پاس آئے تھے اور آپ اسکے ساتھ حاملہ ہوگئی تھیں۔ پہلا قول صحیح ہے۔

قَالَتْ إِنِّيْٓ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيًّا ﴿۱۸﴾

''مریم بولیں میں پناہ مانگتی ہوں رحمٰن کی تجھ سے اگر تو پرہیزگار ہے۔ ۱؎''

۱؎ حضرت مریم علیہا السلام نے جبرئیل امین کو اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا تو دور سے یہ فرمایا۔ یہ ارشاد آپ کی انتہائی پاکدامنی اور عفت کی دلیل ہے۔

نافع، ابن کثیر و اور ابو عمرو نے انی کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ان کنت تقیا۔ شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ یعنی اگر تو متقی ہے تو مجھے نہ چھیڑنا۔ یا مجھ سے دور ہو جا، اسکی وجہ سے جس کی میں نے پناہ مانگی ہے۔ یہ اسی طرح کا قول ہے جیسے عرب کہتے ہیں ان کنت مومنا فلا تظلمنی۔ یعنی مناسب یہ ہے کہ تیرا ایمان تجھے ظلم کرنے سے منع کرے۔ آیت کا معنی یہ ہوگا چاہئے یہ کہ تو اللہ سے ڈرے اور تیرا تقویٰ تجھے برائی سے روکے۔ بعض فرماتے ہیں یہ کلام مبالغہ پر مبنی ہے تقدیر اس طرح ہے اگر تو متقی ہے تو میں تجھ سے رحمٰن کی پناہ مانگتی ہوں۔ جب تو متقی نہ ہوگا تو میں کتنی زیادہ تجھ سے مانگتی! یہ بھی جائز ہے کہ ان نافیہ ہو۔

قَالَ اِنَّمَآ اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ﴿۱۹﴾

''جبرئیل نے کہا میں تو تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں تا کہ میں عطا کروں تجھے ایک پاکیزہ فرزند۔ ۱؎''

۱؎ جبرئیل نے کہا میں انسان نہیں کہ تم مجھ سے گھبرا رہی ہو اور پناہ مانگ رہی ہو۔ میں فرشتوں میں سے تیرے رب کا فرستادہ ہوں۔ مجھے تیری طرف بھیجا گیا ہے تا کہ میں تجھے گناہوں سے پاک، با خیر پر پرورش پانے والا، نیکی اور صلاح کے زینے پر چڑھنے والا فرزند عطا کروں۔

حضرت جبرئیل نے بچہ عطا کرنے کی نسبت اپنی طرف کی حالانکہ حقیقۃً بچہ عطا کرنے والا اللہ ہے۔ تو یہ آپ کی نسبت مجازی ہے کیونکہ آپ ظاہری سبب تھے، آپ نے پھونک ماری تھی (اس لئے ظاہری سبب کی طرف نسبت سے انسان مشرک نہیں ہوتا، جبکہ عقیدہ یہ ہو کہ ہر نعمت عطا کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے) یہ بھی جائز ہے کہ (لا ھب لک) اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت ہو۔ تقدیر اس طرح ہو کہ تیرے رب نے مجھے تیری طرف بھیجا ہے۔ (اور) وہ فرماتا ہے میں نے تیری طرف اپنا رسول بھیجا تا کہ میں تجھے اس رسول کے پھونک مارنے کے ذریعے بچہ عطا کروں۔ ورش، ابو عمرو نے لیھب لک پڑھا ہے۔ اسی طرح حلوانی نے قالون سے لیھب لک نقل کیا ہے۔ یعنی تمہارا رب تمہیں عطا کرے۔ اسی نسبت مجازی کے اعتبار سے صوفیاء کرام کہتے ہیں جسکے دو دن برابر ہوئے وہ خسارے میں ہے۔

قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا ﴿۲۰﴾

''(حیرت سے) بولیں (اے بندۂ خدا) کیونکر ہو سکتا ہے میرے ہاں بچہ حالانکہ نہیں چھوا مجھے کسی بشر نے ۱؎ اور نہ میں بد چلن ہوں''

۱؎ حضرت مریم نے تعجب کرتے ہوئے فرمایا میرے ہاں بچہ کیسے ہو سکتا ہے حالانکہ کسی بشر نے مجھ سے نکاح بھی نہیں کیا۔ یہ اشارات

نکاح کے معنی میں استعمال ہوتے ہیں۔ بدکاری کے لئے خبث اور فجر جیسے لفظ استعمال ہوتے ہیں۔

۲۔ میں بدچلن بھی نہیں ہوں۔ اس کا عطف سابق کلام پر ہے۔ بغیا مبرد کے نزدیک اصل میں بغوی بروزن فعول تھا۔ واؤ کو یاء سے بدلا گیا اور پھر ی کو یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ پھر یاء کی مناسبت سے غین کو کسرہ دیا گیا۔ اس کے آخر میں تاء لاحق نہیں ہوتی کیونکہ فعول بمعنی فاعل ہو تو تذکیر و تانیث کا فرق نہیں کیا جاتا۔ مذکر اور مونث دونوں کے لئے فعول ہی استعمال ہوتا ہے۔ مبرد کے علاوہ علماء کے نزدیک بغیا کا اصل وزن فعل ہے اور تاء اس کے آخر میں مبالغہ اور نسب کی وجہ سے لاحق نہیں ہوئی۔ (قاعدہ یہ ہے کہ اسم فاعل کو فعل پر محمول کیا جائے تو اس کے آخر میں تاء لاحق ہوتی ہے۔ اور یہ حمل اس وقت ہوتا ہے، جبکہ اسم فاعل فعل کے لفظاً اور معنیً موافق ہو۔ یعنی اسم فاعل حال اور استقبال کے معنی میں ہو۔ اور وہ اسم فاعل جو مبالغہ اور نسبت کے لئے ہوتا ہے وہ دوام اور ثبوت کے لئے ہوتا ہے، حال اور استقبال کے لئے نہیں ہوتا۔ پس جب لفظاً اسم فاعل مبالغہ اور نصب کی صورت میں فعل پر لفظاً اور معنی جاری نہیں ہوتا تو اس کے آخر میں تاء بھی لاحق نہیں ہوتی۔ اسی طرح نسبت کا صیغہ جب فاعل کے وزن پر ہو جیسے تامر' لابن' حائض وغیرہ تو ان کے آخر میں تا لاحق نہیں ہوتی کیونکہ اس سے مراد ذات تمر' ذات لبن اور ذات حیض ہوتا ہے)

حضرت مریم نے فرمایا کہ بچہ کے پیدا ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں یا تو نکاح ہوا ہو یا برائی کی گئی ہو لیکن مجھ میں جب یہ دونوں صورتیں نہیں ہیں تو بچہ کیسے پیدا ہوگا۔

قَالَ كَذٰلِكِ ۚ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ ۚ وَلِنَجْعَلَهٗٓ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا ۚ وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا ﴿۲۱﴾

"جبرئیل نے کہا یہ درست ہے (لیکن) تیرے رب نے فرمایا یوں بچہ دینا میرے لئے معمولی بات ہے اور (مقصد یہ ہے کہ) ہم بنائیں اسے اپنی (قدرت کی) نشانی لوگوں کے لئے اور سراپا رحمت اپنی طرف سے اور یہ ایسی بات ہے جس کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ ۱؎"

۱؎ جبرئیل نے کہا معاملہ اسی طرح ہے، یعنی اللہ تجھے بیٹا بغیر باپ کے عطا کرے گا اگرچہ تجھے کسی بشر نے نہیں چھوا اور تو بدچلن بھی نہیں ہے۔ تیرا رب فرماتا ہے کہ بغیر باپ کے بیٹا پیدا کرنا میرے لئے کونسا مشکل ہے؟ میرے لئے تو یہ آسان سا معاملہ ہے۔ قال ربک۔ یا تو محذوف جملہ کی علت ہے جس پر کذالک دلالت کر رہا ہے یا بتقدیر قد اس سے حال ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کذالک۔ قال ربک کا مقولہ ہو تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ قال ربک کذالک۔ اور ھو علی ھین علت کے معنی میں ہو۔ ولنجعله یا تو علی ھین پر معطوف ہے کیونکہ وہ علت کے معنی میں ہے۔ یعنی ہم ایسا کریں گے کیونکہ یہ آسان ہے ہمارے لئے اور ہم اسے قدرت کی نشانی بنائیں گے۔ یا لنجعله کا عطف علت مقدر پر ہے جو جملہ محذوفہ ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اھب لک غلاما لنجتیه بوحینا ولنجعله اية للناس۔ بعض علماء فرماتے ہیں غائب سے متکلم کی طرف التفات کے طریقہ پر اس کا عطف لیھب پر ہے۔ رحمة منایھلنجعله کے محل پر معطوف ہے یعنی تاکہ اسے اپنی طرف سے بندوں پر اپنی قدرت کی نشانی بنائیں جو اس سے ہدایت حاصل کریں یا اس کا عطف اية پر ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہوگا کہ ہم اسے اپنی طرف سے رحمت بنائیں۔ اے مریم اس امر کا فیصلہ ازل سے ہو چکا ہے یا یہ معنی کہ لوح محفوظ پر مقدر ہو چکا ہے اور لکھا جا چکا ہے۔ یا امراً مقضیاً کا معنی امور اً حقیقاً

ہے یعنی یقیناً وہ ایسا کرے گا کیونکہ اس نے اس کو آیت اور رحمت بنانا ہے۔

فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا ﴿۲۲﴾

''پس وہ حاملہ ہو گئیں۔ اس (بچہ) سے پھر وہ چلی گئیں اسے (شکم میں) لئے کسی دور جگہ۔ ۱''

۱ فحملته محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر یہ ہے فاطمانت بقول الملک فنفخ الملک فی جیب درعها فحملت حین لبست۔ یعنی حضرت مریم فرشتے کی بات سن کر مطمئن ہو گئیں۔ پھر فرشتے نے آپ کی قمیص کے گریبان پر پھونک ماری جب آپ نے وہ قمیص پہنی تو آپ حاملہ ہو گئیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں جبرئیل نے آپ کی قمیص کے گریبان کو اپنی انگلیوں سے کھینچا اور گریبان میں پھونک ماری۔ بعض فرماتے ہیں آپ کی قمیص کی آستین میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں آپ کے منہ میں پھونک ماری تھی۔ بعض فرماتے ہیں دور سے جبرئیل نے پھونک ماری تھی اور ہوا آپ تک پہنچی تھی اور آپ اسی وقت عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہو گئی تھیں۔ آپ حمل کے ساتھ گھر سے دور چلی گئیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں آپ بیت المقدس کی ایک وادی میں چلی گئیں تاکہ لوگ بغیر نکاح کے حمل کی وجہ سے طعن و تشنیع نہ کریں۔ امام بغوی فرماتے ہیں آپ کی مدت حمل اور وضع حمل میں اختلاف ہے۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں حمل اور ولادت دونوں ایک ہی گھڑی میں ہوئے تھے۔ بعض فرماتے ہیں دوسری عورتوں کی طرح نو ماہ حمل ٹھہرا تھا۔ بعض نے آٹھ ماہ (1) اور بعض نے چھ ماہ لکھے ہیں۔ مقاتل بن سلیمان فرماتے ہیں۔ ایک ساعت میں آپ حاملہ ہوئیں اور دوسری ساعت میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی صورت تیار ہو گئی۔ جب اسی دن سورج زائل ہوا تو وضع حمل ہو گیا اور حضرت مریم علیہا السلام کی عمر ابھی دس سال تھی اور عیسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حاملہ ہونے سے پہلے دو حیض گزار رہے تھے۔

فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ ۚ قَالَتْ يٰلَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيًّا ﴿۲۳﴾

''پس لے آیا انہیں دردزہ ایک کھجور کے تنے کے پاس۔ ۱ (بصد حسرت و یاس) کہنے لگیں کاش! میں مرگئی ہوتی اس سے پہلے اور بالکل فراموش کر دی گئی ہوتی ۲''

۱ اَجَآءَ کو ہمزہ افعال کے ذریعے متعدی کیا گیا ہے۔ یہ جاء سے مشتق ہے جس طرح اتیٰ بمعنی اعطی استعمال ہوتا ہے اس طرح اَجَآءَ مجبوراً آنے کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ مغاض مصدر ہے جب عورت کے پیٹ میں بچہ باہر آنے کے لئے حرکت کرتا ہے تو اس وقت جو عورت کو تکلیف ہوتی ہے اسے مغاض کہتے ہیں۔ عرب کہتے ہیں مغضت المراء ة جب عورت کو دردزہ شروع ہو جائے۔ مغاض کے کھجور کے تنے کی طرف لانے کی نسبت مجازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دردزہ کے وقت اللہ تعالیٰ اسے لے آیا یا یہ معنی کہ مغاض کے سبب وہ آئیں۔ پس مغاض آنے کا سبب تھا گویا وہ اسے لے کر آیا ہے۔ کھجور کے تنے کے پاس تاکہ اسکے ساتھ چھپ جائیں اور تکلیف کے وقت اس کو پکڑ لیں۔ جذع جڑ اور ٹہنی کو کہتے ہیں اور اس کھجور کو بھی کہتے ہیں جو سخت سردی کی وجہ سے صحراء میں خشک ہو گئی ہو اور اس پر کوئی سبزہ نہ ہو۔

ابن ابی حاتم نے ابی روق سے روایت کیا ہے حضرت مریم علیہا السلام اس کھجور کے تنا کے پاس پہنچیں جس پر کوئی ایک پتہ بھی نہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 196 (التجاریہ)

تھا، اسے جھنجھوڑا تو اس پر پتے، خوشے اور تر کھجوریں لگ گئیں۔ النخلة پر الف لام جنس کا ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید اللہ تعالیٰ نے حضرت مریم علیہ السلام کے دل میں یہ الہام کیا تھا تاکہ وہ انہیں اس درخت کے پاس ایسی نشانیاں دکھائیں جس سے ان کا خوف و ہراس اور پریشانی جاتی رہے اور انہیں کھجوریں کھلائے کیونکہ یہ عورتوں کی مرغوب غذا ہیں(1)۔

۲۔ آپ کو بغیر خاوند کے بچہ ہونے پر جو الزامات کا خدشہ تھا اور لوگوں کے طعن و تشنیع کا اندیشہ تھا اور معاشرہ کے سامنے شرم و حیاء کا سامنا تھا تو آپ کہنے لگیں کاش میں اس سے پہلے مر چکی ہوتی۔ یالیتنی میں منادیٰ محذوف ہے تقدیر اس طرح ہے یاایها المخاطب لیتنی۔ شاید یہاں ان کا مخاطب نفس ہے یا جبرئیل علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں یا تنبیہ کے لئے اور جملہ ندائیہ متمنّی کے استبعاد کے لئے ہے۔ مت کو ابن کثیر، ابو عمرو، ابن عامر اور ابو بکر نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ان کے نزدیک یہ مات یمات سے مشتق ہے، یعنی ماضی کا عین کلمہ مکسور اور مضارع کا عین کلمہ مفتوح ہے جیسے خاف یخاف ہے۔ باقی قراء کے نزدیک یہ مات یموت سے ہے یعنی ماضی کا عین کلمہ مفتوح اور مضارع کا عین کلمہ مضموم ہے جیسے قال' یقول ہے۔ هذا کا مشار الیہ الامر ہے۔ نسیا کو حفص اور حمزہ نے نون کے فتحہ کے ساتھ اور دوسرے قراء نے نون کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ نسیان، حفظ کی ضد ہے۔ یعنی جو کچھ انسان کو یاد ہو اسے بھول جائے۔ دل کے ضعف کی وجہ سے یا غفلت کی وجہ سے یا ارادۃً بھلا دیتا ہے تاکہ دل سے اس کا ذکر مٹ جائے۔ جس نسیان کی اللہ تعالیٰ نے مذمت فرمائی ہے وہ، وہ ہے جسمیں ذاتی ارادہ شامل ہو۔ ارشاد ہے فَذُوْقُوْا بِمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا۔ (بس اب چکھو سزا اس جرم کی کہ تم نے بھلا دیا تھا اپنے اس روز کی ملاقات کو۔ اسی طرح انسان جس میں معذور ہو اس میں اس کا ارادہ نہ ہو وہ قابل مذمت نہیں ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے رفع عن امتی الخطأ والنسیان۔ میری امت سے خطا اور بھول کو اٹھا لیا گیا ہے، یعنی بھولنے کی وجہ سے مؤاخذہ نہیں کیا جاتا۔ کبھی کبھی نسیان کا اطلاق کسی چیز کو بطور اہانت ترک کرنے پر ہوتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف نسیان کی نسبت ہو تو یہی معنی مراد ہوتا ہے جیسے ارشاد ہے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِیَهُمْ النِّسی (بالکسر) اسکا معنی وہ چیز جو فراموش کی گئی ہو۔ جس طرح النقض (بالکسر) کا معنی وہ چیز جو توڑی گئی ہو پھر یہ عرف عام میں اس چیز کے لئے استعمال ہونے لگا جس کا کوئی اعتبار و شمار نہ ہو۔ عرب کہتے ہیں احفظوا انساکم۔ یعنی تم اپنی ایسی چیزوں کی حفاظت کرو جنہیں عام طور پر بھلایا جاتا ہے۔ النسی بالفتح بھی ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ بھی اس میں لغت ہے جیسے وِتْرٌ وَتْرٌ اَلْحِبْسُ اَلْحَبْسُ۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ مصدر ہے اس کے ساتھ کسی چیز کا نام رکھا جاتا ہے یا یہ مفعول کے معنی میں ہے اور النسی سے مراد وہ چیز ہے جو بھلائی گئی ہو۔ جیسا کہ اس کا اصل معنی ہے، اسی وجہ سے اس کے بعد منسیا ذکر فرمایا تاکہ یہ وہم دور ہو جائے کہ وہ معنی مراد ہے جس کا اعتبار اور شمار کم ہو اگرچہ بالکل بھلائی نہ گئی ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں نسی جو چیز پھینکی گئی ہو، فراموش کی گئی ہو اور حقارت کی وجہ سے ذکر نہ کی گئی ہو۔ اور منسیا کا معنی وہ چیز جو چھوڑی گئی ہو(2)۔ قتادہ فرماتے ہیں اس سے مراد وہ چیز ہے جو غیر مذکور اور غیر معروف ہو۔ عکرمہ، ضحاک اور مجاہد فرماتے ہیں وہ مراد جو پھینک دیا گیا ہو، بعض نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ کاش میں پیدا ہی نہ کی گئی ہوتی۔ اگر یہ کہا جائے کہ کسی تکلیف اور پریشانی کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز نہیں ہے جیسا کہ سورۂ بقرہ میں فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ کی تفسیر میں ذکر کیا گیا ہے۔ تو مریم علیہا السلام نے موت کی تمنا کیوں کی؟

جواب یہ ہے کہ شاید ان کی شریعت میں اس نہی کے وارد ہونے سے پہلے حضرت مریم نے یہ تمنا کی ہو یا بغیر ارادہ کے غلبہ حال کی وجہ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 539 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریۃ)

سے ایسا کیا ہو۔ یا دین میں فتنہ کے خوف سے ایسا کہا ہو کیونکہ انسان رسوائی کے وقت کبھی جھوٹ بولتا ہے اور کبھی اپنے آپ کو ہلاک کر دیتا ہے' تو آپ کو اندیشہ تھا کہ کہیں لوگوں کی رسوائی کی وجہ سے مجھ سے جھوٹ نہ نکل جائے اور خودکشی نہ کرلوں تو ان دونوں صورتوں میں دین کی خرابی کا خدشہ تھا۔ اس لئے موت کی تمنا کی اور دین میں فتنہ کے وقت موت کی تمنا کرنا جائز ہے۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے جیسا کہ تفصیل سے سورۂ بقرہ میں ذکر ہو چکا ہے۔

فَنَادٰىهَا مِنْ تَحْتِهَآ اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا ﴿۲۴﴾

''پس پکارا اسے ایک فرشتہ نے اس کے نیچے سے [1] (اے مریم) غمزدہ نہ ہو [2] جاری کر دی ہے تیرے رب نے تیرے نیچے ایک ندی [3]''

[1] ابوجعفر' نافع' حمزہ' کسائی اور حفص نے من کو میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ حروف جارہ سے ہے اور مابعد اس کا مجرور ہے اس صورت میں نادیٰ کا فاعل محذوف ہے، یعنی ایک ندا کرنے والے نے ندا دی اور وہ ندا کرنے والے جبرئیل امین تھے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ، السدی' قتادہ' ضحاک اور ایک پوری علماء کی جماعت کا کہنا ہے کہ مریم علیہا السلام ایک ٹیلہ پر تھیں اور جبرئیل امین ٹیلہ کے پیچھے سے نیچے تھے، انہوں نے حضرت مریم کو آواز دی، جب انہوں نے سنا کہ مریم علیہا السلام بہت گھبرا گئی ہیں۔ مجاہد اور حسن کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام شکم مادر سے باہر آئے تو انہوں نے یہ آواز دی(1)۔ اگر عیسیٰ علیہ السلام مراد ہوں تو یہ جملہ محذوف جملہ پر معطوف ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی **فوضعت حملها فناداها**۔ باقی قراء نے من کو میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ اسم موصول ہے یہ اپنے صلہ سے مل کر نادیٰ کا فاعل ہے، معنی یہ ہوگا کہ اس نے آپ کو ندا دی جو آپ کے نیچے تھا وہ جبرئیل تھے یا عیسیٰ علیہا السلام تھے۔ تحتھا کی ضمیر کا مرجع مریم علیہا السلام ہیں۔ بعض فرماتے ہیں ضمیر کا مرجع نخلہ ہے۔

[2] ان مفسرہ ہے جو نادیٰ کی تفسیر بیان کر رہا ہے، یعنی اس نے یہ آواز دی کہ تنہائی' کھانے اور پینے کی اشیاء کے نہ ہونے اور لوگوں کی باتوں سے غمزدہ نہ ہو۔

[3] سری سے مراد چھوٹی نہر ہے۔ طبرانی نے معجم صغیر میں حضرات براء کی مرفوع حدیث میں یہی معنی بیان کیا ہے لیکن ابو اسحٰق سے مرفوع بیان نہیں کی لیکن ابوسنان سے مرفوع بیان کی ہے۔ ابن عدی نے الکامل میں ابوسفیان سے معلل روایت کی ہے۔ ابن معین' نسائی' ابن المدینی سے اس کا ضعف مروی ہے۔ بخاری نے براء سے تعلیقاً ذکر کی ہے۔ عبدالرزاق' ابن جریر اور ابن مردویہ نے اپنی اپنی تفاسیر میں حضرت براء سے موقوف روایت کی ہے۔ اسی طرح حاکم نے المستدرک میں روایت کی ہے حاکم فرماتے ہیں یہ مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ طبرانی' اور ابونعیم نے الحلیہ میں ابن عمر سے روایت کیا ہے کہ چھوٹی نہر اللہ تعالیٰ نے نکالی تھی تاکہ عیسیٰ علیہ السلام کی والدہ اس سے پانی پیئے۔ اس حدیث کی سند میں ایوب بن نہیک ہیں جس کو ابوزرعہ اور ابوحاتم نے ضعیف قرار دیا ہے۔

بعض علماء فرماتے ہیں تحتک کا معنی تحت امرک ہے (تیرے حکم کے تحت ہے) اگر تو حکم دے گی تو یہ نہر جاری ہو جائے گی، اگر تو رکنے کا اشارہ کرے گی تو وہ رک جائے گی۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں جبرئیل نے پاؤں مارا۔ بعض فرماتے ہیں عیسیٰ علیہ السلام نے پاؤں مارا تو میٹھا چشمہ جاری ہو گیا۔ بعض فرماتے ہیں وہاں ایک خشک نہر تھی، اللہ تعالیٰ نے اس میں پانی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریہ)

جاری فرما دیا تھا۔ خشک کھجور پر پتے نکل آئے تھے اور اس پر پھل لگ کر پک گیا تھا(1)۔ بعض فرماتے ہیں السری کا معنی سردار ہے اور یہ سرو سے مشتق ہے اور مراد عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ الحسن فرماتے ہیں قسم بخدا عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے بلند عظمت اور بلند مقام بندے تھے(2)۔

وَهُزِّيٓ اِلَيۡكِ بِجِذۡعِ النَّخۡلَةِ تُسٰقِطۡ عَلَيۡكِ رُطَبًا جَنِيًّا ﴿۲۵﴾

''اور ہلاؤ اپنی طرف کھجور کے تنے کو گرنے لگیں گی تم پر پکی ہوئی کھجوریں۔ ۱ ''

۱ جذع سے پہلے باء تاکید کے لئے زائدہ ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں عرب کہتے ہیں ہزہ وہزبہ (3)۔ تساقط کو جمہور قراء نے تاء اور قاف کے فتحہ اور سین کی شد کے ساتھ پڑھا ہے۔ حمزہ نے سین کے فتحہ اور تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ باب تفاعل سے مضارع کا صیغہ ہے، اصل میں تیساقط تھا۔ حمزہ تاء کو حذف کر دیتے ہیں اور دوسرے قراء تاء کو سین میں ادغام کر دیتے ہیں۔ حفص نے تاء کے ضمہ اور قاف کے کسرہ کے ساتھ باب مفاعلہ سے پڑھا ہے اس کا معنی گرانا ہے اور مونث کا صیغہ اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ ضمیر نخلہ کی طرف لوٹ رہی ہے۔ یعقوب نے یاء کے ساتھ غائب کا صیغہ پڑھا ہے اور ضمیر جذع کی طرف لوٹ رہی ہے۔ رطباً تمیز ہے تساقط کی ضمیر سے۔ جمہور کی قرأت کے مطابق اور حفص اور یعقوب کی قرأت کے مطابق مفعول بہ ہے۔ جنیاً جو اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہو اور اسکے چننے کا وقت آ گیا ہو۔ ربیع بن خثیم فرماتے ہیں نفاس والی عورت کے لئے میرے نزدیک تر کھجور سے زیادہ کوئی چیز مفید نہیں اور مریض کے لئے شہد سے بہتر کوئی چیز نہیں(4)۔

فَكُلِيۡ وَ اشۡرَبِيۡ وَ قَرِّيۡ عَيۡنًا ۚ فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الۡبَشَرِ اَحَدًا ۙ فَقُوۡلِيۡۤ اِنِّيۡ نَذَرۡتُ لِلرَّحۡمٰنِ صَوۡمًا فَلَنۡ اُكَلِّمَ الۡيَوۡمَ اِنۡسِيًّا ﴿۲۶﴾

''(میٹھے میٹھے خرمے) کھاؤ اور (ٹھنڈا پانی) پیو ۱ اور (اپنے فرزند دلبند کو دیکھ کر) آنکھیں ٹھنڈی کرو پھر اگر تم دیکھو کسی آدمی کو تو (اشارہ سے اسے) کہو کہ میں نے نذر مانی ہوئی ہے رحمٰن کے لئے (خاموشی کے) روزہ کی پس میں آج کسی انسان سے گفتگو نہیں کروں گی۔ ۲ ''

۱ عیناً۔ قری کی نسبت سے تمیز ہے۔ قری، قرار سے مشتق ہے کیونکہ آنکھ جب خوش کن منظر دیکھتی ہے تو وہ اس منظر کو ہی دیکھتی رہ جاتی ہے، کسی دوسری چیز کی طرف منتقل نہیں ہوتی بلکہ اسی منظر پر قرار پذیر رہتی ہے۔ عرب کہتے ہیں قر اللہ عینک یعنی اللہ تعالیٰ تجھے خوش کن اور دل پسند چیز دکھائے اور تیری نظر کو اس منظر پر ٹھہرا دے تا کہ تیری نظر ادھر ادھر نہ بھٹکے۔ اقر اللہ عیناک۔ اللہ تجھے سلا دے۔ اقر یقر استعمال ہوتا ہے جب کوئی سکون پذیر ہو جائے۔ یا یہ القر سے مشتق ہے جسکا معنی ٹھنڈک ہے کیونکہ خوشی کے آنسو ٹھنڈے ہوتے ہیں اور غم کے آنسو گرم ہوتے ہیں، اسی وجہ سے محبوب کو قرۃ العین اور ناپسند چیز کو سخنۃ العین کہتے ہیں۔

۲ اما اصل میں ان ما ہے، ما زائدہ ہے جو ان شرطیہ میں مدغم کیا گیا ہے۔ ترین کے آخر میں نون تاکید ہے، یعنی اے مریم اگر کوئی شخص تجھے نظر آئے اور تجھ سے اس ننھے بچے کے متعلق پوچھے تو تم صرف اتنا کہنا کہ میں نے اپنے رب رحمٰن کی خاطر خاموشی کا روزہ رکھا ہوا ہے۔ ابن مسعود نے یہی مفہوم بیان فرمایا ہے۔ السدی فرماتے ہیں بنی اسرائیل میں جو مجاہدہ کرتا وہ جس طرح کھانے، پینے کا روزہ رکھتا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 197 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

اسی طرح شام تک بات کرنے کا بھی روزہ رکھتا(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ بات اشارہ سے کہنے کو کہا تھا کیونکہ بات جھگڑے کا باعث بنتی اور عیسیٰ علیہ السلام کی کلام پر اکتفا کا حکم فرمایا تھا کیونکہ عیسیٰ علیہ السلام کا بچپن میں کلام کرنا سب طعن وتشنیع کی زبانوں کو بند کرنا تھا۔ بعض فرماتے ہیں اتنی مقدار آپ کو بات کرنے کی اجازت تھی۔ اس کے بعد کلام سے رک جانے کا حکم تھا۔ کہا جاتا ہے کہ آپ ملائکہ سے کلام فرماتی تھیں، انسانوں سے کلام نہیں کرتی تھیں۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ ؕ قَالُوْا یٰمَرْیَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَیْـًٔا فَرِیًّا ﴿۲۷﴾

"اس کے بعد وہ لے آئیں بچہ کو اپنی قوم کے پاس (گود میں) اٹھائے ہوئے انہوں نے کہا اے مریم تم نے بہت ہی برا کام کیا ہے۔ لہ"

لہ بہ میں ضمیر کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کے ہاں جب بچہ کی ولادت ہوئی تو آپ فوراً اسے اٹھا کر قوم کے پاس لے آئیں۔ کلبی نے لکھا ہے کہ حضرت مریم اور آپ کے بچہ کو یوسف النجار ایک غار میں اٹھا کر لے آئے۔ آپ وہاں چالیس دن رہیں حتیٰ کہ نفاس سے پاک ہو گئیں۔ پھر حضرت مریم اپنا معصوم بچہ اٹھائے اپنی قوم کے پاس آئیں، راستہ میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی والدہ سے کلام کی تھی۔ کہا اے امی جان مبارک ہو میں اللہ کا بندہ ہوں اور اس کا مسیح ہوں۔ جب آپ گھر آئیں اور ساتھ بچہ بھی تھا چونکہ گھر والے سب نیکوکار لوگ تھے(2) آپ کو ایسی حالت میں دیکھ کر رونے لگے اور پریشان ہو گئے اور کہا اے مریم تو نے بہت برا کام کیا ہے' لقد جئت الخ محذوف قسم کا جواب ہے۔ فریا۔ ناپسندیدہ کام، یہ فری الجلد سے مشتق ہے اور اس کا معنی الشق ہے' اس معنی میں حضرت حسان کا قول ہے لا فرینهم فری الادیم۔ میں ہجو کر کے انہیں چمڑے کے کاٹنے کی طرح کاٹ دوں گا۔ قرآن کریم میں اکثر جھوٹ' شرک اور ظلم کے لئے استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ (اور کون زیادہ ظالم ہے اس سے جس نے بہتان لگایا اللہ پر جھوٹا۔ اسی طرح ارشاد ہے۔ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰۤى اِثْمًا عَظِيْمًا۔ (اور جو شریک ٹھہراتا ہے اللہ کے ساتھ وہ ارتکاب کرتا ہے گناہ عظیم کا) چونکہ شرک اور معاصی انسان کی عصمت اور صلاح کی چادر کو تار تار کر دیتے ہیں، اس لئے شرک اور معصیت کو افتریٰ کے الفاظ سے تعبیر کیا۔

بعض علماء نے اس کا معنی برا اور عجیب کیا ہے، یعنی ایسا کام جس نے عادت کو کاٹ دیا ہے اور اس میں شگاف کر دیا ہے۔ ابو عبیدہ فرماتے ہیں ہر برے امر کے لئے خواہ وہ قول ہو یا عمل اس کے لئے فری استعمال ہوتا ہے۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق فرمایا میں نے حضرت عمر جیسا عبقری اور تعجب انگیز کام کرنے والا شخص نہیں دیکھا(3)۔

یٰۤاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِیًّا ﴿۲۸﴾

"اے ہارون کی بہن لہ نہ تیرا باپ برا آدمی تھا اور نہ ہی تیری ماں بدچلن تھی ۲؎"

لہ ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے کہ ہارون سے مراد موسیٰ علیہ السلام کے بھائی ہارون نبی ہیں کیونکہ آپ ان کی نسل سے تھیں جس طرح تیمی شخص کو اخو تمیم کہا جاتا ہے(4)۔ بعض فرماتے ہیں آپ ان لوگوں کی نسل سے تھیں جو ہارون نبی کے ساتھ بھائیوں کا رشتہ رکھتے تھے۔ ابن ابی حاتم نے علی بن طلحہ سے یہی قول روایت کیا ہے۔ کلبی فرماتے ہارون حضرت مریم کے علاتی بھائی تھے۔ بنی اسرائیل کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

ایک نیک صالح مرد تھے(1)۔ بغوی نے مغیرہ بن شعبہ سے روایت کیا ہے کہ جب میں نجران گیا تو وہاں کے عیسائیوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم قرآن میں پڑھتے ہو یاخت ھارون۔ حالانکہ وہ آپ سے صدیاں پہلے گزر چکے ہیں۔ فرماتے ہیں (میں انہیں کوئی جواب نہ دے سکا) لیکن جب میں رسول اللہ ﷺ کی بارگاہ میں لوٹ کر آیا تو میں نے یہی سوال آپ ﷺ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا بنی اسرائیل کا معمول تھا کہ وہ اپنے بچوں کے نام انبیاء کرام اور پہلے بزرگوں کے ناموں پر رکھتے تھے(2)۔ اس حدیث کو مسلم نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ قتادہ وغیرہ نے فرمایا ہارون بنی اسرائیل میں ایک نیک عابد شب بیدار تھا۔ روایت ہے کہ جب یہ ہارون فوت ہوئے تو ان کے جنازہ میں دوسرے لوگوں کے علاوہ چالیس ہزار ایسے افراد تھے جن کے نام ہارون تھے۔ لوگوں نے حضرت مریم کو ان سے تشبیہ دی کہ تو تو ہارون کی طرح نیک سیرت اور بلند کردار تھی۔ نسبی بھائی مراد نہیں ہیں جیسا کہ قرآن نے فضول خرچی کرنے والوں کو شیطانوں کا بھائی کہا ہے إِنَّ الْمُبَذِّرِينَ كَانُوا إِخْوَانَ الشَّيَاطِينِ (بے شک فضول خرچی کرنے والے شیطانوں کے بھائی ہیں)(3) اسی طرح عبدالرزاق اور عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کیا ہے کہ ممکن ہے انہوں نے استہزاءً اور مزاقاً حضرت مریم کو حضرت ہارون سے تشبیہ دی ہو یا اس لئے تشبیہ دی ہو کہ پہلے انہوں نے حضرت مریم کی نیکی اور پاک سیرت کو دیکھا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون بنی اسرائیل کا فاسق و فاجر شخص تھا۔ انہوں نے فسق کی وجہ سے اس کے ساتھ تشبیہ دی۔ ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے اسی طرح روایت کیا ہے۔

ع حضرت مریم کے والد کا نام عمران تھا اور والدہ کا نام حنہ تھا۔ بغیا کا معنی زانیہ اور بدکارہ ہے۔ اس جملہ میں اس بات کا ثبوت ہے کہ ان سے یہ کام انتہائی قبیح ہے کیونکہ نیک لوگوں کی اولاد سے برا کام زیادہ برا اور عجیب سمجھا جاتا ہے۔

فَأَشَارَتْ إِلَيْهِ ۖ قَالُوا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَن كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا ﴿٢٩﴾

''اس پر مریم نے بچہ کی طرف اشارہ کیا لوگ کہنے لگے ہم کیسے بات کریں لے اس سے جو گہوارہ میں (کم سن) بچہ ہے۔ ع ''

لے حضرت مریم نے اشارہ فرمایا کہ اس بچہ سے بات کرو۔ حضرت ابن مسعود فرماتے ہیں جب حضرت مریم کے پاس اعتراض کا کوئی جواب نہ تھا تو آپ نے اشارہ کیا تاکہ اس کا کلام آپ کی پاکدامنی کی حجت بن جائے۔ آپ کے واقعہ میں ہے جب آپ نے بچہ کی طرف اشارہ کیا تو قوم کو غصہ آ گیا اور کہنے لگے تو نے بہت برا کیا ہے تو ہم سے مزاح کرتی ہے(4)۔

ع کان زائدہ ہے جیسا کہ اس ارشاد میں زائدہ ہے هَلْ كُنتُ إِلَّا بَشَرًا رَّسُولًا اور من کا صلہ فی المھد صبیًا ہے۔ فی المھد ظرف مستقر ہے اور صبیاً ظرف کی ضمیر سے حال ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کان تامہ ہو یا دوام کے لئے ہو جیسا کہ کان اللہ علیما حکیماً میں ہے یا بمعنی صار ہو۔ یہاں مہد سے مراد ماں کی گود ہے۔ بعض فرماتے ہیں مہد سے مراد واقعی مہد (پنگھوڑا) ہے۔ ان کا مقصود یہ تھا کہ ہم نے تو کوئی عقلمند شخص ایسا نہیں دیکھا جو نا سمجھ اور کلام سے عاجز بچہ سے گفتگو کرے۔ سدی کہتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے ان کی کلام سنی تو آپ نے دودھ پینا چھوڑ دیا اور لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب حضرت مریم نے اشارہ فرمایا تو آپ نے پستان چھوڑ دیا، بائیں طرف پر سہارا لیا اور ان کی طرف متوجہ ہوئے اور دائیں ہاتھ سے اشارہ کیا اور فرمایا(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً 4۔ تفسیر خازن، ایضاً 5۔ تفسیر بغوی، ایضاً

قَالَ اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰهِ ۛؕ اٰتٰىنِیَ الْكِتٰبَ وَ جَعَلَنِیْ نَبِیًّا ۙ﴿۳۰﴾

''(اچانک) وہ بچہ بول پڑا لہ کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اس نے مجھے کتاب عطا کی ہے اور اس نے مجھے نبی بنایا ہے۔ ۲''

لہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی ذات کی اسم جلالت (اللہ) کی طرف اضافت کر کے اشارہ فرمایا کہ میں اللہ کا عبد مکرم ہوں۔ چونکہ قوم منکر تھی اس لئے تاکید کے ساتھ آپ نے کلام کو ذکر فرمایا۔ وہب فرماتے ہیں جب بنی اسرائیل حضرت مریم سے مجادلہ اور مناظرہ کر رہے تھے تو زکریا علیہ السلام تشریف لے آئے۔ آپ نے عیسیٰ علیہ السلام کو فرمایا اگر تجھے حکم دیا گیا ہے تو اپنی دلیل پیش کرو۔ عیسیٰ علیہ السلام نے اس وقت یہ ارشاد سنایا۔ اس وقت آپ کی عمر چالیس دن تھی (1)۔

مقاتل فرماتے ہیں پیدائش کے دن ہی آپ نے انی عبداللہ فرمایا تھا۔ آپ نے اپنی عبودیت کا اقرار کیا تھا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں اور آپ نے سب سے پہلے یہی کلام فرمائی تا کہ لوگ مجھے الہ (خدا) نہ بنالیں (2)۔

۲ اتانی کو حمزہ نے یاء کے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ الکتاب سے مراد تورات ہے۔ حضرت حسن فرماتے ہیں حضرت عیسیٰ علیہ السلام ابھی ماں کے پیٹ میں تھے کہ اللہ نے تورات آپ کو الہام فرمائی تھی (3)۔ اکثر علماء فرماتے ہیں کہ کتاب سے انجیل مراد ہے اور آپ کو صغرسنی میں انجیل دی گئی تھی لیکن آپ اس وقت زیرک لوگوں جیسی عقل رکھتے تھے۔ بعض نے اس کا معنی یہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کتاب (انجیل) عطا فرمائے گا اور مجھے نبی بنائے گا۔ اور ماضی کے الفاظ سے اس لئے تعبیر فرمایا کیونکہ ان امور کا وقوع یقینی تھا اور محقق تھا اور جس کا وقوع یقینی ہو وہ واقع کی طرح ہوتا ہے (یعنی گویا وہ ہو چکا ہے) بعض فرماتے ہیں یہ آپ نے وہ بات بتائی جو آپ کے بارے لوح محفوظ میں لکھی تھی۔ جیسا کہ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا متی کنت نبیاً۔ آپ کب سے نبی ہیں، فرمایا میں اس وقت سے نبی ہوں جبکہ آدم علیہ السلام روح اور جسم کے درمیان تھے۔ اس حدیث کو ابن سعد، ابو نعیم نے الحلیہ میں میسرہ الفجر بن سعد عن ابی الجدعاء کے سلسلہ سے روایت کیا ہے اور طبرانی نے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔

وَّ جَعَلَنِیْ مُبٰرَكًا اَیْنَ مَا كُنْتُ ۪ وَ اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوةِ وَ الزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَیًّا ﴿۳۱﴾

''اور اسی نے مجھے بابرکت کیا ہے جہاں کہیں بھی میں ہوں لہ اور اسی نے مجھے حکم دیا ہے نماز ادا کرنے کا اور زکوٰۃ دینے کا ۲ جب تک میں زندہ رہوں ۳''

لہ برکۃ کا معنی نیکی اور خیر کو ثابت کرنا ہے اور یہ بورک البعیر سے مشتق ہے جس کا معنی اونٹ کا بیٹھنا ہے یا برکۃ بمعنی عطاء میں زیادتی اور اضافہ کرنا ہے۔ عرب کہتے ہیں اَللّٰهُمَّ بَارِکْ فِیْ عَطَاءِ کَ۔ اے اللہ اپنی عطا اور بخشش میں اضافہ فرما۔ یا بمعنی عظمت اور کرم ہے۔ کہا جاتا ہے یہ فلاں کی برکت کی وجہ سے ہے۔ بعض نے مبارکاً کا معنی یہاں نفاعاً (بہت زیادہ نفع دینے والا) کیا ہے۔ مجاہد فرماتے ہیں اس کا معنی معلم خیر ہے، یعنی بھلائی کی تعلیم دینے والا۔ عطاء فرماتے ہیں اس کا معنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی توحید اور اس کی عبادت کی طرف دعوت دینے والا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ اللہ نے مجھے اپنے پیروکاروں کے لئے باعث برکت بنایا ہے (4)۔ جہاں بھی میں ہوں خواہ زمین میں خواہ آسمان میں۔ خواہ کسی طرف بھی متوجہ ہوں۔ اسی وجہ سے کہا جاتا ہے کہ آپ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 198 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 199 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

آسمان والوں کے لئے بھی نفع رساں ہیں کیونکہ فرشتے بھی آپ سے مستفید ہوتے ہیں۔

؎ اس نے مجھے نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرکے مال کو اور نفس کو ہر قسم کے رذائل سے پاک کرنے کا حکم دیا ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں اگر یہ کہا جائے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے پاس تو مال تھا ہی نہیں انہیں کیسے زکوٰۃ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ بعض علماء نے اس سوال کے جواب میں لکھا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے مجھے اس نے زکوٰۃ کا حکم دیا ہے اگر میرے پاس مال ہو۔ بعض فرماتے ہیں خیر کی کثرت طلب کرنے کے لئے یہ حکم دیا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں تجھے نماز اور زکوٰۃ کا حکم دوں گا۔(1)

؎ مادمت حیا۔ صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی طرف ہے یعنی اس نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں اپنی زندگی میں نماز اور زکوٰۃ ادا کرتا رہوں۔

وَّبَرًّۢا بِوَالِدَتِیْ٘ وَلَمْ یَجْعَلْنِیْ جَبَّارًا شَقِیًّا ﴿۳۲﴾

''اور مجھے خدمت گزار بنایا ہے اپنی والدہ کا اور اس نے نہیں بنایا مجھے جابر (اور) بدبخت ؎۔''

؎ برا کا عطف مبارکاً پر ہے۔ یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہے جس پر اوصانی کا فعل دلالت کر رہا ہے یعنی کلفنی برا۔ اس صورت میں برا مصدر ہوگا۔ جبارا کا معنی متکبر اور سرکش ہے۔ شقیا اپنے رب کا نافرمان۔ بعض فرماتے ہیں شقی وہ ہوتا ہے جو گناہ کرے لیکن توبہ نہ کرے۔

وَالسَّلٰمُ عَلَیَّ یَوْمَ وُلِدْتُّ وَیَوْمَ اَمُوْتُ وَیَوْمَ اُبْعَثُ حَیًّا ﴿۳۳﴾

''اور سلامتی ہو مجھ پر جس روز میں پیدا ہوا اور جس دن میں مروں گا اور جس دن مجھے اٹھایا جائے گا زندہ کر کے ؎۔''

؎ والسلام علی حقیقت میں جملہ فعلیہ ہے، اسی وجہ سے اس کا عطف جملہ فعلیہ پر کیا گیا ہے اور صورۃ جملہ اسمیہ اس لئے بنایا تاکہ استمرار اور ثبوت پر دلالت کرے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے تینوں مختلف حالات میں سلامتی کا مژدہ سنایا گیا ہے۔ پیدائش کے وقت شیطان کے کچوکے سے موت کے وقت عذاب قبر سے اور حشر کے روز قیامت کی ہولناکیوں اور دوزخ کے عذاب سے۔ السلام پر الف لام عہدی ہے، جنس کا ہے۔ اس کلام میں آپ کے دشمنوں پر لعنت کی طرف اشارہ ہے کیونکہ جب سلامتی جنس کو اپنے لئے اور اپنے متبعین کے لئے بنایا تو اشارہ ہے کہ جو آپ کے مخالف ہے اس کا حکم بھی مخالف ہوگا جیسے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے وَالسَّلٰمُ عَلٰی مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰی (سلامتی ہو ان پر جو ہدایت کے پیروکار ہیں) یہ کلام اشارہ ہے کہ جو ہدایت کو جھٹلاتا ہے اور پیٹھ پھیرتا ہے اس پر عذاب ہے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں جب عیسیٰ علیہ السلام نے مؤثر اور بلیغ کلام فرمائی تو انہیں حضرت مریم علیہا السلام کی پاکدامنی اور عصمت کا یقین ہو گیا۔ پھر عیسیٰ علیہ السلام خاموش ہو گئے اور اس عمر تک پہنچنے سے پہلے کلام نہ فرمائی جس میں عام طور پر بچے بولنا شروع کرتے ہیں۔(2)

ذٰلِكَ عِیْسَى ابْنُ مَرْیَمَ ۚ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِیْ فِیْهِ یَمْتَرُوْنَ ﴿۳۴﴾

''یہ ہے عیسیٰ بن مریم ؎ (اور یہ ہے وہ) سچی بات جس میں لوگ جھگڑ رہے ہیں ؎۔''

؎ ذالک کا مشار الیہ سابقہ کلام ہے جس میں عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی عبودیت وغیرہ کا اظہار فرمایا۔ ذالک مبتدا اور عیسی خبر ہے، ابن مریم نعت یا دوسری خبر ہے، یعنی اس طرح حقیقت نہیں ہے جیسا کہ عیسائی کہتے ہیں کہ آپ خدا ہیں، یہ ان کا من گھڑت خیال ہے۔ اس جملہ میں نصرانیوں کے عقیدہ کی بڑے بلیغ اور موثر انداز میں تردید و تکذیب کی جا رہی ہے اور طریق برہانی سے ان کا رد کیا گیا

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 199 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

ہے۔ اللہ تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو ایسی صفت سے موصوف فرمایا جو ان کے عقیدہ کی ضد ہے پھر حکم کا عکس بیان فرمایا (یعنی انہوں نے حکم لگایا کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ ہے یا اللہ کا بیٹا ہے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ (یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے) یہ ارشاد اللہ کے بیٹے ہونے کی صراحۃً نفی ہے۔ یعنی یہ صحیح ہی نہیں بلکہ محال ہے کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے)

۲ ابن عامر، عاصم اور یعقوب نے قول الحق کو مصدر مئوکد کی حیثیت سے منصوب پڑھا ہے تقدیر اس طرح ہے اقول قول الحق یا مدح کی بناء پر منصوب ہے، باقی قراء نے مبتداء محذوف کی خبر کی حیثیت سے مرفوع پڑھا ہے۔ تقدیر کلام اس طرح ہوگی۔ الکلام السابق قول الحق لا ریب فیه۔ سابق کلام سچی کلام ہے اس میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ قول کی حق کی طرف اضافت بیانیہ ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قول الحق یا تو عیسیٰ کی صفت ہے یا اس سے بدل ہے یا اس کی خبر ثانی ہے۔ اس کا معنی کلمۃ الحق ہے۔ یمترون کا معنی شک کرنا اور جھگڑا کرنا ہے۔ یہودی کہتے آپ جادوگر اور کذاب ہیں جبکہ نصاریٰ کہتے کہ آپ (نعوذ باللہ) اللہ کے بیٹے ہیں یا خود اللہ ہیں۔ آئندہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے بیٹا ہونے کی نفی فرمادی۔

مَا كَانَ لِلّٰهِ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ ۙ سُبْحٰنَهٗ ۭ اِذَا قَضٰٓى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۝ ۳۵

"یہ زیبا ہی نہیں اللہ تعالیٰ کو کہ وہ کسی کو اپنا بیٹا بنائے۔ وہ پاک ہے جب وہ فیصلہ فرمادیتا ہے کسی کام کا تو بس صرف اتنا حکم دیتا ہے اس کے لئے کہ ہوجا تو وہ کام ہوجاتا ہے۔ ۱"

۱ ولد سے پہلے من نفی کی تاکید کے لئے لایا گیا ہے۔ سبحانه مصدر ہے جو فعل کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ اصل میں یہ اسبحه سبحاناً تھا۔ یہ جملہ معترضہ ہے، اللہ تعالیٰ کے کسی کو بیٹا بنانے سے پاک ہونے پر دلالت کرنے کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ وہ قادر مطلق ہے کہ کسی چیز کو پیدا کرنے کا ارادہ فرماتا ہے تو کن فرماتا ہے تو وہ ہوجاتی ہے تو عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا بھی اس کے حکم اور اس کے پیدا کرنے کے ارادہ سے ہے۔ جو ذات ایسی عظیم قدرتوں کی مالک ہو وہ مخلوق کی مشابہت سے پاک ہوتی ہے۔ عورتوں کے حمل کے ذریعے بچہ پیدا کرنے کی اسے حاجت نہیں ہوتی اور وہ علوق کے ذریعے اجزاء بنانے کی بھی محتاج نہیں ہوتی۔ جملہ شرطیہ۔ کسی کو بیٹا بنانے کی نفی کے لئے بطور تعلیل ہے۔ ابن عامر نے فیکون کو امر کے جواب کی بناء پر منصوب پڑھا ہے۔

وَاِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ۭ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝ ۳۶

"اور بلاشبہ اللہ تعالیٰ میرا بھی پروردگار ہے اور تمہارا بھی سو اسی کی عبادت کیا کرو یہی سیدھا راستہ ہے۔ ۱"

۱ کوفیوں ابن عامر اور یعقوب نے ان کو الف کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس بناء پر کہ یہ مستقل جملہ ہے اور اس کا عطف انی عبداللّٰه پر ہے۔ اہل حجاز اور ابو عمرو نے الصلوٰۃ والزکوٰۃ پر عطف کی بناء پر الف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اوصانی بان اللّٰه ربی یا یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ ثابت ان اللّٰه ربی و ربکم۔ اور جملہ انی عبداللّٰه پر معطوف ہو کر قول کا مقولہ ہے۔ اس آیت میں توحید کے اعتقاد کے ساتھ قوت نظریہ کی تکمیل کی طرف اشارہ ہے اور فاعبدوہ میں ماموراتِ کے ادا کرنے اور منہیات سے رکنے کے ساتھ قوت عملیہ کی تکمیل مطلوب ہے۔ فاء سببیہ ہے اور هذا صراط مستقیم۔ فاعبدوہ کی تعلیل ہے اور ما سبق کی تاکید ہے۔ صراط مستقیم سے مراد وہ راستہ ہے جس کے خیر ہونے کی شہادت دی گئی ہو۔

فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ مَّشْهَدِ یَوْمٍ عَظِیْمٍ ﴿۳۷﴾

"پھر کئی گروہ آپس میں اختلاف کرنے لگے ۱؎ پس ہلاکت ہے کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے جو بہت بڑا ہے۔ ۲؎"

۱؎ احزاب سے مراد یہود ونصاریٰ یا نصرانیوں کے مختلف گروہ ہیں۔ نصرانیوں کے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تین گروہ تھے۔نسطوریہ کہتے آپ اللہ کے بیٹے ہیں، یعقوبیہ کہتے خدا عیسیٰ علیہ السلام کی صورت میں زمین پراترا تھا پھر آسمان پر واپس لوٹ گیا۔عیسائیوں کا ایک گروہ ملکائیہ تھا جو کہتے کہ عیسیٰ علیہ السلام اللہ کے برگزیدہ بندے اور اس کے رسول تھے۔فاختلف کا عطف قال عیسی پر ہے۔ من بینهم میں من زائدہ ہے اور ظرف اختلف کے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ آپ کے اصحاب کے درمیان یا آپ کی قوم کے درمیان یا لوگوں کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔

۲؎ فویل میں فاءسببیہ ہے۔ویل اصل میں مصدر منصوب ہے جس کا معنی هلكوا هلاكاً ہے پھر جملہ فعلیہ سے اسے جملہ اسمیہ کی طرف منتقل کیا گیا اور ابتداء کی بناء پر اسے رفع دیا گیا تاکہ استمرار پر دلالت کرے۔جیسے سلام علیکم ہے۔ الذین کفروا اصل میں مصدر کے متعلق تھا۔ پھر اسے مبتدا کی خبر کے طور پر ظرف مستقر بنایا گیا۔ من مشهد یوم عظیم'ویل کے متعلق ہے یعنی کفار کے لئے اس دن کی حاضری سے ہلاکت ہے جس کی ہولناکی'جس میں حساب وجزاء کا سلسلہ بڑا عظیم ہوگا۔مراد قیامت کا دن ہے یا مشہد کا معنی وقت الشہود ہے یا مکان الشہود ہے، یعنی حاضری کے وقت یا حاضری کی جگہ کی وجہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے یا یہ معنی کہ اس دن کی ان کے خلاف گواہی کی وجہ سے ان کے لئے ہلاکت ہے۔فرشتے'انبیاء کرام اور امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوۃ والتسلیم۔ان کی زبانیں'ان کے ہاتھ اور پاؤں ان کے کفروفسق کی گواہی دیں گے۔یا من وقت الشهادة علیهم او من مکانها مراد ہے یعنی ان کے خلاف شہادت کے وقت یا شہادت کی جگہ سے کفار کے لئے ہلاکت ہے۔بعض فرماتے ہیں اس کا یہ معنی کہ جو انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق گواہی دی اس کی وجہ سے انکے لئے ہلاکت ہے۔

اَسْمِعْ بِهِمْ وَاَبْصِرْ ۙ یَوْمَ یَاْتُوْنَنَا لٰكِنِ الظّٰلِمُوْنَ الْیَوْمَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ ﴿۳۸﴾

"(اس دن) یہ خوب سننے لگیں گے اور خوب دیکھنے لگیں گے جس دن آئیں گے ہمارے پاس ۱؎ لیکن یہ ظالم آج تو کھلی گمراہی میں ہیں۔ ۲؎"

۱؎ اس آیت میں یوم سے مراد قیامت کا دن ہے۔اسمع و ابصر تعجب کے صیغے ہیں، اللہ تعالیٰ تعجب کرنے سے پاک ہے۔اس لئے جمہور فرماتے ہیں اس کا یہ مطلب ہے کہ قیامت کے روز انکے کان اور ان کی آنکھیں'حق کو غور سے سننے اور دیکھنے کی وجہ سے قابل تعجب ہوں گی لیکن دنیا میں گنگا اور بہرہ بنے رہنے کے بعد آج ان کا سننا اور دیکھنا کچھ نفع بخش نہیں'دنیا میں حق کو سنتے اور حق کا مشاہدہ کرتے تو تب نفع بخش تھا۔یا یہ دھمکی اور تہدید ہے کہ یہ لوگ قیامت کے روز ان ہماری دھمکیوں اور تہدید کو کانوں سے سنیں گے اور آنکھوں سے مشاہدہ کریں گے، جبکہ دنیا میں انہوں نے ہمارے ڈرانے اور خوف دلانے کی طرف کچھ توجہ نہ کی۔ بهم۔ جار مجرور صیغہ تعجب کے فاعل ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اسمع و ابصر امر کے صیغے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو حکم فرمایا ہے کہ ان عقل کے اندھوں کو اس عظیم دن کی ہولناکیوں کے بارے میں سناؤ اور دکھاؤ۔اس تاویل پر جار مجرور محل نصب میں ہوں گے۔

۳ے الیوم سے مراد دنیا ہے اور یہ ظرف' اس فعل یا شبہ فعل کے متعلق ہے جس کے متعلق فی ضلل مبین ہے۔ ضمیر کی جگہ یہاں الظالمون استعمال فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ پتہ چل جائے کہ وہ ظالم تھے کیونکہ انہوں نے اس وقت اپنے کانوں اور آنکھوں کو استعمال ہی نہ کیا، جبکہ ان کے لئے سننا اور دیکھنا مفید تھا' اس وقت ان کی عقل پر پردے پڑے رہے۔ اسی گمراہی کی بناء پر اللہ تعالیٰ نے ان کی غفلت و لاپرواہی پر مہر لگادی۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْحَسْرَةِ اِذْ قُضِيَ الْاَمْرُ ۘ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ وَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۹﴾

''اور اے نبی کریم آپ ڈرائیے انہیں حسرت و ندامت کے دن سے جب ہر بات کا فیصلہ کر دیا جائے گا۱ے اور آج یہ لوگ غفلت میں ہیں اور یہ ایمان نہیں لاتے۔ ۲ے''

۱ے یوم الحسرۃ۔ انذر کا مفعول ثانی ہے۔ انذرھم کا جملہ یا تو معترضہ ہے یا فاختلف پر معطوف ہے قلنا کی تقدیر کے ساتھ۔ اذ قضی الامر' یا تو الیوم سے بدل ہے یا حسرۃ کی ظرف ہے۔ یعنی جب حساب سے فراغت ہو جائے گی۔ جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل کر دیئے جائیں گے اور موت کو ذبح کر دیا جائے گا۔

حضرت ابوسعید الخدری سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا موت کو چتکبرے مینڈھے کی صورت میں لایا جائے گا اور ایک منادی کرنے والا ندا دے گا اے جنتیو! پس وہ اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور دیکھیں گے وہ پوچھے گا کیا تم اسے جانتے ہو وہ کہیں گے یہ موت ہے۔ وہ سب اسے دیکھ چکے ہوں گے پھر اسے ذبح کیا جائے گا پھر منادی کرنے والا کہے گا اے اہل جنت اب تم نے ہمیشہ زندہ رہنا ہے۔ اب کوئی موت نہیں آئے گی۔ اے دوزخیو! تم نے دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے، تمہیں بھی موت نہیں آئے گی۔ پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی وانذرھم یوم الحسرۃ اذ قضی الامر الآیہ اس حدیث کو بغوی نے روایت کیا ہے(1)۔ شیخین نے بھی اسی طرح روایت کی ہے اور شیخین نے موت کا ذبح کرنا ابن عمر کی حدیث سے روایت کیا ہے۔ لیکن اس حدیث میں آیت کا پڑھنا نہیں ہے۔ اسی طرح ابو یعلیٰ' بزار' اور طبرانی نے الاوسط میں صحیح سند کے ساتھ حضرت انس سے روایت کی ہے۔ حاکم اور ابن حبان نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے لیکن اس میں بھی قراءت آیت کا ذکر نہیں ہے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں قیامت کے دن کو یوم الحسرت اس لئے کہا گیا ہے کیونکہ مجرم اپنے جرم پر اور نیکوکار اپنی نیکیوں کی قلت پر حسرت کریں گے(2)۔

طبرانی اور ابویعلی نے معاذ بن جبل سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اہل جنت کو کوئی حسرت و ندامت نہ ہو گی لیکن اس وقت پر وہ حسرت کریں گے جو اللہ کے ذکر کے بغیر گزرا ہو گا۔

امام بغوی نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص بھی مرتا ہے وہ حسرت کرتا ہے اور شرمندہ ہوتا ہے۔ صحابہ نے پوچھا ندامت کس پر ہو گی، فرمایا اگر نیکوکار ہو گا تو یہ حسرت کرے گا کہ زیادہ نیکیاں نہ کر سکا۔ اگر مجرم ہو گا تو یہ حسرت کرے گا کہ وہ برائی سے کیوں نہ بچا(3)۔

۲ے ابھی وہ اپنی گمراہی سے غافل ہیں اور اس بات سے بھی بے خبر ہیں کہ آخرت میں ان سے کیسا سلوک ہو گا، اب تو وہ مخبر صادق

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 200 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 552 (العلمیہ) 3۔ تفسیر بغوی، ایضاً

ﷺ کی بات پر ایمان نہیں لاتے۔ یہ دونوں جملے فی ضلال مبین جس فعل یا شبہ فعل کے متعلق ہیں اس کی ضمیر سے حال ہیں اور درمیان میں کلام معترض ہے یا یہ دونوں جملے انذرھم کی ضمیر منصوب سے حال ہیں، یعنی ان کو ڈرایئے درآں حالیکہ یہ غافل ہیں اور تصدیق نہیں کرتے ہیں۔ پس یہ حال ہے جو تعلیل کو متضمن ہے۔

إِنَّا نَحْنُ نَرِثُ الْأَرْضَ وَمَنْ عَلَيْهَا وَإِلَيْنَا يُرْجَعُونَ ﴿٤٠﴾

''یقیناً ہم ہی وارث ہوں گے زمین کے اور جو کچھ اس کے اوپر ہے [1] اور ہماری طرف ہی سب لوٹائے جائیں گے۔ [2]''

[1] یعنی یہ زمین اور اس پر رہنے والی مخلوق سب فناء ہو جائیں گے اور صرف رب تعالیٰ کی ذات تنہا باقی رہے گی۔ جس طرح مورث کی موت کے بعد وارث باقی رہتا ہے۔ مَن کا کلمہ عقلاء کو غلبہ دیتے ہوئے استعمال فرمایا۔ یا یہ معنی کہ اللہ تعالیٰ زمین پر اور زمین والوں پر سلطنت کرنے والوں کو ہلاک کر کے ہر شخص کی مالکیت کو ختم کر دے گا اور بادشاہی صرف اللہ وحدہ کے لئے ہوگی۔

[2] قیامت کے دن اٹھنے کے بعد انہوں نے ہماری طرف لوٹنا ہے اور ہم انہیں ان کے اعمال کے مطابق جزاء وسزا دیں گے۔ یہ جملہ محلاً مرفوع ہے کیونکہ یہ نرث پر معطوف ہو کر انا کی خبر ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٤١﴾

''اور ذکر کیجئے آپ کتاب میں [1] ابراہیم علیہ السلام کا وہ بڑا راست باز نبی تھا۔ [2]''

[1] صدیقاً کا معنی بعض علماء نے کثیر الصدق کیا ہے، یعنی بہت زیادہ سچ بولنے والا۔ بعض نے فرمایا جس نے کبھی جھوٹ نہ بولا ہو۔ بعض فرماتے ہیں صدیقاً سے مراد وہ شخص ہے جو صدق کا عادی ہونے کی وجہ سے کبھی جھوٹ نہ بولتا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو قول اور اعتقاد میں سچا اور اپنے فعل سے اس نے اپنے صدق کو ثابت کیا ہو۔ بعض فرماتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی غیب چیزوں میں تصدیق کرنے والا ہو جیسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت' اس کی صفات' اس کے انبیاء اور رسل' قیام قیامت وغیرہ اور جو ان امور کو بحسن وخوبی سرانجام دیتا ہو جن کا اس کو حکم دیا گیا ہے اور ان چیزوں کو قبیح جانتا ہو جن سے منع کیا گیا ہے اور اپنی تصدیق کو اپنے فعل سے ثابت بھی کرنیوالا ہو۔ پس وہ اوامر کو بجالانے اور مناہی سے اجتناب کرنے پر کمربستہ ہو۔ میں کہتا ہوں کثرت تصدیق سے متعلقات کے اعتبار سے کثرت تصدیق مراد نہیں جیسے بغوی کی ظاہر عبارت دلالت کرتی ہے کیونکہ جو کچھ نبی کریم ﷺ لے کر آئے ہیں اس کی تصدیق تو ہر مومن کے دل میں پائی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جو کسی ایک چیز کی بھی تصدیق نہیں کرتا وہ کافر ہے اور تمام امور شرعیہ پر عمل کرنا اور منہیات سے اجتناب کرنا صالحین اور نیکوکاروں کا حصہ ہے اور ہر نیک صالح شخص بھی صدیق نہیں ہوتا بلکہ کثرت تصدیق سے مراد تصدیق کی قوت اور شدت ہے۔ یہ چیز نبی کے ذریعے اصالۃً یا وراثۃً ملتی ہے، یعنی انبیاء کرام کی ظاہراً اور باطناً مکمل اتباع کرنے اور کمالات نبوت اس استغراق اور ان خالص تجلیات ذاتیہ کی وجہ سے میسر آتی ہے جو بلاحجاب اس امتی پر اتباع و پیروی کی وجہ سے اس پر منعکس ہوتی ہیں۔ (واللہ اعلم)

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے چار اقسام کا ذکر فرمایا جن پر اس کا انعام ہے' اور وہ انبیاء کرام' صدیقین' شہداء اور صالحین ہیں اور دوسرے مومنین کو ان لوگوں کی معیت کی بشارت دی ہے۔ پس صدیقین' شہداء اور صالحین کے درجہ سے بلند ہیں۔ ہم نے سورۃ نساء کی آیت کریمہ فَأُولَٰئِكَ مَعَ الَّذِينَ أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِم مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاءِ وَالصَّالِحِينَ کے تحت تفصیل سے یہ مسئلہ ذکر کیا ہے۔ صدیقین

وہ ہیں جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۙ وَ قَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ۔ اس کی تفسیر سورۂ واقعہ میں ذکر کی ہے۔ انبیاء کرام کے بعد سب سے بڑے صدیق رسول اللہ ﷺ کے صحابہ ہیں۔ خصوصاً جوان میں سے جلیل القدر اور رفیع منصب ہیں۔ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا میں صدیق اکبر ہوں جو میرے بعد صدیق اکبر ہونے کا دعویٰ کرے گا وہ جھوٹا ہوگا، میرے بعد سے مراد بعد رتبی ہے بعد زمانی نہیں ہے۔ سب صحابہ سے بڑے صدیق ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں صدیق فرمایا اور اسی پر علماء امت کا اجماع ہے۔

۲۔ نبی' نبوۃ سے مشتق ہے جس کا معنی زمین کی بلند جگہ ہے۔ نبی رتبہ میں بلند ہوتا ہے کیونکہ اللہ نے اسے مخلوق کی راہنمائی کیلئے بھیجا ہوتا ہے' یا یہ النباء سے مشتق ہے جس کا معنی خبر ہے' یعنی اللہ کی طرف سے خبر دینے والا یا اللہ کی طرف سے خبر دیا گیا۔ (مھموز اور ناقص اصل میں اختلاف کی بناء پر دونوں معانی ہو سکتے ہیں)

اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا یَسْمَعُ وَ لَا یُبْصِرُ وَ لَا یُغْنِیْ عَنْكَ شَیْــٴًـا ﴿۴۲﴾

''جب انہوں نے کہا اپنے باپ سے کہ ۱؎ اے میرے باپ تو کیوں عبادت کرتا ہے اس کی جو نہ کچھ سنتا ہے اور نہ کچھ دیکھتا ہے اور نہ تجھے کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے۔ ۲؎''

۱؎ ابیہ سے مراد آذر ہے۔ سورۂ انعام میں اسکی تحقیق گزر چکی ہے۔ مہربانی اور شفقت طلب کرنے کیلئے یابت فرمایا ہے اے میرے باپ (حالانکہ وہ چچا تھا باپ نہیں تھا۔ یسمع اور یبصر دونوں کے مفعول بالکل معدوم ومنسی ہیں، یعنی ان کے پاس سننے کے لئے نہ کان ہیں نہ دیکھنے کیلئے آنکھیں ہیں (یہ تو تراشے ہوئے پتھر کے بت ہیں) یہ معنی بھی ہو سکتا ہے نہ یہ کچھ سنتے ہیں اور نہ دیکھتے ہیں تو پھر یہ مورتیاں کیسے تمہارے حال سے باخبر ہیں' کیسے تمہارے ذکر کو سنتے ہیں اور تمہاری اس عجز و نیاز کو کیسے دیکھتے ہیں۔

۲؎ تمہیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ تمہاری مصیبت کو دور کر سکتے ہیں۔ شیئاً مصدریت کی بناء پر منصوب ہے یا یہ معنی کہ تکلیف میں سے کچھ دور نہیں کر سکتے اس صورت میں مفعولیت کی بناء پر منصوب ہوگا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے باپ کے سامنے اس کی گمراہی کا تذکرہ کر رہے ہیں لیکن بڑے ادب و احترام سے۔ وہ انہیں ہدایت کی طرف بلا رہے ہیں اور ادب و احترام کا دامن تھامے ہوئے ان کی گمراہی پر ایک بڑی واضح اور کھلی دلیل پیش کر رہے ہیں۔ اسکی گمراہی کا کھلے اور صریح الفاظ میں تذکرہ نہیں کرتے بلکہ صرف پوچھتے ہیں کہ جناب کونسی ایسی چیز ہے جو تمہیں ان بتوں کی عبادت پر مجبور کرتی ہے' یہ تراشے ہوئے ڈھانچے تو اس قابل بھی نہیں کہ کوئی دانشور اور عقلمند ان کے سامنے اپنی مقدس پیشانی رگڑے۔ عقلمند تو ہمیشہ کسی عام فعل کو بھی کسی صحیح غرض کے لئے ادا کرتا ہے۔ جبکہ عبادت جسکا مفہوم حد درجہ کی تعظیم ہے اس کا مستحق صرف اور صرف وہ ذات ہو سکتی ہے جو ہر چیز سے مستغنی اور بے نیاز ہو، جو نیکی پر انعام اور جرم پر سزا دینے پر قادر ہو' کسی کو نفع پہنچانے یا کسی کی تکلیف دور کرنے پر قدرت تامہ رکھتی ہو تا کہ اس سے اپنا دفاع طلب کیا جا سکے۔ عبادت کے لائق وہ ذات ہو سکتی ہے جو پیدا کرنے' رزق دینے' زندہ کرنے' مارنے' سزا دینے اور ثواب دینے جیسی صفات سے متصف ہو لیکن جو اپنے وجود میں دوسروں کا محتاج ہو' دوسری مخلوق کی طرح ممکن ہو اگر چہ سننے اور دیکھنے' انعام دینے' تکلیف پہنچانے پر قادر بھی ہو بلکہ تمام مخلوق سے افضل بھی ہوں جیسا کہ انبیاء کرام اور ملائکہ ہیں، عقل سلیم تو انکی عبادت کو بھی عار سمجھتی ہے اور غیر کی عبادت کرنا تو ایسے ہے جیسے جو پہلے ہی دست طلب خود پھیلائے ہوئے ہو، اس سے کوئی دوسرا سوال کرے جو خود فقیر اور محتاج ہے اس

9
ZC

سے وہ اپنی حاجت طلب کرتا ہے۔ جب ذی روح اور اشرف الخلوق کی عبادت کی یہ کیفیت ہے تو پھر پتھر کی تراشی ہوئی مورتیاں جو نہ سنتی ہیں، نہ دیکھتی ہیں، نہ کوئی نفع دے سکتی ہیں انکی عبادت کرنا اور ان کے سامنے جبین نیاز جھکانا کتنا قبیح اور کتنا بڑا جرم ہوگا۔ اور ان کی عبادت کیسے زیبا اور مناسب ہوگی۔

يَاَبَتِ اِنِّيْ قَدْ جَآءَنِيْ مِنَ الْعِلْمِ مَالَمْ يَأْتِكَ فَاتَّبِعْنِيْٓ اَهْدِكَ صِرَاطًا سَوِيًّا ﴿۴۳﴾

”اے میرے باپ بیشک آیا ہے میرے پاس وہ علم جو تیرے پاس نہیں آیا اس لئے تو میری پیروی کر میں دکھاؤں گا تجھے سیدھا راستہ۔ لے“

لے حضرت ابراہیم نے کہا اے میرے باپ اللہ نے جو مجھے اپنی ذات کا عرفان اور اپنے احکام کا علم یقینی عطا فرمایا ہے اس سے تمہارا دامن یکسر خالی ہے، تم میرے دین کی اتباع کرو، میں تمہاری بالکل سیدھے راستہ کی طرف راہنمائی کروں گا جو دنیا و آخرت کی کامیابی تک تمہیں پہنچا دے گا۔ حضرت ابراہیم کے خلق عظیم اور طبع کریم کا کمال ہے کہ باپ کو صراحۃً جاہل اور بے علم نہیں کہا اور نہ اپنے علم کی شیخی دکھائی بلکہ اپنے آپ کو ایک رفیق سفر کی طرح پیش کیا جو راستہ کے پیچ وخم سے زیادہ واقف ہے۔ پھر آپ نے یہ ذکر کرنے کے بعد کہ جس عقیدہ پر تم مطمئن بیٹھے ہو اس میں ذرا برابر نفع نہیں۔ فرمایا دنیا و آخرت کی تباہی اور نقصان کا راستہ تم نے اختیار کر رکھا ہے۔ کیونکہ اس میں حقیقۃً شیطان کی عبادت ہے کیونکہ وہی اس بہت بڑے جرم (بتوں کی عبادت) کا حکم دینے والا تھا۔

يَاَبَتِ لَا تَعْبُدِ الشَّيْطٰنَ ۭ اِنَّ الشَّيْطٰنَ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ عَصِيًّا ﴿۴۴﴾

”اے باپ شیطان کی پوجا نہ کیا کر بیشک شیطان تو رحمٰن کا نافرمان ہے۔ لے“

لے فرمایا شیطان کے مزین کردہ افعال کفر و معاصی، بتوں کی پوجا کو مت اپناؤ کیونکہ وہ تو خود رب کریم کا نافرمان ہے۔ اس لیے وہ دوسروں کو بھی نافرمانی کا حکم دیتا ہے حالانکہ رب کریم کی وہ ذات ہے جو نعمتوں کے بیشمار دسترخوان بچھائے ہوئے ہے (جس سے اپنے بیگانے سب لطف اندوز ہو رہے ہیں) اس آیت کریمہ سے معلوم ہوا کہ مجرم و نافرمان کی پیروی کرنے والا بھی مجرم و گنہگار ہوتا ہے اور ہر مجرم و گنہگار اسی لائق ہے کہ اس سے نعمتوں کے خزانے واپس لے لئے جائیں اور نافرمانی کے جرم پر اس سے انتقام لیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ابراہیم علیہ السلام نے تبلیغ دین اور شیطان کی مکاریوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے بعد برے انجام اور سزا و انتقام سے ڈرایا۔

يَاَبَتِ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يَّمَسَّكَ عَذَابٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ فَتَكُوْنَ لِلشَّيْطٰنِ وَلِيًّا ﴿۴۵﴾

”اے باپ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں تجھے پہنچے عذاب (خدائے) رحمٰن کی طرف سے تو تو بن جائے شیطان کا ساتھی۔ لے“

لے انی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقی قراء نے پہنچے کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ فرمایا اے باپ اگر آپ کفر اور شیطان کی اطاعت کی روش پر چلتے رہے تو مجھے تمہارے عذاب میں کچلے جانے کا اندیشہ ہے، عذاب کے ذکر میں رحمٰن کی صفت کا تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ نافرمانی ایسا قبیح جرم ہے کہ اس ذات سے عذاب ملنے کا باعث بنتا ہے جو سراپا رحمت ہے، کیونکہ اطاعت شعاروں پر کمال رحمت، مجرموں اور سرکشوں پر کمال غضب کے منافی نہیں ہے۔ تم دنیا میں شیطان کے دوست بن جاؤ گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا میں لعنت کے مستحق ٹھہرو گے اور آخرت میں دردناک عذاب میں تم اس کے ساتھ رہو گے۔ وہ تمہارے ساتھ رہے گا اور دونوں اسی لعنت و عذاب میں گرفتار ہو گے۔

امام بیضاوی فرماتے ہیں (شیطان کی عبادت سے دووجوہ سے روکا جاتا ہے۔ایک اس کا آدم کوسجدہ نہ کرکے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنااور دوسرا انسان سے دشمنی کرنا) لیکن یہاں اس کی جنایات میں سے صرف اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کا ذکر کیا گیا ہے،اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ علیہ السلام نے آدم سے اسکی دشمنی کی طرف توجہ نہ فرمائی بلکہ اسے عارف باللہ ہونے کے باوجود رب کی نافرمانی کرنے کوذکر فرمایا کیونکہ یہ چیز بہت بری ہے یا دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کرنا تمام برائیوں کی اصل ہے دوسری تمام برائیاں اور جرائم اس پر متفرع ہوتے ہیں یا تیسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی آدم اور اس کی اولاد کی دشمنی کا نتیجہ تھی(1)۔

قَالَ اَرَاغِبٌ اَنْتَ عَنْ اٰلِهَتِيْ يٰۤاِبْرٰهِيْمُ ۚ لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ لَاَرْجُمَنَّكَ وَاهْجُرْنِيْ مَلِيًّا ﴿۴۶﴾

"باپ نے کہا کیا روگردانی کرنے والا ہے تو میرے خداؤں سے اے ابراہیم؟ ۱ اگر تم باز نہ آئے تو میں تمہیں سنگسار کردوں گا اور دور ہو جاؤ میرے سامنے سے کچھ عرصہ ۲"

۱ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے محبت بھرے اور خلوص آمیز انداز تکلم کے مقابلہ میں درشتی اور سختی سے کلام کیا گیا ہے۔اے بیٹے نہیں کہا بلکہ نام لے کر بات کی، نام بھی ابتداء کلام میں نہیں بلکہ آخر میں ذکر کیا اور خبر کو مبتدا پر مقدم کیا ہے پھر کلام کو ہمزہ استفہامیہ سے شروع کیا تاکہ رغبت نفس کے انکار پر تعجب کا اظہار ہو جائے۔گویا وہ یہ کہنا چاہتا ہے کہ بتوں کی عبادت سے انکار کوئی عقلمند تو کرتا نہیں۔اس کے بعد دلیل سے بات کرنے کے بجائے دھمکی دینی شروع کردی کہ اگر تم ہمارے بتوں کے متعلق بات کرنے سے باز نہ آئے یا ان کی عبادت سے انحراف سے باز نہ آئے تو میں تجھ پر پتھروں کی بارش کردوں گا۔کلبی، مقاتل اور ضحاک سے لارجمنک کا معنی یہ کیا ہے کہ میں تجھے گالیاں دوں گا اور تجھے برا بھلا کہہ کر اپنے آپ سے دور کردوں گا۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی فرمایا کہ میں تجھے ماروں گا۔حسن نے لا قتلنک بالحجارۃ معنی ذکر کیا ہے۔یعنی میں تجھے پتھروں سے قتل کردوں گا(2)۔

۲ یہ لارجمنک کے مفہوم پر معطوف ہے۔کلبی نے ملیاً کا معنی طویلاً (لمبا زمانہ) مجاہد اور عکرمہ نے حینا (کچھ وقت) سعید بن جبیر نے دھراً (زمانہ) لکھا ہے الملی کا اصل معنی ٹھہرنا ہے۔عرب کہتے ہیں تملیت حیناً۔میں کچھ وقت ٹھہرا رہا۔دن اور رات کو الملوان کہتے ہیں۔قتادہ اور عطاء نے ملیاً کا معنی سالماً کیا ہے۔ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ معنی بھی فرمایا ہے کہ تو مجھ سے سلامتی کے ساتھ دور ہو جا ورنہ میری طرف سے تجھے ایسی تکلیف پہنچے گی جو تیری برداشت سے وراء ہوگی۔عرب کہتے ہیں ملی بامر کذا جب کوئی کسی امر پر قادر ہو(3)۔ ۹

قَالَ سَلٰمٌ عَلَيْكَ ۚ سَاَسْتَغْفِرُ لَكَ رَبِّيْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ بِيْ حَفِيًّا ﴿۴۷﴾

"ابراہیم نے (جواب میں) کہا سلام ہو ۱ تم پر میں مغفرت طلب کروں گا۔تیرے لئے اپنے رب سے ۲ بیشک وہ مجھ پر بیحد مہربان ہے۔۳"

۱ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے الوداعی اور متارکت کا سلام کہا اور بداخلاقی کا مقابلہ حسن اخلاق سے کرتے ہوئے فرماتے ہیں اچھا تم سلامت رہو۔ہمیشہ حلیم الطبع اور بلند اخلاق لوگوں کا نادانوں سے یہی طریقہ ہوتا ہے کہ وہ ترش کلام اور بداخلاقی کے آگے بپھرتے نہیں بلکہ حوصلہ اور بردباری کا اظہار کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا۔اللہ کے مقرب بندوں سے

1۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 555 (العلمیۃ)
2۔تفسیر بغوی، جلد 4 صفحہ 201 (التجاریۃ)
3۔ایضا

جب جاہل مخاطب ہوتے ہیں تو وہ کہتے ہیں سلام ہو۔یعنی میری طرف سے تمہیں سلامتی ہے میں تجھے کوئی تکلیف نہیں پہنچاؤں گا۔

۲؎ ربی کی یاء کونافع اورعمرو نے ماء کےفتحہ کے ساتھ پڑھا ہےاور باقی قراء نے یاء کےسکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اکثر مفسرین یہ فرماتے ہیں کہ اس کامعنی یہ ہے کہ میں اللہ تعالیٰ سے تیرے لئے عرض کروں گا کہ وہ تجھے توحیداور اسلام کی نعمت سے سرفراز فرمائے اور کفر وشرک سے توبہ کی توفیق مرحمت فرمائے کیونکہ کافر کیلئے مغفرت کا سوال کرنا جائز ہی نہیں ہے صرف اسکے لئے اس چیز کی توفیق طلب کی جاسکتی ہے جومغفرت کا موجب ہو۔ میرے نزدیک مفسرین کی یہ توجیہہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد قَدْ كَانَتْ لَكُمْ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيٓ إِبْرٰهِيمَ وَالَّذِينَ مَعَهُۥ الی قوله إِلَّا قَوْلَ إِبْرٰهِيمَ لِأَبِيهِ لَأَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم نے مشرک کے لئے جو استغفار کیا تھا اس میں حضرت ابراہیم کی اقتداء جائز نہیں ہے حالانکہ مشرک کے لئے توفیق کی دعا جائز ہے (اگر حضرت ابراہیم علیہ السلام کےقول ساستغفر لک ربی کا یہ مفہوم ہوتا جومفسرین نے بیان فرمایا ہے تو صراحۃً قرآن میں منع نہ کیا جاتا۔) مناسب یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ آپ کا یہ کہنا مشرک کے لئے استغفار کی نہی سے پہلے کا ہے رسول اللہ ﷺ نے اپنے چچا حضرت ابوطالب کوکہا تھا قسم بخدا میں آپ کے لئے استغفار کرتا رہوں گا جب تک کہ مجھے منع نہیں کیا جاتا۔ اس پر یہ آیت کریمہ نازل ہوئی مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ ءَامَنُوٓا۟ أَن يَسْتَغْفِرُوا۟ لِلْمُشْرِكِينَ الایة(1)۔اس کی تفسیر سورۂ توبہ میں گزر چکی ہے۔دوسری بات یہ ہے کہ اگر ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کے لئے اللہ تعالیٰ سے ان کے ایمان کی درخواست کی ہوتی تو اللہ تعالیٰ ضرور انہیں ایمان کی روشنی عطاء فرمادیتا کیونکہ ہر نبی کی دعا قبول ہوتی ہے لیکن آذر کا ایمان مقدر ہی نہ تھا اس لئے ابراہیم علیہ السلام نے انکے کے لئے دعا ہی نہیں کی تھی۔

۳؎ میرا رب کریم مجھ پر بڑا مہربان اور بڑی نوازشات فرمانے والا ہے۔انتہائی لطف اور بندہ نوازی فرمانے والا ہے۔ کلبی نے یہ معنی لکھا ہے کہ وہ جانتا ہے جب بھی میں دعا کیلئے دست طلب پھیلاتا ہوں میری آرزوؤں اور دعاؤں کوشرف قبولیت بخشتا ہے۔مجاہد فرماتے ہیں وہ ہمیشہ میری دعاؤں کوقبول فرماتا ہے(2)۔

وَأَعْتَزِلُكُمْ وَمَا تَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ وَأَدْعُوا۟ رَبِّى عَسَىٰٓ أَلَّآ أَكُونَ بِدُعَآءِ رَبِّى شَقِيًّا ﴿٤٨﴾

"اور میں الگ ہو جاؤں گا تم سے اور (ان سے بھی) جن کی تم عبادت کرتے ہو اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اور میں اپنے رب کی عبادت کروں گا۔ مجھے امید ہے کہ میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے نامراد نہیں رہوں گا۔ ۱؎"

۱؎ اعتزلکم کا عطف سا ستغفر پر ہےاور وما تدعون کا عطف اعتزلکم کی ضمیر منصوب (کم) پر ہے مقاتل فرماتے ہیں حضرت ابراہیم نے جب دیکھا (کہ پندونصائح کا ان پرکوئی اثرنہیں ہورہا) تو آپ کوثی میں ان سے جدا ہوکر ارض مقدس کی طرف ہجرت کر گئے تھے(3) اور قوم سے فرمایا میں اپنے رب کی عبادت کی برکت سے کبھی نامراد وخائب نہیں ہوں گا۔جس طرح تم بتوں کی عبادت کر کے بدبختی اور نامرادی کو اپنی قسمت بنارہے ہو۔آپ نے عسیٰ کا کلمہ ذکر فرمایا جو امید اور توقع پر دلالت کرتا ہے۔اسکی وجہ آپ کی کسرنفسی اور تواضع ہے۔اور یہ تنبیہ کرنا تھا کہ دعاؤں کوشرف قبولیت عطا کرنا' نیک اعمال پر ثواب دینا یہ میرے رب کریم کا فضل اور احسان ہے اس پر واجب نہیں ہے۔دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان کی عبادات وریاضات کی قبولیت اور عدم قبولیت کا دارومدار خاتمہ پر ہےاور وہ ایسی چیز ہے جو پوشیدہ ہے۔

1۔صحیح بخاری، جلد2،صفحہ675 (وزارت تعلیم) 2۔تفسیر بغوی، جلد4،صفحہ201 (التجاریۃ) 3۔ایضاً صفحہ202-201

فَلَمَّا اعْتَزَلَهُمْ وَمَا يَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۙ وَهَبْنَا لَهٗۤ اِسْحٰقَ وَ يَعْقُوْبَ ؕ وَ كُلًّا جَعَلْنَا نَبِيًّا ﴿۴۹﴾

''پس جب وہ جدا ہو گیا ان سے اور جن کی وہ عبادت کیا کرتے تھے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر تو عطا فرمایا ہم نے ابراہیم کو اسحق اور یعقوب اور سب کو ہم نے نبی بنایا ا۔''

ا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام وطن اور خاندان چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کر گئے تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں ہم نے انہیں شرک و کفر سے آلودہ قوم کے عوض اسحق و یعقوب جیسی برگزیدہ اولاد عطا فرمائی۔ لما ظرف ہے وھبنا کے متعلق ہے۔ وھبنا کا جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اسطرح ہوگی قال سلام علیک الی آخرہ۔ فاعتزلهم فوهبنا له اسحق و يعقوب۔

وَوَهَبْنَا لَهُمْ مِّنْ رَّحْمَتِنَا وَجَعَلْنَا لَهُمْ لِسَانَ صِدْقٍ عَلِيًّا ﴿۵۰﴾

''اور ہم نے عطا فرمائیں انہیں اپنی رحمت سے (طرح طرح کی نعمتیں) ا۔ اور ہم نے ان کے لئے سچی اور دائمی تعریف کی آواز بلند کر دی۔ ۲۔''

ا۔ من رحمتنا سے پہلے من بعضیہ ہے۔ کلبی کہتے ہیں رحمت سے مراد مال، اولاد ہے۔ بعض فرماتے ہیں کتاب اور نبوت ہے (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں حضرت اسحق اور حضرت یعقوب کا خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا کیونکہ یہ دونوں انبیاء کی اصل ہیں۔ یا اسماعیل علیہ السلام کا علیحدہ ان کے فضائل و کمالات کے ساتھ ذکر کرنا تھا۔ اس لئے یہاں ان کا ذکر نہیں کیا گیا (2)۔

۲۔ لسان سے مراد وہ الفاظ اور کلام ہے جو زبان سے نکلتے ہیں۔ اس لیے کہا جاتا ہے لسان العرب۔ یعنی عربوں کی لغت۔ لسان صدق سے مراد تعریفی کلمات ہیں۔ تمام قومیں (اختلاف مذاہب) کے باوجود حضرت ابراہیم اور آپ کی اولاد کی تعریف میں رطب اللسان ہیں اور ان کی دعا کی قبولیت پر فخر کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دعا مانگی تھی وَاجْعَلْ لِّيْ لِسَانَ صِدْقٍ فِي الْاٰخِرِيْنَ۔ اللہ تعالیٰ نے اس دعا کو شرف قبولیت عطا فرمایا۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر قوم آپ کی تعریف و ثناء کرتی ہے۔ لسان کی صدق کی طرف اضافت اور پھر علو کے ساتھ اس کی صفت لگانا یہ دلیل ہے کہ وہ لوگ ان تعریفی کلمات کے مستحق ہیں۔ جو کچھ لوگ ان کی تعریف و توصیف کرتے ہیں وہ ان کے واقعی حقدار ہیں اور ان کے محامد مرور زمانہ اور قوموں کی تبدیلی کے باوجود کسی شخص پر مخفی نہیں ہیں۔ لهم ظرف مستقر ہے اور جعلنا کا مفعول ثانی ہے اور علیا ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ مُوْسٰٓى ۫ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا وَّكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿۵۱﴾

''اور ذکر فرمائیے کتاب میں موسیٰ کا بیشک وہ (اللہ کے چنے ہوئے) تھے ا۔ اور رسول و نبی تھے ۲۔''

ا۔ کوفیوں نے مخلصا کو لام کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے انہیں چن لیا ہے اور غیر کی طرف توجہ کی آلائش سے بھی انہیں پاک فرمایا ہے۔ جبکہ باقی قراء نے لام کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے حضور اپنا سر خم کر دیا تھا اور اپنے نفس کی ہر ہر حرکت ہر ہر سانس اپنے رب کے لئے کر دیا تھا اور اپنے رب کریم کی عبادت کو شرک جلی اور شرک خفی سے بالکل پاک کیا تھا۔

۲۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں مخلوق کی ہدایت کے لئے مبعوث فرمایا تو آپ بلند مقام پر فائز بھی ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ کے احکام کی خبر دیتے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 556 (العلمیہ)

والے بھی تھے۔ چونکہ انباء (نبی بنانا) وجود میں ارسال (رسول بنانا) پر متفرع ہوتا ہے اسلئے رسول کو مقدم فرمایا حالانکہ رسالت نبوت سے اخص اور اعلیٰ ہے (کیونکہ ہر رسول نبی ہوتا ہے لیکن ہر نبی رسول نہیں ہوتا اور رسول وہ ہوتا ہے جس پر وحی اور کتاب کا نزول ہوتا ہے)

وَنَادَيْنٰهُ مِنْ جَانِبِ الطُّوْرِ الْاَيْمَنِ وَقَرَّبْنٰهُ نَجِيًّا ﴿٥٢﴾

''اور ہم نے انہیں پکارا طور کی دائیں جانب سے ۱؎ اور ہم نے انہیں قریب کیا راز کی باتیں کرنے کے لئے ۲؎''

۱؎ طور مصر اور مدین کے درمیان ایک پہاڑ ہے اس کو الزبیر بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ندا اس وقت کی گئی جب موسیٰ علیہ السلام مدین سے آرہے تھے راستہ میں آپ نے آگ دیکھی تو ندا دی گئی اے موسیٰ اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ میں اللہ رب العالمین ہوں۔ الایمن سے مراد موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب ہے کیونکہ پہاڑ کا کوئی دایاں (بایاں) نہیں ہوتا۔ اسکی طور کی طرف اضافت قریبی نسبت کی وجہ سے کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر جارہے تھے جب طور کے قریب پہنچے تو طور موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا اور مراد بابرکت جانب ہے کیونکہ یہ جہت بطور برکت استعمال ہوتی ہے۔

۲؎ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے ایسا قرب عطا فرمایا جو الفاظ اور تحریر کے احاطہ میں نہیں آسکتا۔ جسکو وہ نصیب نہیں ہوا وہ اسکی لذت کو کسی اور طریقہ سے محسوس نہیں کرسکتا۔ نجیاً۔ قربناہ کی ضمیر فاعل اور مفعول دونوں سے حال ہے۔

وَوَهَبْنَا لَهٗ مِنْ رَّحْمَتِنَآ اَخَاهُ هٰرُوْنَ نَبِيًّا ﴿٥٣﴾

''اور ہم نے بخشا انہیں اپنی خاص رحمت سے ان کا بھائی ہارون جو نبی تھا۔ ۱؎''

۱؎ لہ کی ضمیر کا مرجع موسیٰ علیہ السلام ہے۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے عرض کی وَاجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿٢٩﴾ هٰرُوْنَ اَخِي (اور مقرر فرما میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے) تو ہم نے اپنی رحمت سے ان کے بھائی ہارون کو نبوت عطا فرما کر ان کا معاون بنایا۔ یہ مطلب نہیں کہ ان کی دعا کی وجہ سے ہم نے ہارون پیدا فرمایا کیونکہ حضرت ہارون عمر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بڑے تھے۔ من رحمتنا سے پہلے مِنْ اجلیہ ہے۔ یا مِن بعضیہ ہے اخاہ وھبنا کا مفعول ہوگا اگر مِن سببیت کے لئے ہو اور اگر من بعضیت کے لئے ہو تو پھر بدل ہوگا۔ ھارون اخاہ سے عطف بیان ہے۔ اور نبیا وھبنا کے مفعول سے حال ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ﴿٥٤﴾

''اور ذکر کیجئے کتاب میں اسمٰعیل کو بیشک وہ وعدہ کے سچے تھے ۱؎ اور رسول (اور) نبی تھے ۲؎''

۱؎ اسماعیل سے مراد اسماعیل بن ابراہیم ہیں جو نبی کریم محمد ﷺ کے جد امجد تھے۔ آپ کی صفت وعدہ کی سچائی کے ساتھ بیان فرمائی ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں آپ نے جو بھی وعدہ فرمایا اسے وفا کیا۔ مقاتل فرماتے ہیں آپ نے ایک شخص سے وعدہ فرمایا تھا کہ وہ اس کی واپسی تک یہاں ٹھہرے رہیں گے۔ وہ شخص تین دن کے بعد واپس لوٹا تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اسی جگہ ٹھہرے ہوئے تھے۔ کلبی فرماتے ہیں آپ اس شخص کا ایک سال تک انتظار کرتے رہے (1)۔ آپ کے وعدہ سچائی کے لئے وہ صبر کا وعدہ کافی ہے جو کہ آپ نے اپنے باپ کے ساتھ ذبح پر صبر کرنے کا کیا تھا تو آپ نے اسے دل وجان سے وفا کیا۔

۲؎ حضرت اسماعیل علیہ السلام جرہم قبیلہ کی طرف رسول اور نبی بنا کر بھیجے گئے تھے۔ امام بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں یہ آیت

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریۃ)

کریمہ دلیل ہے کہ رسول کے لئے صاحب شریعت ہونا ضروری نہیں ہے کیونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد سے تمام انبیاء کرام آپ کی شریعت کے پیرو تھے(1)۔

وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۖ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهِ مَرْضِيًّا ﴿٥٥﴾

''اور وہ حکم دیا کرتے تھے اپنے گھر والوں کو نماز پڑھنے اور زکوٰۃ ادا کرنے کا۱ اور اپنے رب کے نزدیک بڑے پسندیدہ تھے ۲''

۱ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ایک صفت یہ بھی تھی کہ آپ اپنے اہل وعیال کو اہمیت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا حکم دیتے تھے۔ آپ احکام الٰہیہ کی تبلیغ کا آغاز اپنے نفس اور اپنے قریبی رشتہ داروں سے فرماتے تھے کیونکہ ان کی تکمیل دوسری امت کی بنسبت آپ کے نزدیک زیادہ اہمیت کی حامل تھی۔ (ہونا بھی ایسا ہی چاہیے کہ پہلے انسان اپنے اوپر احکام شریعت کا نفاذ کرے پھر اپنے اہل وعیال پر ان کو جاری فرمائے' تاکہ یہ سب لوگ دوسروں کے لئے نمونہ اور اسوہ بن جائیں)

حضور نبی کریم ﷺ کو بھی اللہ تعالیٰ نے تبلیغ دین کا سلسلہ اپنے خاندان سے شروع فرمانے کا حکم دیا تھا ارشاد فرمایا وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ۔ اے محبوب پہلے اپنے رشتہ داروں کو عذاب الٰہی سے ڈرایئے۔ دوسری جگہ فرمایا قُوا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا۔ اے مسلمانو! اپنے آپ کو اور اپنے اہل خانہ کو آتش جہنم سے بچاؤ۔ بعض علماء فرماتے ہیں اہل سے مراد آپ کی امت ہے کیونکہ انبیاء کرام اپنی امتوں کے باپ ہوتے ہیں۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ سے مراد مکمل شریعت ہے جو اللہ نے ان پر فرض کی تھی اور ان کی شریعت بھی وہی تھی جو اللہ نے ہم پر فرض کی ہے(2) اور ان دو عبادتوں کا مخصوص ذکر اس لئے فرمایا کیونکہ نماز بدنی عبادات میں سے افضل ترین عبادت ہے اور زکوٰۃ مالی عبادات میں سے افضل ترین عبادت ہے۔

۲ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت ورسالت پسند تھی اور اللہ تعالیٰ آپ کی اعمال وافعال میں استقامت اور طاعت الٰہی پر دوام کی وجہ سے راضی تھا۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ إِدْرِيسَ ۚ إِنَّهُ كَانَ صِدِّيقًا نَّبِيًّا ﴿٥٦﴾ وَّرَفَعْنٰهُ مَكَانًا عَلِيًّا ﴿٥٧﴾

''اور ذکر فرمایئے کتاب میں ادریس (علیہ السلام) کا بیشک وہ بڑے راستباز (اور) نبی تھے ۱ اور ہم نے بلند کیا تھا انہیں بڑے اونچے مقام تک ۲''

۱ حضرت ادریس علیہ السلام حضرت شیث علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ نوح علیہ السلام کے پردادا تھے۔ آپ کا نام اخنوخ تھا' بعض علماء نے لکھا ہے کہ آپ کو ادریس اس لئے کہا جاتا تھا کہ آپ اکثر کتاب پڑھتے رہتے تھے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اس کا غیر منصرف ہونا اس کے الدرس سے مشتق ہونے کی تردید کرتا ہے۔ ہاں یہ کوئی بعید نہیں کہ اس کا معنی ان کی لغت میں اس کے قریب قریب ہو اور آپ کے کثرت درس کی وجہ سے اس نام سے آپ کو ملقب کیا گیا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ پر تیس صحیفے نازل فرمائے تھے(3)۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ادریس پہلے شخص ہیں جنہوں نے قلم کے ساتھ لکھا' اور سب سے پہلے آپ نے کپڑوں کی سلائی

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 558 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریۃ)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 559 (العلمیۃ)

فرمائی اور سلا ہوا کپڑا پہنا۔ آپ سے پہلے لوگ جانوروں کی کھالیں لباس کے طور پر استعمال فرماتے تھے۔ اور ہتھیاروں کے پہلے موجد بھی آپ ہیں اور کفار سے لڑائی بھی سب سے پہلے آپ نے کی۔ علم نجوم اور علم حساب کا آغاز بھی آپ نے ہی فرمایا(1)۔

ے بلند مقام سے مراد بعض علماء کے نزدیک' نبوت کے شرف کے ساتھ بلند درجہ عطا فرمانا اور اللہ کی بارگاہ میں قرب ہے۔ بعض فرماتے ہیں اس سے مراد جنت ہے۔ بعض نے فرمایا چھٹا یا چوتھا آسمان ہے۔ انس بن مالک حضرت مالک بن صعصعہ سے روایت فرماتے ہیں کہ حضرت محمد کریم ﷺ سے مروی ہے کہ آپ ﷺ نے معراج کی رات حضرت ادریس علیہ السلام کو چوتھے آسمان پر دیکھا(2)۔ یہ حدیث پاک تفصیل سے سورۂ بنی اسرائیل اور سورۃ النجم میں مذکور ہے۔

حضرت ادریس علیہ السلام کا بلند کیے جانے کا سبب

حضرت کعب وغیرہ کا بیان ہے کہ ایک دن آپ کسی کام کے لئے جارہے تھے کہ آپ کو سخت گرمی محسوس ہوئی۔ آپ نے عرض کی اے میرے رب کریم میں آج دھوپ میں چلا ہوں اور مجھے سخت گرمی محسوس ہوئی ہے' وہ فرشتہ اس کی گرمی کیسے برداشت کرتا ہوگا جو ایک دن میں پانچ سو سال کی مسافت اسے (سورج) اٹھائے رکھتا ہے۔ یا اللہ اس فرشتے سے اس (سورج) کے بوجھ اور گرمی کو ہلکا اور کم فرما دے' جب صبح ہوئی تو فرشتے نے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم پایا۔ فرشتے نے عرض کی یارب یہ کیسے تو نے کمی کا فیصلہ فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا میرے مقرب بندے ادریس علیہ السلام نے تجھ سے سورج کے بوجھ اور تپش کو کم کرنے کی سفارش کی ہے اور میں نے اس کی سفارش قبول فرمالی ہے۔ فرشتے نے عرض کی یارب میرے اور اس بندے کے درمیان دوستی پیدا فرمادے۔ اللہ تعالیٰ نے اس فرشتے کو دوستی کی اجازت مرحمت فرمادی۔ وہ فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس پہنچا' حضرت ادریس علیہ السلام نے اسے فرمایا مجھے معلوم ہوا ہے کہ تو بڑا معزز فرشتہ اور ملک الموت کے پاس تیری بڑی قدر و منزلت ہے۔ آپ میری ان سے سفارش کردیں کہ میری موت میں تھوڑی تاخیر کردے تاکہ میں اللہ تعالیٰ کی عبادت اور نعمتوں پر شکر اور زیادہ کرلوں۔ فرشتے نے کہا قبلہ! اللہ تعالیٰ نے کسی نفس کی موت کے لئے جو وقت مقرر کیا ہے اس میں وہ تاخیر نہیں فرماتا۔ ہاں میں آپ کے کہنے کے مطابق بات کرتا ہوں۔ فرشتہ حضرت ادریس علیہ السلام کو سورج کے طلوع ہونے کی جگہ کے قریب چھوڑ کر خود آسمان کی طرف چڑھ گیا، وہ فرشتہ ملک الموت کے پاس پہنچا اور کہا کہ جناب میرا انسانوں میں ایک دوست ہے۔ اس نے سفارش طلب کی ہے کہ آپ ان کی موت میں تاخیر کردیں۔ ملک الموت نے کہا یہ کام تو میرے بس میں ہی نہیں ہے۔ لیکن میں اتنا کرسکتا ہوں کہ انہیں اپنی موت کا وقت بتا دیتا ہوں تاکہ وہ پہلے سے تیاری کرلیں۔ فرمایا ٹھیک ہے یہ تو کردو۔ حضرت ملک الموت نے اپنا رجسٹر دیکھا اور فرمایا تم نے جس انسان کے متعلق مجھ سے بات کی ہے (وہ مرچکا ہے) اور آئندہ کبھی نہیں مرے گا۔ فرشتہ نے کہا یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ میں ابھی انہیں سورج کی طلوع ہونے کی جگہ کے پاس چھوڑ کر تمہارے پاس آیا ہوں۔ ملک الموت نے کہا تم جاؤ دیکھو وہ وہاں مرچکا ہے' اور ادریس علیہ السلام کی زندگی کا کوئی لمحہ اب باقی نہیں ہے۔ وہ سورج کا فرشتہ لوٹ کر آیا تو ادریس علیہ السلام کو مردہ پایا۔

وہب بن منبہ فرماتے ہیں علماء کا اختلاف ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام آسمان میں زندہ ہیں یا مرچکے ہیں۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ آپ زندہ ہیں اور وہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ چار انبیاء کرام زندہ ہیں حضرت خضر اور الیاس علیہما السلام زمین پر حضرت ادریس

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 202 (التجاریہ) 2۔ ایضاً صفحہ 203

اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام آسمان پر زندہ ہیں۔

وہب فرماتے ہیں حضرت ادریس علیہ السلام کی ہر روز اتنی عبادت بلند ہوتی تھی جتنی کہ تمام دوسرے لوگوں کی پہنچتی تھی۔ فرشتوں کو اس پر بڑا تعجب ہوا اور انہیں ان کی ملاقات کا شوق پیدا ہوا۔ ملک الموت نے اپنے رب سے حضرت ادریس علیہ السلام کی ملاقات کی اجازت طلب کی۔ اجازت ملی تو آپ انسانی شکل میں حضرت ادریس علیہ السلام کے پاس تشریف لائے۔ حضرت ادریس علیہ السلام ہمیشہ روزہ رکھتے تھے۔ جب افطار کا وقت ہوا تو آپ نے ملک الموت کو کھانے کی دعوت دی۔ انہوں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ مسلسل تین راتیں ایسا ہی ہوتا رہا حضرت ادریس کھانے کی دعوت دیتے لیکن ملک الموت جو انسانی شکل میں آئے ہوئے تھے کھانا کھانے سے انکار کر دیتے۔ تیسری رات حضرت ادریس علیہ السلام نے پوچھا جناب آپ ہیں کون؟۔ ملک الموت نے کہا میں ملک الموت ہوں، میں اپنے رب سے اجازت لے کر تمہاری ملاقات اور تجھ سے دوستی کرنے کیلئے آیا ہوں۔ حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا۔ مجھے تجھ سے ایک کام ہے' پوچھا کیا؟ فرمایا تم میری روح قبض کرلو۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو حکم دیا کہ ان کی روح قبض کرلو' اس نے روح قبض کرلی پھر اللہ تعالیٰ نے کچھ دیر کے بعد ان کی روح لوٹا دی۔ ملک الموت نے کہا آپ نے موت کا سوال کیوں کیا۔ فرمایا اس لئے تا کہ موت کی تکلیف اور اسکی گہرائی کا ذائقہ چکھ لوں تا کہ میں اس کے لئے زیادہ تیار ہو جاؤں پھر حضرت ادریس علیہ السلام نے فرمایا مجھے تجھ سے ایک اور کام بھی ہے ملک الموت نے پوچھا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم مجھے آسمان پر لے جاؤ تا کہ میں آسمان' جنت اور دوزخ دیکھ لوں۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کو انہیں آسمانوں پر لے جانے کی اجازت فرما دی۔ جب آپ دوزخ کی آگ کے قریب پہنچے تو فرمایا ملک الموت! مجھے ایک اور حاجت ہے فرمایا وہ کیا ہے؟ فرمایا تم دوزخ کے داروغے مالک سے کہو کہ میرے لئے دوزخ کے دروازے کھول دے تا کہ میں اس میں داخل ہو کر سب کچھ دیکھ لوں' آپ کی یہ خواہش بھی پوری کر دی گئی۔ پھر فرمایا جیسے تم نے مجھے دوزخ دکھائی ہے اب جنت بھی دکھا دو۔ آپ جنت کی طرف تشریف لے گئے۔ اس کے دروازے کھولنے کا مطالبہ کیا تو وہ کھول دیئے گئے اور آپ جنت میں داخل ہو گئے پھر سیر جنت کے بعد ملک الموت نے کہا جناب آپ یہاں سے چلیے اور زمین میں اپنی جگہ تشریف لے جایئے۔ حضرت ادریس علیہ السلام جنت کے ایک درخت سے چمٹ گئے اور فرمایا میں تو یہاں سے کبھی نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرنے کے لئے ایک فرشتہ بھیجا۔ فرشتے نے پوچھا جناب آپ جنت سے باہر کیوں نہیں جاتے۔ آپ نے فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہر نفس موت کا ذائقہ چکھے گا۔ میں اسکا ذائقہ چکھ چکا ہوں اور فرمایا تم میں سے ہر شخص دوزخ میں وارد ہوگا، میں اس منزل سے بھی گزر چکا ہوں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے جنتی جنت سے باہر نہیں نکلیں گے۔ اسلئے اب میں باہر نہیں نکلوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے ملک الموت کی طرف پیغام بھیجا کہ ادریس علیہ السلام میرے حکم سے جنت میں داخل ہوئے تھے اور میرے حکم سے ہی نکلیں گے (تم ان سے مکالمہ بند کرو) اسی وجہ سے حضرت ادریس جنت میں زندہ ہیں اور ورفعناہ مکاناً علیاً کا یہی مطلب ہے۔

أُولَٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ مِنْ ذُرِّيَّةِ اٰدَمَ ۗ وَمِمَّنْ حَمَلْنَا مَعَ نُوْحٍ ۫ وَّمِنْ ذُرِّيَّةِ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْرَآءِيْلَ ۫ وَمِمَّنْ هَدَيْنَا وَاجْتَبَيْنَا ؕ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُ الرَّحْمٰنِ خَرُّوْا سُجَّدًا وَّبُكِيًّا ۩ ﴿٥٨﴾

''یہ وہ (مقدس ہستیاں) ہیں جن پر انعام فرمایا اللہ تعالیٰ نے انبیاء (کرام کے زمرہ) سے یہ آدم علیہ السلام کی اولاد سے تھے۔ اور بعض ان کی اولاد جنکو ہم نے سوار کیا تھا (کشتی میں) نوح کے ساتھ اور بعض ابراہیم اور یعقوب کی اولاد سے تھے اور ان میں سے جنہیں ہم نے ہدایت دی اور چن لیا۔[1] جب پڑھی جاتی ہیں ان کے سامنے رحمٰن کی آیتیں تو وہ گر پڑتے ہیں سجدہ کرتے ہوئے اور (زار وقطار) روتے ہوئے[2]''

[1] اولئک کا مشار الیہ انبیاء کرام ہیں جن کا ذکر حضرت زکریا علیہ السلام سے شروع ہوا اور ادریس علیہ السلام پر ختم ہوا۔ انعام سے مراد دنیوی اور دینی انعامات ہیں۔ من النبیین 'علیھم کی ضمیر سے حال ہے اور اسم موصول کا بیان ہے۔ من ذریۃ ادم سے مراد ادریس علیہ السلام اور بقیہ تمام انبیاء کرام ہیں۔ یہ من النبیین سے بدل ہے یا صفت ہے یا حال ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ من ذریۃ آدم میں من بعضیہ ہو کیونکہ منعم علیہم انبیاء کرام سے اعم ہیں اور ذریۃ سے اخص ہیں اور ذریۃ ابراھیم سے مراد حضرت اسمٰعیل اور اسحٰق علیہم السلام وغیرہما ہیں۔ اسرائیل ابراہیم پر معطوف ہے اسرائیل سے مراد اسرائیل کی اولاد ہے اور ان میں سے موسیٰ ہارون زکریا یحییٰ اور عیسیٰ علیہم السلام ہیں۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ بچیوں کی اولاد بھی ذریت کے تحت داخل ہے۔ مِمَّنْ هَدَيْنَا یا تو یہ پہلے من بیانیہ پر معطوف ہے یا دوسرے من پر معطوف ہے اس تقدیر پر کہ وہ من بعضیہ ہے اگر یہ من پہلے من پر معطوف ہوگا تو یہ حضرت مریم اور اسماعیل (علیہما السلام) کی اولاد کو شامل ہوگا جن کا ذکر کان یامر اھلہ بالصلوۃ میں ہوا ہے۔ ان مقدس ہستیوں کو ہم نے شرف نبوت کے لئے چن لیا۔ انہیں کرامت وہدایت کی عظمت سے نوازا۔

[2] سجداً جمع ہے ساجدین کی۔ بکیا کو حمزہ اور کسائی نے باء کے کسرہ کے ساتھ اور جمہور اور حفص نے باء کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے یہ اتبک کی جمع ہے۔ اذا ظرفیہ خروا کے متعلق ہے اور پھر خسروا کا جملہ اولئک کی خبر ہوگا اگر اسم موصول کو اس کی صفت بنایا جائے۔ اور خرّوا کا جملہ مستقل علیحدہ کلام ہوگا اگر اسم موصول کو اولئک کی خبر بنایا جائے اور اس مستقل کلام کا مقصود ان کی خشیت الٰہی کو بیان کرنا ہے کہ وہ برگزیدہ لوگ کمال نفس شرف نسب اور اتنی بلند اور رفیع شان کے باوجود ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی ذات سے ڈرتے رہتے ہیں۔

ابن ماجہ اسحٰق بن راہویہ اور بزار نے اپنی اپنی مسند میں حضرت ابن ابی وقاص کی حدیث نقل فرمائی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قرآن کی تلاوت کرو تو رونے کی کوشش کرو اور اگر رونا نہ آئے تو رونے والی شکل بناؤ (1)۔

فَخَلَفَ مِنْ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ أَضَاعُوا الصَّلَوٰةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوَٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ﴿٥٩﴾

''پس جانشین بنے ان کے بعد وہ ناخلف جنہوں نے ضائع کیا نمازوں کو[1] اور پیروی کی خواہشات (نفسانی) کی[2] سو وہ دوچار ہوں گے اپنی نافرمانی (کی سزا سے)[3]''

[1] خلف لام کے فتحہ کے ساتھ ہوتو اچھے جانشین اور لام کے سکون کے ساتھ ہوتو برے جانشین مراد ہوتے ہیں، یعنی ان انبیاء کرام کے پیچھے ایسے لوگ آئے جنہوں نے نمازوں کو ترک کر دیا۔ ابن مسعود اور ابراہیم فرماتے ہیں انہوں نے نماز کو اپنے اوقات سے مؤخر کیا تھا۔ سعید بن مسیب فرماتے ہیں نماز کے ضیاع کا مطلب یہ ہے کہ انسان ظہر کی نماز کو عصر کی نماز کے وقت تک مؤخر کر دے اور عصر کی نماز کو غروب شمس تک مؤخر کر دے (2)۔ میں کہتا ہوں نماز کے ضیاع سے مراد غلط اور مکروہ انداز میں نماز ادا کرنا ہے یا نماز کی سنتوں اور

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 319 (وزارت تعلیم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 20 (التجاریہ)

مستحبات کو ترک کرنا ہے۔

۲۔ برے جانشینوں میں دوسری برائی یہ تھی کہ وہ اطاعت الٰہی کو چھوڑ کر نفسانی خواہشات کے درپے ہو گئے تھے اور نافرمانی، گناہ اور بدکاریوں کو انہوں نے اختیار کر لیا تھا۔

۳۔ ایسے بدکاروں کو دوزخ کی وادی غی میں پھینک دیا جائے گا۔ امام بغوی نے وہب کے قول کے مطابق لکھا ہے کہ غی جہنم کی ایک نہر ہے جو انتہائی گہری اور اسکی طبع بہت خبیث ہے۔ لکھتے ہیں ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا یہ جہنم کی ایک وادی ہے اور جہنم کی دوسری وادیاں اس سے پناہ مانگتی ہیں اور یہ زنا پر اصرار کرنے والوں، عادی شرابی، ہمیشہ سود کھانے والوں، والدین کے نافرمانوں اور جھوٹی قسمیں کھانے والوں کے لئے تیار کی گئی ہے(1)۔ ابن مردویہ نے ابن عباس کی حدیث بالکل اسی طرح مرفوع ذکر کی ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں عطاء نے فرمایا غی جہنم کی ایک وادی ہے جس میں پیپ اور خون بہتا ہے۔ فرماتے ہیں حضرت کعب نے فرمایا یہ جہنم کی بہت گہری اور بہت گرم وادی ہے، اس میں ایک کنواں ہے جسے بہیم کہا جاتا ہے۔ جب جہنم بجھنے لگتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کنویں کو کھول دیتے ہیں، جس کی وجہ سے جہنم پھر بھڑک اٹھتی ہے(2)۔

امام بغوی نے زکریا بن ابی مریم الخزاعی سے روایت کیا ہے کہ وہ فرماتے ہیں میں نے حضرت ابی امامہ الباہلی کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جہنم کے کنارہ سے جہنم کی گہرائی تک ایک پتھر کو گرنے میں ستر سال کی مدت لگتی ہے یا فرمایا اس پتھر کو جو دس موٹی اونٹنیوں جیسا ہو اس کو اتنی مدت لگتی ہے۔ عبدالرحمن بن خالد بن الولید نے پوچھا پھر اس کے نیچے بھی کچھ ہے اے ابی امامہ! فرمایا اس کے نیچے غی ہے اور آثام کی وادیاں ہیں(3)۔

ابن جریر، ابن ابی حاتم، سعید بن منصور، ہناد، الفریابی، حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے مختلف طرق سے اسی آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن مسعود نے فرمایا الغی جہنم کی ایک وادی ہے، ایک روایت میں ہے کہ جہنم میں ایک گہری نہر ہے جس کا ذائقہ بہت برا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ دوزخ میں کھولتے ہوئے پانی کی ایک نہر ہے جس میں ان لوگوں کو پھینکا جائے گا جو خواہشات نفس کی پیروی کرتے ہیں(4)۔

بیہقی نے حضرت براء بن عازب سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں غی جہنم کی ایک وادی ہے جو بڑی گہری ہے اور بدبودار ہے۔

طبرانی اور بیہقی نے براء بن عازب سے مرفوع حدیث نقل کی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اگر ایک پتھر کا وزن دس اوقیہ ہو، سے جہنم کے کنارے سے پھینکا جائے تو وہ ستر سال تک اس کی گہرائی میں نہیں پہنچے گا۔ اس کے بعد وہ غی اور آثام تک پہنچے گا۔ براء بن عازب فرماتے ہیں میں نے عرض کی حضور! غی اور آثام کیا ہیں؟ فرمایا یہ جہنم کے نیچے دو نہریں ہیں جن میں دوزخیوں کی پیپ بہتی ہے۔ ان دو وادیوں کا ذکر اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں فرمایا ہے۔ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا۔ قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا(5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہاں غی سے مراد گمراہی ہے جو ہدایت کی ضد ہے۔ وہ گمراہی کو پائیں گے اور جنت کے راستہ سے بھٹک جائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں عربوں کے نزدیک ہر برائی غی ہے اور ہر نیکی رشاد ہے۔ اسی وجہ سے ضحاک یہ معنی فرماتے ہیں کہ وہ گھاٹا پائیں گے۔ بعض نے غی کا معنی ہلاکت، بعض نے عذاب کیا ہے(6)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں مضاف کو حذف کر کے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً، صفحہ 205
4۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 500 (العلمیہ) 5۔ ایضاً 6۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 204 (التجاریہ)

مضاف الیہ کو اس کے قائم مقام رکھا گیا ہے۔ یہ اصل میں جزاءغی تھا، یعنی دنیا میں اختیار کئے گئے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی سزا پائیں گے۔

إِلَّا مَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَأُولَٰئِكَ يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُونَ شَيْئًا ۝

''مگر جو تائب ہوئے اور ایمان لائے اور نیک عمل کئے 1 تو یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان پر ذرا ظلم نہیں کیا جائے گا۔ 2''

1 یعنی جنہوں نے نفسانی خواہشات کی پیروی کی اور نمازوں کو ترک کیا اگر وہ سچے دل سے توبہ کرلیں اور جو کافر تھے مسلمان ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر مکمل ایمان لے آئیں اور پھر ایمان کے تقاضا کے مطابق عمل پیرا ہوں۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ دلیل ہے کہ یہ کفار کے متعلق ہے (1)۔ یعنی مذکورہ وعید کفار کے ساتھ مختص ہے' میں کہتا ہوں من آمن و عمل صالحا مستثنیٰ ہے پس جو ایمان لایا لیکن نیک اعمال نہ کئے تو وہ فاسق بھی مذکورہ وعید میں داخل ہے جس طرح کہ سابقہ آیت کی تفسیر میں ابن عباس کی حدیث بھی دلالت کرتی ہے۔ نہ سرابی' زانی وغیرہ جو گناہ کبیرہ کے مرتکب ہیں وہ غی میں پھینکے جائیں گے۔

2 فاولئک کا مشارالیہ من تاب و آمن و عمل صالحاً ہے۔ ابن کثیر' ابن عمرو' یعقوب اور ابوبکر نے یدخلون کو باب افعال سے مجہول کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے فعل مجرد دخل سے معروف کا صیغہ پڑھا ہے۔ شیئاً مفعول ہونے کے اعتبار سے منصوب ہے۔ یعنی ان کے اعمال کی جزاء میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی یا شیئا مصدریت کی بناء پر منصوب ہے، یعنی ان پر کچھ ظلم و زیادتی نہ ہوگی۔ اس آیت میں دلیل ہے کہ سابقہ کفر توبہ کرنے والے کے لئے کچھ نقصان دہ نہیں ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اسلام سابقہ تمام گناہوں اور جرموں کو ختم کر دیتا ہے' اس حدیث کو عمرو بن عاص کے حوالہ سے مسلم نے روایت کیا ہے (2)۔ یہ اولئک کا جملہ استثناء کے مضمون پر تعلیل کے مقام پر ہے۔

جَنَّاتِ عَدْنٍ الَّتِي وَعَدَ الرَّحْمَٰنُ عِبَادَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّهُ كَانَ وَعْدُهُ مَأْتِيًّا ۝٦١

''سدا بہار چمن جن کا وعدہ (خداوند) رحمٰن نے اپنے بندوں سے 1 غیب میں کیا ہے یقیناً اس کا وعدہ پورا ہو کر رہنے والا ہے 2''

1 یہ جنت عدن' سابقہ الجنة سے بدل اشتمال ہے۔ یا بطور مدح منصوب ہے یا فعل محذوف اعنیٰ کی وجہ سے منصوب ہے عدن گر اقامة کے معنی میں ہو تو جو جنت اس کی طرف مضاف ہے وہ نکرہ ہوگا' بعض فرماتے ہیں یہ یک معین جنت کا علم ہے۔ اور یہ اسم کی طرف اضافت ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ جنت کی زمین کا علم ہے۔ دونوں تقدیروں پر جنت عدن معرفہ ہوگا اور التی کے ساتھ اس کا وصف بیان کیا گیا ہے۔ موصول کو نکرہ کی تاویل میں کیا جائے تو یہ التی جنت کی صفت ہوگا یا جنت عدن سے بدل ہوگا۔ اور صلہ میں ضمیر عائد محذوف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی التی وعدالرحمٰن بها عباده۔

2 بالغیب' حال ہے عبادہ سے، یعنی اللہ نے ان سے وعدہ فرمایا در آں حالیکہ وہ جنت سے غائب تھے۔ یا یہ جنت سے حال ہے' یعنی جنت ان سے غائب ہے یا یہ مضاف کے حذف کے ساتھ وعد کے متعلق ہے' یعنی اللہ تعالیٰ نے ان سے ایمان اور غیب کی تصدیق

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 562 (العلمیہ) 2۔ صحیح مسلم، جلد 1، صفحہ 76 (وزارت تعلیم)

کے باعث یہ وعدہ فرمایا ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو اپنے بندوں سے وعدہ فرمایا وہ یقیناً پورا ہوگا اور جنتی ضرور اس میں تشریف لائیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں ماتیا اسم مفعول اتیا اسم فاعل کے معنی میں ہے کیونکہ جو چیز تیرے پاس آتی ہے تو تو بھی اس کے پاس آیا ہے۔ عرب اَتٰی عَلَیَّ خَمْسُوْنَ سَنَةً۔ (مجھ پر پچاس سال گزر گئے) اور اَتَیْتُ عَلٰی خَمْسِیْنَ سَنَةً (میں پچاس سال سے گزرا) میں کچھ فرق نہیں کرتے کیونکہ دونوں کا معنی اور مفہوم ایک ہی ہے۔ اسی طرح وَصَلَ اِلَیَّ الْخَبَرُ (مجھ تک خبر پہنچی) اور وَصَلْتُ اِلَی الْخَبَرِ (میں خبر تک پہنچ گیا) میں کوئی فرق نہیں کرتے۔

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا اِلَّا سَلٰمًا ۭ وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا ﴿٦٢﴾

''نہیں سنیں گے جنت میں کوئی لغو بات بجز 'سلامت رہو' کی دعا یہ صدا[1] اور انہیں ان کا رزق ملے گا وہاں ہر صبح و شام[2]''

[1] لغواً۔ ایسی کلام جو فضول ہو۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا حال مقدرہ ہے عبادہ سے یا الجنۃ سے یا صلہ کی ضمیر محذوف سے۔ سلاماً۔ مستثنیٰ منقطع ہے، یعنی اللہ تعالیٰ اور فرشتوں کی طرف سے یا ایک دوسرے کی طرف سے سلامت رہو کی صدائے دلنواز سنیں گے، کوئی لغو بات نہ سنیں گے۔ یا یہ معنی کہ وہ ایسی کلام سنیں گے جس میں عیب اور نقص سے سلامت ہوں گے۔

[2] ان کو جنت میں صبح و شام رزق ملے گا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس سے مراد خوش وخرم زندگی اور رزق کی فراوانی ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں عرب صبح و شام ملنے والے رزق کے علاوہ کوئی زندگی تصور نہیں کرتے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے جنت کا ایسا وصف بیان فرمایا(1)۔

سعید بن منصور، ابن ابی حاتم نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت فرمایا کہ جنتیوں کو آخرت میں اسی کی مقدار ملے گا جتنا انہیں دنیا میں ملتا تھا(2)۔ ابن المبارک نے ضحاک سے اس آیت کے تحت نقل کیا ہے کہ دن، رات کی مقادیر پر انہیں رزق ملے گا۔

ابن المنذر نے ولید بن مسلم سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں۔ میں نے زہیر بن محمد سے وَلَهُمْ رِزْقُهُمْ فِيْهَا بُكْرَةً وَّعَشِيًّا کے متعلق پوچھا تو انہوں نے فرمایا جنت میں کوئی رات نہیں ہے وہ ہمیشہ نور میں رہیں گے۔ حجابات کے اٹھانے کے ساتھ دن کی مقدار اور حجابات کے ڈالنے کے ساتھ رات کی مقدار کو پہچانا جائے گا۔ الحکیم ترمذی نے النوادر میں' حسن اور ابی قلابہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ! کیا جنت میں رات ہے؟ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں فرمایا لهم رزقهم فيها بكرة و عشيا۔ کہ صبح وشام ان کو رزق ملے گا۔ حضور ﷺ نے فرمایا وہاں کوئی رات نہیں ہے۔ صرف نور کی روشنی ہوگی صبح اور شام کا ایک دوسرے پر ورود ہوگا اور جن اوقات میں وہ نمازیں پڑھتے تھے ان میں اللہ کی طرف سے ان کے پاس تحفے آئیں گے اور فرشتے ان پر سلام بھیجیں گے(3)۔

تِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْ نُوْرِثُ مِنْ عِبَادِنَا مَنْ كَانَ تَقِيًّا ﴿٦٣﴾

''یہ وہ جنت ہے جس کا ہم وارث بنائیں گے اپنے بندوں سے (صرف) اسکو جو متقی ہوگا[1]''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 501 (العلمیہ) 3۔ ایضاً

۱؎ یعنی ہم ان پران کے تقوی اور پرہیزگاری کو باقی رکھیں گے جس طرح وارث پر مورث کا مال باقی رہتا ہے۔ یہاں اللہ تبارک وتعالیٰ نے وراثت کا لفظ استعمال فرمایا ہے کیونکہ تملیک اور استحقاق میں یہ قوی ترین سبب ہے کیونکہ اس کے بعد نہ فسخ ہے، نہ لوٹانا ہے اور نہ یہ رد اور اسقاط سے باطل ہوتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں کہ متقین جنت میں ان محلات کے وارث بنیں گے جو دوزخیوں کو ملتے تھے اگر وہ اطاعت گزار ہوتے اور یہ مومنین کی عزت میں اضافہ کرنے کیلئے دیئے جائیں گے۔ واللہ اعلم۔

ابن ماجہ، بیہقی نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روایت کیا ہے۔ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تم میں سے ہر ایک کے لئے دو منزلیں ہیں، ایک منزل جنت میں اور ایک دوزخ میں جب کوئی مرتا ہے اور دوزخ میں داخل ہوتا ہے تو اہل جنت اس کی منزل کے وارث ہو جاتے ہیں اللہ تعالیٰ کے فرمان اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ یہی مطلب ہے(1)۔

ابن ماجہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص کسی وارث کو میراث دینے سے بھاگے گا اللہ تعالیٰ جنت میں اس کی میراث کو ختم فرمادے گا(2)۔ واللہ اعلم۔

امام بخاری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے جبرئیل سے فرمایا اے جبرئیل تم جتنا میرے پاس آیا کرتے ہو، اس سے زیادہ کیوں نہیں آتے تو اس وقت یہ ذیل کی آیت نازل ہوئی(3)۔

وَمَا نَتَنَزَّلُ اِلَّا بِاَمْرِ رَبِّكَ ۚ لَهٗ مَا بَيْنَ اَيْدِيْنَا وَمَا خَلْفَنَا وَمَا بَيْنَ ذٰلِكَ ۚ وَمَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا ۚ

''اور (جبرائیل! میرے نبی سے کہو) ہم نہیں اترتے ۱؎ مگر آپکے رب کے حکم سے ۲؎ اسی کا ہے جو ہمارے سامنے ہے جو ہمارے پیچھے ہے اور جو کچھ اس کے درمیان ہے ۳؎ اور نہیں ہے آپ کا رب بھولنے والا۔ ۴؎''

۱؎ تنزل کا مطلب ہے آہستہ آہستہ اترنا، کیونکہ یہ نزل باب تفعیل کا مطاوع ہے اور کبھی یہ مطلقاً نزول کے معنی میں استعمال ہوتا ہے جیسے نزل بمعنی انزل استعمال ہوتا ہے۔

۲؎ الا بامر ربک۔ ظرفیت کی بناء پر یا مصدریہ کی بناء پر منصوب ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی وما نتنزل الا وقتا متلبسا بامر ربک علی ما یقتضیه حکمته او تنزلا الا تنزلا متلبساً بامره۔

ابن ابی حاتم نے عکرمہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جبرائیل نے چالیس دن نزول میں تاخیر کر دی، آگے ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کی طرح روایت کیا ہے۔ ابن مردویہ نے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا حضور! کون سی جگہ اللہ کو زیادہ محبوب ہے اور کونسی جگہ زیادہ مبغوض اور ناپسند ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا میں نہیں جانتا، پوچھ کر بتاؤں گا۔ جبرئیل تشریف لائے، جبکہ بڑی دیر سے آئے۔ آپ ﷺ نے فرمایا جبرئیل! دیر سے آئے ہو مجھے تو یہ خیال آنے لگا تھا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ناراض ہو گئے ہیں۔ تو جبرئیل نے کہا وما نتنزل الا بامر ربک۔

ابونعیم نے الدلائل میں اور ابن اسحٰق نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ قریش نے جب اصحاب کہف، ذوالقرنین اور روح کے متعلق پوچھا تو آپ ﷺ کو ان کا جواب معلوم نہ تھا لیکن آپ کو امید تھی کہ وحی آجائے گی۔ پندرہ دن گزر گئے لیکن اللہ تعالیٰ نے

1۔ سنن ابن ماجہ، صفحہ 332　2۔ ایضاً صفحہ 198　3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ)

وحی نازل نہ فرمائی جب جبرئیل بعد میں تشریف لائے تو آپ ﷺ نے فرمایا جبرائیل! تو نے دیر لگادی۔

امام بغوی نے' ضحاک' عکرمہ' مقاتل اور کلبی کا قول نقل کیا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ سے آپ کی قوم نے اصحاب کہف ذی القرنین اور روح کے متعلق دریافت کیا تو آپ ﷺ نے فرمایا تمہارے سوالوں کے کل جواب دوں گا۔ آپ ﷺ نے ان شاء اللہ نہ کہا۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل کو نہ بھیجا حتیٰ کہ یہ تاخیر رسول اللہ ﷺ پر بڑی شاق گزری پھر پندرہ دن کے بعد جبرائیل تشریف لائے تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جبرائیل تو نے دیر لگادی۔ اے میرا تو گمان بدل رہا تھا اور میں تو تیری آمد کے اشتیاق میں بے چین ہو رہا تھا۔ جبرائیل نے کہا مجھے بھی آپ سے ملاقات کا انتہائی شوق تھا لیکن میں عبد مامور ہوں' حکم کا بندہ ہوں۔ جب مجھے حکم الٰہی ہوتا ہے تو آپ کی خدمت میں حاضر ہو جاتا ہوں۔ جب روک دیا جاتا ہے تو رک جاتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر یہ آیت اور وَالضُّحٰی ۙ وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی ۙ مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی ؕ نازل فرمائی(1)۔

؎ له ما بين ايدينا کا جملہ نزول میں تاخیر کی علت کی بناء پر محل نصب میں ہے یا حال کی بناء پر منصوب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس وقت کے بعد قیامت تک بلکہ اس کے بعد کے وقت اسی کے قبضہ قدرت میں ہے' دنیا اور آخرت کے امور کا بھی وہی مالک ہے اور ثواب وعقاب کا معاملہ بھی اسی کے پاس ہے۔ اور جو کچھ اشیاء واحوال گزر چکے ہیں وہ ان کا بھی مالک ہے اور جو موجود وقت ہے اور جو کچھ اس میں موجود ہے سب اسی کا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ما بين ايدينا سے مراد زمین ہے جب ہم اس پر نزول کا ارادہ کریں اور وما خلفنا سے مراد آسمان ہے جب ہم اس سے اترنے کا ارادہ کریں۔ اور وما بين ذالك سے مراد ہواء ہے۔ یعنی ہم کسی زمانہ میں اذن الٰہی کے بغیر نہیں اترتے یا ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل نہیں ہوتے مگر اللہ کے حکم سے۔

؎ اے جان عالم آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے۔ میرا حاضر نہ ہونا اللہ تعالیٰ کی آپ سے ناراضگی اور چھوڑنے کی وجہ سے نہیں جیسا کہ یہ گندے ذہن والے کافر سوچتے ہیں بلکہ وحی کے نزول کی تاخیر میں اللہ تعالیٰ کی کوئی خاص حکمت کارفرما تھی جسے وہ خود ہی جانتا ہے۔

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَمَا بَیۡنَہُمَا فَاعۡبُدۡہُ وَاصۡطَبِرۡ لِعِبَادَتِہٖ ؕ ہَلۡ تَعۡلَمُ لَہٗ سَمِیًّا ﴿۶۵﴾

" وہ پروردگار ہے آسمانوں اور زمین کا اور جو کچھ ان کے درمیان ہے ؎ سو اس کی عبادت کرو اور ثابت قدم رہو اس کی عبادت ؎ پر کیا تم جانتے ہو کہ اس کا کوئی ہم مثل ہے ؎ "

؎ رب السموات والارض وما بينهما مبتدا محذوف هو کی خبر ہے یا ربک سے بدل ہے۔ اور یہ اس کے نسیان کے امتناع کا بیان ہے۔

؎ عبادت کے حکم کا خطاب رسول اللہ ﷺ سے ہو رہا ہے اور یہ سابقہ کلام پر مرتب ہے، یعنی جب آپ کو معلوم ہے کہ تیرے رب کریم کا تجھ پر فضل واحسان اور رحمت بے انتہا ہے اور اس کی یہ شان ہی نہیں کہ تجھے چھوڑ دے تو آپ اس نعمت واحسان پر بطور تشکر ہر دم اس کی عبادت میں مصروف رہیئے اور اس عبادت پر دوام اختیار فرمایئے' آپ وحی کی تاخیر اور کفار کے استہزاء سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 205 (التجاریہ)

رنجیدہ خاطر نہ ہوا کریں۔ یہاں اصطبار کو لام کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا گیا ہے حالانکہ کلام کا تقاضا یہ تھا کہ علی کے صلہ کے ساتھ متعدی کیا جاتا لیکن یہ انداز و اسلوب میں تبدیلی اس بات کا شعور دینے کے لئے ہے کہ عبادت میں لذت بھی ہے' رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِي فِي الصَّلٰوةِ(1) نماز میں میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے یا یہ معنی کہ تکالیف و مصائب اور کفار کی ایذا رسانیوں پر اپنے رب کی عبادت کی خاطر صبر کیجئے تاکہ آپ اللہ تعالیٰ کی عبادت پر راسخ ہو جائیں اور خالصاً اللہ کے عبادت گزار ہو جائیں

؎ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں سمیا کا معنی مثلاً کیا گیا ہے۔ یعنی آپ کوئی اس کی مثل جانتے ہیں جو عبادت کا مستحق ہو اور الٰہ کہلوانے کا حقدار ہو۔ کلبی فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ کیا۔ آپ جانتے ہیں کوئی ایسا دوسرا جسے اللہ کہا جاتا ہو(2)' کیونکہ مشرکین بتوں کو الٰہ کہتے تھے لیکن کسی کو وہ اللہ نہیں کہتے تھے۔ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ احدیت میں ظاہر ہے اور اس کی ذات مماثلت سے بلند و بالا ہے اور وہ اپنی ذات کے اعتبار سے التباس اور مماثلت کو قبول نہیں کرتا۔ یہ ارشاد عبادت کے حکم کا ثبوت اور تقریر ہے کیونکہ جب اس کی کوئی مثل ہی نہیں ہے اور کوئی دوسرا عبادت کا مستحق بھی نہیں ہے تو ضروری ہے کہ اس کے حکم کو ہی تسلیم کیا جائے اور اس کی عبادت میں صبح و شام مشغول رہا جائے اور اس کی عبادت کی مشقتوں کو برداشت کیا جائے۔

وَيَقُولُ الْإِنْسَانُ ءَإِذَا مَا مِتُّ لَسَوْفَ أُخْرَجُ حَيًّا ﴿٦٦﴾

''اور انسان (از راہ انکار) کہتا ہے ؎ کہ کیا جب میں مر جاؤں گا تو مجھے پھر زندہ کر کے نکالا جائے گا ؎''

؎ انسان سے مراد کوئی فرد واحد نہیں بلکہ جنس انسان مراد ہے کیونکہ بعض کا قول جنس کی طرف منسوب کیا جاتا ہے یا مخصوص انسان مراد ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہاں انسان۔ سے مراد ابی بن خلف الجمحی ہے وہ قیامت کا منکر تھا(3)۔ روایت ہے کہ اسے ایک بوسیدہ پرانی ہڈی ملی تو اس نے اسے پکڑ کر مشرکین سے کہا دیکھو محمد (ﷺ) کہتا ہے کہ اسے از سر نو زندہ کیا جائے گا اور ہمیں مرنے کے بعد پھر اٹھایا جائے گا اللہ تعالیٰ نے اس کی بات کو یہاں حکایت فرمایا۔

؎ کیا میرے مرنے کے بعد زمین سے یا موت کی حالت سے زندہ کر کے نکالا جائے گا۔ یہاں ظرف کو مقدم کرنا اور اس پر حرف انکار کا داخل کرنا اس لئے ہے کہ منکر مطلقاً دوبارہ زندگی کا منکر نہیں تھا بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کرنے اور حیات ملنے کا منکر تھا۔ ظرف اس فعل کے متعلق ہے جس پر اخرج دلالت کر رہا ہے۔ موجود اخرج فعل کے متعلق نہیں ہے کیونکہ لام کا مابعد ماقبل میں عمل نہیں کرتا۔ اور سوف پر لام صرف تاکید کے لئے ہے' حال کے معنی سے خالی ہے۔ ابن ذکوان نے ایک ہمزہ مکسور کے ساتھ پڑھا ہے اور ہمزہ استفہام کو حذف کیا ہے اور مراد انکار کا معنی ہے، جبکہ باقی قراء نے دو ہمزوں کے ساتھ پڑھا ہے۔

أَوَلَا يَذْكُرُ الْإِنْسَانُ أَنَّا خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلُ وَلَمْ يَكُ شَيْئًا ﴿٦٧﴾

''کیا یاد نہ رہا انسان کو کہ ہم نے ہی پیدا کیا اسے اس سے پہلے حالانکہ وہ کچھ بھی نہ تھا۔ ؎''

1۔ نافع' عاصم اور ابن عامر نے یذکر کو ذال کے سکون اور کاف کے ضمہ کے ساتھ تخفیف کے ساتھ ینصر کے وزن پر پڑھا ہے اور باقی قراء نے کاف کے فتحہ اور ذال متشدد کے ساتھ پڑھا ہے۔ اس صورت میں اس کی اصل یتذکر ہوگی' تاء کو ذال میں ادغام کیا گیا

1۔ کنز العمال: 18912 (التراث الاسلامی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4۔ 206 (التجار...) 3۔ ...

تو یذکر ہو گیا۔اس کا معنی سوچنا اور فکر کرنا ہے' اس کا عطف یقول پر ہے۔معطوف اور معطوف علیہ کے درمیان ہمزہ استفہام کو ذکر فرمایا تاکہ اس بات پر دلالت ہو جائے کہ منکر بالذات معطوف ہے اور معطوف علیہ کا انکار اس سے پیدا ہوا ہے۔اصل تو یہ ہے کہ ہمزہ استفہام کو معطوف علیہ پر داخل کیا جاتا یعنی اگر یہ حضرت انسان اپنی عقل کو استعال کرتا اور سوچ لیتا تو یہ ایسا نہ کہتا کیونکہ ہم نے اس کی اس وقت تخلیق کی تھی، جبکہ اس کا مادہ اور اصل بھی نہ تھا۔حالانکہ محض عدم مادہ اور اصل کے نہ ہونے کی صورت میں بنانا زیادہ متعجب اور حیران کن ہے بنسبت بکھرے ہوئے اجزاء اور اعراض کو اکٹھا کرنے کے (جو ذات بغیر مادہ اور اصل کے ایک نئی چیز تخلیق کر سکتی ہے تو مادہ اور اصل' جوہر اور اعراض کے موجود ہونے کے وقت اسے مجتمع کیوں نہیں کر سکتی۔

فَوَرَبِّكَ لَنَحْشُرَنَّهُمْ وَالشَّيٰطِيْنَ ثُمَّ لَنُحْضِرَنَّهُمْ حَوْلَ جَهَنَّمَ جِثِيًّا ﴿٦٨﴾

''سو (اے محبوب) تیرے رب کی قسم! ہم جمع کریں گے انہیں بھی اور شیطانوں کو بھی ۱؎ پھر حاضر کریں گے ان سب کو جہنم کے اردگرد کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے ۲؎ ''

۱؎ نبی کریم ﷺ کی عظمت شان کے اظہار کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو آپ ﷺ کی طرف مضاف کر کے قسم اٹھائی، فرمایا تیرے رب کی قسم (حالانکہ وہ سب کا رب ہے' اس نسبت اور اضافت میں جو لطف اور مزہ ہے وہ صرف اہل ذوق ہی محسوس کر سکتے ہیں) فاء سببیت کے لئے ہے کیونکہ انکا قیامت کا انکار کرنا جہنم کی طرف شیطانوں کے ساتھ حشر ہونے کا سبب تھا۔الشیاطین مفعول معہ ہے اور یہ ہو سکتا ہے کہ اس سے پہلے واؤ معیت نہ ہو بلکہ واؤ عاطفہ ہو۔تو اس صورت میں الشیاطین معطوف ہو کر مفعول بہ ہو گا۔امام بغوی فرماتے ہیں ہر کافر شیطان کے ساتھ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہو گا (1)۔

۲؎ جثیا' ھم ضمیر منصوب سے حال ہے' ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جماعات فرمایا ہے اور یہ جثوة کی جمع ہے۔الحسن اور الضحاک فرماتے ہیں یہ جاث کی جمع ہے۔یعنی وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں گے۔سدی فرماتے ہیں جگہ کی تنگی کی وجہ سے وہ گھٹنوں کے بل کھڑے ہوں گے (2)۔میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ سعادت مندوں اور بدبختوں تمام کو جہنم کے اردگرد جمع فرمائے گا۔سعادت مند جب دوزخ کو دیکھیں گے جس سے اللہ نے انہیں نجات عطا فرمائی تو زیادہ خوش ہوں گے اور بدبخت لوگ سعادت مندوں کو جنت کی طرف جاتا دیکھ کر زیادہ غمگین ہوں گے اور حسرت کا اظہار کریں گے۔اسی حکمت کے تحت اللہ تعالیٰ سب کو جہنم کے پاس جمع فرمائے گا۔عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں' بیہقی نے عبداللہ بن ثابت سے روایت کیا ہے' فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تمہیں گویا جہنم سے دور الکرم میں گھٹنوں کے بل دیکھ رہا ہوں (3) پھر حدیث کے راوی سفیان نے یہ آیت پڑھی وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً۔ابن حجر فرماتے ہیں الکرم سے مراد وہ بلند مقام ہے جہاں امت محمد ﷺ موجود ہو گی۔ثم کا کلمہ دلیل ہے کہ حشر کے بعد جہنم کے گرد جمع ہونے میں اچھا خاصا وقفہ ہو گا کیونکہ فیصلہ ہونے سے پہلے لوگ ایک طویل زمانہ موقف میں محبوس ہوں گے۔

ثُمَّ لَنَنْزِعَنَّ مِنْ كُلِّ شِيْعَةٍ اَيُّهُمْ اَشَدُّ عَلَى الرَّحْمٰنِ عِتِيًّا ﴿٦٩﴾

''پھر ہم (چن چن کر) الگ کر دیں گے ہر گروہ سے ان لوگوں کو ۱؎ جو (خداوند) رحمٰن کے سخت نافرمان تھے ۲؎ ''

۱؎ من کل شیعة سے مراد ہر امت اور اہل دین ہیں۔شیعة شاع یشیع شیعا و شیوعا و مشاعاً شیوعة و شیعاناً۔

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریہ) 2۔ایضاً۔ 3۔الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 504 (العلمیہ)

سے مشتق ہے اس کا معنی پھیلنا ہے۔ شیعۃ الرجل' کسی انسان کے متبعین اور معاونین کو کہتے ہیں اور شیعۃ علیحدہ فرقہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس لفظ کا اطلاق واحد' تثنیہ جمع' مذکر اور مونث پر ایک جیسا ہوتا ہے۔ قاموس میں بھی اسی طرح لکھا ہے میں کہتا ہوں' شیعہ کا اطلاق انسان کے پیروکاروں اور مددگاروں پر اس لئے ہوتا ہے کہ شیوع اور انتشار (یعنی پھیلاؤ) تقویت کو مستلزم ہے۔ پیروکار اور مددگار پھیل جاتے ہیں اور متبوع (قائد) کی تحریک ان کی وجہ سے تقویت پکڑتی ہے۔ جوہری کہتے ہیں الشیاع کا معنی پھیلاؤ اور تقویت ہے کہا جاتا ہے شاع الحدیث یعنی بات زیادہ ہوگئی اور طاقتور ہوگئی۔ شاع القومُ قوم زیادہ ہوگئی اور پھیل گئی۔ شَیَّعَتِ النَّارُ بِالْحَطَبِ آگ لکڑیوں کی وجہ بھڑک اٹھی۔ شیعہ ان لوگوں کو کہتے ہیں جن سے انسان تقویت حاصل کرتا ہے اور وہ پھیل جاتے ہیں۔ جب ہر امت کا علیحدہ دین ہے اور اپنے دین کے ساتھ وہ پھیل گئے اور ان کا معاملہ ان کی وجہ سے مضبوط ہوگیا تو اس لئے ان پر اس لفظ کا اطلاق کیا گیا۔

۲۔ ایھم اشد اصل میں ھو اشد تھا۔ عتیا۔ کا معنی تکبر کرنا اور نافرمانی میں حد سے بڑھ جاتا ہے(1)۔ قاموس میں اسی طرح ہے یا اس کا معنی طاعت سے ہٹ جانا ہے امام بغوی فرماتے ہیں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس کا معنی جرأت کیا ہے اور مجاہد نے اس کا معنی فجور کیا ہے(2)۔ عتیا کا کلمہ اشد کی نسبت سے تمیز ہے اور ایّ کا کلمہ سیبویہ کے نزدیک لننزعن کے مفعول کے حیثیت سے منصوب ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں ای کا حق تو یہ تھا کہ دوسرے اسماء موصولہ کی طرح مبنی ہوتا کیونکہ اسماء موصولہ احتیاج میں حرف کے مشابہ ہوتے ہیں لیکن یہاں ای معرب ہے۔ لزوم اضافت کی وجہ سے کل اور بعض پر محمول ہے اور جب اس کے صلہ کا صدر حذف ہوگیا تو اس میں نقص اور زیادہ ہوگیا پس یہ اپنی اصل کی طرف لوٹ آیا یعنی معرب ہوگیا۔ اور خلیل نحوی کے نزدیک یہ مرفوع ہے یا تو اس لئے کہ یہ مبتدا ہے اور اس کی خبر اشد ہے اور یہ جملہ اس قول کو بیان کر رہا ہے (جو محذوف اسم موصول کا صلہ ہے جو اسم موصول لننزعن کا مفعول ہے اور ای یہاں اسم موصول نہیں بلکہ استفہامیہ ہے) اور تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لننز عن من کل شیعة الذین یقال فیھم ایھم اشد یا ایھم لننز عن سے معلق ہے۔ (لیکن اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا تھا کہ تعلیق افعال قلوب کے ساتھ خاص ہے جبکہ لننز عن افعال قلوب سے نہیں ہے) اس کے جواب میں بیضاوی فرماتے ہیں لننز عن میں تمیز کا معنی پایا جاتا ہے۔ (کیونکہ کسی چیز کا کسی دوسری چیز سے نکالنا اس کے جدا کرنے اور ممتاز کرنے کا تقاضا کرتا ہے) اور یہ تمیز اور افراز علم کا سبب ہے (اس لئے تعلیق ہوسکتی ہے) یا یہ جملہ مستانفہ ہے اور من بعضیہ ہے یا من زائدہ ہے اور لننزعن کا فعل من کے زائدہ ہونے کی صورت میں کل شیعة پر واقع ہے یا یہ معنی ہے لننزعن بعض کل شیعة۔

یا ایھم یشیع فعل کے فاعل کی حیثیت سے مرفوع ہے کیونکہ شیعة یشیع کے معنی میں ہے اور علی بیان کے لئے ہے(3) (یعنی جار مجرور فعل محذوف یا مصدر مبین کے متعلق ہے) یا اشد کے متعلق ہے۔ آئندہ آیت میں الباء کی بھی یہی ترکیب ہے۔ (گویا یوں سوال کیا گیا کہ انہوں نے کسی ذات پر سرکشی کی تو کہا گیا۔ عتوا علی الرحمن۔ کہ انہوں نے رحمٰن کی سرکشی کی) واللہ اعلم۔

ثُمَّ لَنَحْنُ اَعْلَمُ بِالَّذِیْنَ هُمْ اَوْلٰى بِهَا صِلِیًّا ۝

"پھر ہم ہی خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو زیادہ مستحق ہیں اس آگ میں تپائے جانے کے۔ ۱؎"

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1716 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریۃ)

3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 74-573 (العلمیۃ)

[1] آیت کا یا یہ معنی ہے کہ ہم خوب جانتے ہیں ان لوگوں کو جو آگ میں تپانے کے زیادہ مستحق ہیں یا یہ معنی کہ جن کا آگ میں تپایا جانا زیادہ بہتر ہے۔ ثم کا کلمہ یہاں تاخیر زمانی کے لئے نہیں بلکہ تراخی رتبہ کے لئے ہے۔ جس طرح ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِينَ اٰمَنُوا میں ثم تراخی رتبہ کے لئے ہے۔ یا یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کلام کنایہ ہے ثم لنعذبنهم سے یعنی پھر ہم انہیں ضرور عذاب دیں گے۔ اس تاویل میں کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ عذاب دینا دوزخ پر پیشی سے متاخر ہی ہوگا۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں اعلم بمعنی العلیم ہے کیونکہ یہ علم اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور یہ کہنا بھی جائز ہے کہ کراماً کاتبین اور دوسرے ملائکہ بھی جانتے ہیں کہ فاجر اور متقی کون ہیں سعادت مند اور بد بخت کون ہیں اور اللہ اس کو زیادہ جانتا ہے۔

حمزہ، کسائی اور حفص نے جثیا، عتیا اور صلیا کو فاء کلمہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے جیسا کہ وَقَدْ بَلَغْتُ مِنَ الْكِبَرِ عِتِيًّا۔ میں اس کی تحقیق گزر چکی ہے اور جمہور علماء نے فاء کلمہ کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ان کے نزدیک اس کا اصل وزن فعول ہے جیسا کہ گزر چکا ہے۔

کل شیعة اگر کفار اور نافرمان مسلمانوں تمام کو شامل ہو تو اشد کے ذکر میں اس بات پر تنبیہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ نافرمانوں میں سے اکثر کو معاف فرما دے گا اور اگر کل شیعة صرف کفار سے ساتھ خاص ہو جیسا کہ سیاق کلام کا تقاضا ہے اور امام بغوی اور دوسرے اکثر مفسرین کی رائے ہے تو اشد سے مراد یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان میں جو سب سے زیادہ سرکش ہوں گے پہلے ان کو جدا کر کے دوزخ میں ڈالے گا پھر جو ان سے کم ہوں گے یعنی ترتیب وار چن چن کر کافر سرکشوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ یا یہ معنی کہ ہر طبقہ کے سرکشوں کو اس آگ میں ڈالا جائے گا جو ان کے لئے تیار کی گئی ہوگی۔

ابن ابی حاتم اور بیہقی نے حضرت ابن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ جب پہلے اور پچھلے سب جمع ہو جائیں گے حتیٰ کہ تعداد پوری ہو جائے گی۔ پہلے بڑے مجرموں کو چنا جائے گا اور پھر انہیں آگ میں ڈالا جائیگا پھر جو ان سے کم درجہ کفر پر ہوں گے انہیں ڈالا جائے گا (اسی ترتیب سے سلسلہ جاری رہے گا) پھر حضرت عبداللہ بن مسعود نے فوربک لنحشرنهم الایة تلاوت فرمائی۔ ہناد نے ابی الاحوص سے اسی طرح کا قول نقل فرمایا ہے یبدء الا کابر فالا کابر جرماً(1)۔

وَإِنْ مِّنْكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا ۚ كَانَ عَلٰى رَبِّكَ حَتْمًا مَّقْضِيًّا ﴿٧١﴾ۚ

"اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا[1] یہ آپ کے رب پر لازم ہے (اور اس کا) فیصلہ ہو چکا ہے[2]"

[1] ان نافیہ ہے اور منکم واحد محذوف کی صفت ہے۔ واردها میں ها ضمیر کا مرجع جہنم ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں قسم مضمر ہے اصل میں واللہ ما منکم الا واردها ہے اور اس تاویل کی دلیل الاتحلة القسم کے الفاظ ہیں جو احادیث میں وارد ہیں۔ (حدیث شریف اس طرح ہے لَا يَمُوْتُ لِأَحَدِكُمْ ثَلَاثَةٌ مِّنَ الْوَلَدِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ إِلَّا تَحِلَّةَ الْقَسَمِ)

[2] الحتم مصدر ہے حتم الامر کا جس کا معنی واجب ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر اس کو واجب کر لیا ہے اور اس کا فیصلہ فرما دیا ہے اور اس نے ایسا وعدہ فرمایا ہے جس کا خلف ممکن نہیں ہے۔

ثُمَّ نُنَجِّي الَّذِينَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِينَ فِيهَا جِثِيًّا ﴿٧٢﴾

"پھر ہم نجات دیں گے پرہیزگاروں کو اور رہنے دیں گے ظالموں کو دوزخ میں کہ وہ گھٹنوں کے بل گرے ہوں

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 504 (العلمیة)

گے۔ ل‘‘

ل ننجی کا عطف سابق کلام کے مضمون پر ہے۔ تقدیر عبارت یوں ہوگی نورد کم جمیعاً فی جھنم ثم ننجی۔ یعنی ہم تم تمام کو جہنم میں داخل کریں گے پھر متقین کو نکال لیں گے۔ کسائی نے ننجی کو باب افعال سے تخفیف کے ساتھ اور باقی قراء نے باب تفعیل سے تشدید کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی جو لوگ شرک سے بچتے رہے انہیں جنت کی طرف لے جایا جائے گا بغیر کسی عذاب کے یا نافرمانیوں کا عذاب جھیلنے کے بعد۔ لیکن کافروں کو دوزخ میں گھٹنوں پر رہنے دیا جائے گا۔ جثیا کا معنی بعض علماء نے جمیعاً اور بعض نے گھٹنوں کے بل کیا ہے اور ورود سے مراد دخول ہے اگرچہ وہ دخول پل صراط کے اوپر سے گزرنے کے ساتھ ہو۔ پل صراط جہنم کے اوپر ہے' کچھ بدعتی لوگ کہتے ہیں کہ ورود سے مراد دخول نہیں ہے کیونکہ جو ایک مرتبہ دوزخ میں داخل ہوگا وہ کبھی باہر نہیں نکلے گا اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ مومن جہنم میں کبھی داخل نہ ہوگا کیونکہ ارشاد ربانی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنَىٰ أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ ۝ لَا يَسْمَعُونَ حَسِيسَهَا ۖ۔ (بلاشبہ وہ لوگ جن کے لئے مقدر ہو چکی ہے ہماری طرف سے بھلائی تو وہی اس جہنم سے دور رکھے جائیں گے وہ اس کی آہٹ بھی نہ سنیں گے۔) بلکہ یہاں ورود سے مراد حاضر ہونا اور دیکھنا ہے کیونکہ سب لوگ حساب کی جگہ جمع ہوں گے اور وہ جگہ جہنم کے قریب ہوگی۔ اور اسی حساب کی جگہ سے متقین کو جنت کی طرف جانے کا حکم ہوگا اور ظالموں کو دوزخ کی طرف جانے کا آرڈر ہوگا اور ورود کا معنی قریب ہونا۔ قرآن میں اور جگہ بھی استعمال ہوا ہے، ارشاد ہے لَمَّا وَرَدَ مَاءَ مَدْيَنَ۔ موسیٰ علیہ السلام پانی کے قریب تھے، اندر داخل نہیں ہوئے تھے لیکن پھر بھی ان کے لئے ورود کا لفظ استعمال ہوا ہے اور ورود بمعنی حضور اور رویت کی تائید وہ حدیث طیبہ بھی کرتی ہے جو احمد' ابو یعلی اور طبرانی نے ایک ایسی سند سے روایت کی ہے جس میں کوئی حرج نہیں ہے' حضرت معاذ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص خوشی سے' کسی حاکم کے حکم سے نہیں' مجاہدین کی نگہبانی کرتا ہے، وہ دوزخ کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھے گا مگر قسم پوری کرنے کے لئے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَإِن مِّنكُمْ إِلَّا وَارِدُهَا (اور تم سے کوئی ایسا نہیں مگر اس کا گزر دوزخ پر ہوگا)

ہم اہلسنت و جماعت کہتے ہیں کہ ورود کا حضور' قریب اور رویت کے معنی میں استعمال جائز ہے لیکن ضرورت کے وقت، جبکہ یہاں اصل معنی دخول کو چھوڑ کر ان معانی میں استعمال کرنے کی کوئی مجبوری نہیں ہے۔ بدعتیوں کی تاویل کا قرآنی ارشاد ثم ننجی الذین اتقوا الخ بھی تردید کرتا ہے کیونکہ مومنین کا نکالنا اور ظالموں کو اس میں رہنے دینا دخول کے بعد ہو سکتا ہے اور حدیث میں عدم دخول پر کوئی دلیل نہیں ہے کیونکہ حدیث قسم پوری کرنے کی مقدار رویت کو ثابت کرتی ہے۔ دخول کی نفی نہیں کرتی' باقی رہا أُولَٰئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُونَ تو اس کا معنی یہ ہے کہ داخل ہونے کے بعد وہ دوزخ سے دور کئے جائیں گے اور دور ہونے کی وجہ سے اس کی آواز کو نہ سنیں گے اور بعض علماء یہ فرماتے ہیں کہ وہ دوزخ میں داخل ہونے کے وقت بھی اس کی آہٹ کو نہیں سنیں گے کیونکہ اللہ تعالیٰ ان پر دوزخ کی آگ کو ٹھنڈا اور سلامتی والی بنا دے گا۔

ہناد' طبرانی اور بیہقی نے خالد بن معدان سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب جنتی جنت میں داخل ہو جائیں گے تو عرض کریں گے اے ہمارے رب کیا تو نے ہم سے وعدہ نہیں کیا تھا کہ ہم آگ پر وارد ہوں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے کیوں نہیں لیکن تم اس میں سے گزرے، ہو جبکہ وہ بجھ چکی تھی۔

ابن عدی اور طبرانی نے یعلی بن امیہ سے اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے روایت کیا ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے روز آگ مومن سے کہے گی اے مومن (جلدی سے) گزر جا تیرے نور نے تو میرے شعلوں کو بھسم کر دیا ہے۔ ورود بمعنی دخول (اگرچہ علی سبیل المرور بھی ہو) کی ہماری ایک دلیل امام احمد، حاکم، بیہقی کی حدیث ہے جو انہوں نے ابی سمیہ سے روایت کی ہے۔ فرماتے ہیں ہم ورود کے معنی میں جھگڑ رہے تھے، بعض کہتے کہ مومن دوزخ میں داخل نہ ہوگا، بعض کہتے کہ سب لوگ داخل ہوں گے پھر متقین کو نکال لیا جائے گا۔ میں جابر بن عبداللہ سے ملا، یہ اختلاف ان کے سامنے بیان کیا تو آپ نے اپنے کانوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا میرے یہ کان بہرے ہو جائیں گے اگر میں نے حضور ﷺ سے یہ بات نہ سنی ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا سب نیک بد دوزخ میں داخل ہوں گے لیکن آگ مومن پر ٹھنڈی اور بے ضرر ہو جائے گی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام پر ہوئی تھی حتیٰ کہ آگ مومنین کی ٹھنڈک کی وجہ سے شور مچائے گی الٰہی ان لوگوں کی ٹھنڈک کی وجہ سے میری تمازت ختم ہو رہی ہے پھر اللہ تعالیٰ متقین کو وہاں سے نکال لے گا اور کافر وہاں گھٹنوں کے بل پڑے رہیں گے (1)۔

امام بغوی نے نقل کیا ہے کہ ابن عیینہ نے عمرو بن دینار سے روایت کیا ہے کہ نافع بن الازرق نے ابن عباس سے ورود کے معنی میں اختلاف کیا ہے۔ ابن عباس نے ورود کا معنی دخول کیا اور نافع نے کہا ورود کا معنی دخول نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت میں سب کے دخول کا ذکر نہیں ہے پھر فرمایا اے نافع، ہم سب اس آگ پر وارد ہوں گے اور مجھے امید ہے کہ اللہ تعالیٰ مجھے اس آگ سے نکال لے گا اور میرا خیال ہے کہ تجھے نہیں نکالے گا کیونکہ تو اس کو جھٹلاتا ہے (2)۔ سعید بن منصور، عبدالرزاق، ابن جریر، ابن ابی حاتم اور بیہقی نے مجاہد سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت ابن عباس نے اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ ؕ اَنْتُمْ لَهَا وٰرِدُوْنَ تلاوت فرمائی اور فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ پھر یہ آیت پڑھی يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ۔ پھر فرمایا کیا اس آیت کے مطابق سب داخل ہوں گے یا نہیں۔ میں اور تم سب داخل ہوں گے پھر میں دیکھوں گا کہ تو نکلتا ہے یا نہیں۔

العوفی کے طریق سے ابن عباس سے مروی ہے کہ وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا سے مراد یہ ہے کہ فاسق و فاجر سب داخل ہوں گے۔ کیا تم نے یہ ارشاد الٰہی سماعت نہیں فرمایا۔ فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ اسی طرح ارشاد ہے۔ وَنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا (اور اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح) (3)۔ حاکم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے کہ آپ سے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کا مفہوم پوچھا گیا تو آپ نے فرمایا وان منکم الا داخلها۔ یعنی ورود کا معنی دخول ہے۔ بیہقی نے عن عکرمہ عن ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کی ہے کہ حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما نے اس آیت کے تحت فرمایا لا یبقیٰ احد الا دخلها۔ یعنی ہر شخص آگ میں داخل ہوگا۔ سابقہ آیات اور صحابہ اور مفسر تابعین کے ارشاد سے ثابت ہوتا ہے کہ ورود بمعنی دخول ہے۔ امام احمد، ترمذی، حاکم اور بیہقی نے ابن مسعود سے اس ارشاد وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا کے متعلق روایت فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے پھر وہ اپنے اعمال کے مطابق اس سے گزریں گے۔ پہلا طبقہ بجلی کی چمک کی طرح تیزی سے گزر جائیگا، دوسرا ہوا کی طرح، تیسرا گھوڑے کی تیز رفتاری سے، چوتھا اونٹ کی رفتار سے اور اس کے بعد والا تیز پیدل چلنے والے شخص کی تیزی سے گزر جائیگا۔ (4)

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العلمیۃ)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 206 (التجاریۃ)
3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 505 (العلمیۃ)
4۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 494 (قدیمی)

ابن ابی حاتم نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں تمام لوگ آگ پر وارد ہوں گے اور ان کا ورود آگ کے اردگرد قیام ہے پھر وہ پل صراط سے اپنے اعمال کے مطابق تیزی سے گزریں گے، بعض بجلی کی مانند' بعض ہوا کی مانند' بعض پرندے کی مانند' بعض تیز گھوڑے کی مانند' بعض تیز اونٹ کی مانند' بعض تیز چلنے والے شخص کی مانند گزریں گے۔ حتیٰ کہ آخری شخص جو گزرے گا اسکا نور اسکی قدموں کے انگوٹھوں کی جگہ تک ہوگا اور وہ پل صراط سے ڈگمگا کر گزرے گا۔ امام بخاری و مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے فرماتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس مسلمان کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں وہ قسم پوری کرنے کی مقدار دوزخ میں داخل ہوگا(1) پھر راوی حدیث حضرت سفیان نے بطور دلیل قرآن کا یہ ارشاد پڑھا وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا۔

طبرانی نے عبد بن بشیر الانصاری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جس شخص کے تین بچے فوت ہو جاتے ہیں جو ابھی بالغ نہیں ہوئے تھے تو وہ شخص راہ گیر کی طرح دوزخ پر وارد ہوگا، یعنی پل صراط سے مسافر آدمی کی طرح گزر جائیگا ٹھہرے گا نہیں۔

ابن جریر نے غنیم بن قیس سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں لوگوں نے آگ پر وارد ہونے کا ذکر کیا تو حضرت کعب نے فرمایا آگ تمام لوگوں کو روک لے گی حتیٰ کہ سب فاسق و فاجر کے قدم اس پر برابر تک جائیں گے پھر ایک ندا کرنے والا ندا دے گا (اے آگ) اپنے ساتھیوں کو روکے رکھ اور میرے ساتھیوں کو چھوڑ دے، ہر دوزخ کا دوست اس میں دھنس جائے گا اور دوزخ اپنے ساتھیوں کو اس طرح پہچانتی ہوگی جیسے مرد اپنے بچے کو پہچانتا ہے۔ مومنین اپنے تر کپڑوں کے ساتھ نکل آئیں گے۔ (یعنی مومنین کو آگ کی اتنی تپش بھی نہیں لگے گی کہ ان کے کپڑے خشک ہو جائیں)

امام سیوطی فرماتے ہیں بعض علماء اہلسنت نے ورود کی تفسیر دخول سے کی ہے اور اس آیت کے متعلق مروی اقوال میں سے ایک یہ قول بھی ہے۔ اسی کو علامہ قرطبی نے ترجیح دی ہے اور حضرت جابر کی حدیث مذکور سے استشہاد کیا ہے۔ بعض مفسرین نے اس سے مراد پل صراط سے گزرنا لیا ہے۔ امام نووی نے اسی قول کو ترجیح دی ہے اور انہوں نے ابن مسعود کی روایت کو ترجیح دی ہے جس میں صراط پر گزرنے کا ذکر ہے۔ اسی طرح حضرت ابی ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث کو بھی بطور دلیل پیش کیا ہے۔

میں کہتا ہوں جب پل صراط جہنم کے اوپر ہے تو اس سے گزرنا دخول کو لازم ہے، دخول آگ میں یقینی وقوع کا تقاضا نہیں کرتا۔ اسی وجہ سے میں کہتا ہوں ورود سے مراد دخول ہے اگرچہ بطریق مرور (گزرنا) ہو کیونکہ اس مفہوم کے اعتبار سے تمام احادیث کا معنی جمع ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ حضرت حسن کا قول ہے کہ ورود کا معنی داخل ہوئے بغیر اس کے اوپر سے گزرنا ہے جیسا کہ بیہقی نے ان سے نقل کیا ہے تو میں اس کے جواب میں، میں کہوں گا کہ حضرت حسن کے قول میں دخول بمعنی وقوع اور دوزخ میں ٹھہرنا ہے۔ مطلق دخول مراد نہیں ہے۔

حضرت ہناد نے حضرت حفصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے اسی طرح نقل کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے امید ہے کہ جو افراد جنگ بدر اور یا حدیبیہ میں شریک ہوئے ان میں سے کوئی دوزخ میں داخل نہ ہوگا۔ فرماتی ہیں میں نے عرض کی یا رسول اللہ ﷺ کیا اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے وَاِنْ مِّنْكُمْ اِلَّا وَارِدُهَا الخ۔ آپ ﷺ نے فرمایا کیا تو نے یہ ارشاد نہیں سنا ثُمَّ نُنَجِّی الَّذِیْنَ اتَّقَوْا وَّنَذَرُ الظّٰلِمِیْنَ فِیْهَا جِثِیًّا(2)۔ اس

1۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 330 (قدیمی) 2۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2242 (ابن حزم)

میں عدم دخول سے مراد عدم وقوع اور عدم استقرار ہے کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا گیا تم نے یہ نہیں سنا ثم ننجی الذین الخ۔ یہ جواب صراحۃً دلالت کرتا ہے کہ عدم دخول سے مراد عدم استقرار ہے جو نجات کا مفاد ہے امام سیوطی فرماتے ہیں۔ اکثر سلف صالحین ورود کی تحقیق اور صدور کے احتمال سے ڈرتے تھے (یعنی دوزخ میں ورود (دخول) تو یقینی ہے لیکن نکلنا محتمل ہے۔ اس لئے وہ ہر وقت لرزاں و ترساں رہتے تھے۔)

ہناد اور احمد نے الزہد میں سعید بن منصور، حاکم اور بیہقی نے حضرت حازم بن ابی حازم رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ رونے لگے۔ بیوی نے پوچھا میرے سرتاج کیوں رو رہے ہو۔ فرمایا مجھے یہ تو خبر دی گئی ہے کہ میں نے آگ پر وارد ہونا ہے لیکن مجھے یہ خبر نہیں ملی کہ میں نے وہاں سے نکلنا بھی ہے؟

ہناد اور بیہقی نے ابو اسحٰق سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ابو میسرہ عمرو بن شرجیل اپنے بستر کی طرف اٹھے اور فرمایا کاش میری ماں نے مجھے جنم نہ دیا ہوتا۔ ان کی بیوی نے کہا کیوں؟ فرمایا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آگ پر وارد ہونے کی خبر دی ہے لیکن یہ خبر نہیں دی کہ ہم اس سے نکلنے والے بھی ہیں (1)۔

احمد نے الزہد میں حضرت الحسن سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں ایک شخص نے اپنے بھائی سے کہا کیا تیرے پاس یہ خبر پہنچی ہے کہ تو آگ پر وارد ہوگا۔ بھائی نے کہا ہاں۔ پھر پہلے بھائی نے پوچھا کیا تیرے پاس یہ خبر بھی آئی ہے کہ تو اس سے نکل بھی آئیگا۔ دوسرے بھائی نے کہا نہیں۔ پہلے بھائی نے کہا پھر تو ہنستا کس لئے ہے، اس کے بعد اس شخص کو مرتے وقت تک ہنستے ہوئے نہیں دیکھا گیا (2)۔

وَ اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ قَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا ۙ اَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ خَيْرٌ مَّقَامًا وَّ اَحْسَنُ نَدِيًّا ۝

"اور جب تلاوت کی جاتی ہیں ان کے سامنے ہماری آیتیں وضاحت سے [1] تو کافر کہتے ہیں ایمان والوں سے [2] کہ (یہ تو بتاؤ) ہم دونوں گروہوں میں سے کس کی رہائش گاہ آرام دہ ہے اور کس کی نشست گاہ خوبصورت ہے۔ [3]"

1۔ علیہم کا مرجع کفار ہیں یہ جملہ فخلف من بعدھم پر یا یقول الانسان پر معطوف ہے۔ آیات بینات کا مفہوم یہ ہے کہ یہ آیات خود بخود واضح ہیں یا رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بیان اور تفسیر کی وجہ سے اپنے معانی پر واضح دلالت کرتی ہیں یا یہ معنی کہ اپنے اعجاز کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی صداقت پر واضح دلالت کرتی ہیں۔

2۔ الذین کفروا سے مراد نضر بن حارث اور اس جیسے ہٹ دھرم دوسرے قریش ہیں، یعنی کفار کو آیت قرآنی کے ذریعے جب دعوت حق دی جاتی تو وہ غریب و نادار مسلمانوں سے کہتے، ذرا دیکھو تو سہی مومنین اور کافروں میں سے کن کی بود و باش اچھی ہے اور محفل کن کی پر رونق ہیں، غریب مسلمان سخت زندگی بسر کرتے تھے۔ کپڑے بھی پھٹے پرانے پہنتے تھے، جبکہ مشرکین اپنے بالوں کو کنگھی کرتے، سر پر تیل لگاتے اور بہتر کپڑے پہنتے تھے تو وہ اس عیش و طرب کی زندگی پر فخر کرتے ہوئے مومنین سے یہ سوال کرتے تھے۔

3۔ ابن کثیر نے مقاما کو میم کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ ظرف ہے یا باب افعال سے مصدر ہے اور باقی قراء نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ قیام سے ظرف ہے۔ ندیا کا معنی محفل اور مجمع ہے۔ جب کفار نے واضح آیات سنیں اور پھر ان کا

1۔ تفسیر ابن کثیر، جلد 5، صفحہ 2240 (ابن حزم) 2۔ ایضاً، صفحہ 41-240

جواب دینے اور چیلنج قبول کرنے سے عاجز آگئے تو انہوں نے دنیا کی عیش وعشرت کو باعث افتخار قرار دیا اور کہتے کہ ہمارے پاس جو آرام وآرائش اور دولت وثروت ہے یہ دلیل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بھی ہماری فضیلت ہے اور ہمارے لئے اس کی بارگاہ میں عمدہ ٹھکانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کفار کی ان ڈینگوں کا رد کرتے ہوئے ذیل کا یہ ارشاد نازل فرمایا۔

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَحْسَنُ اَثَاثًا وَّرِءْيًا ﴿٧٤﴾

''اور (ان احمقوں نے یہ نہ سوچا) کہ کتنی قومیں ان سے پہلے تھیں جن کو ہم نے برباد کر دیا وہ ساز وسامان اور ظاہری سج دھج میں (ان سے) بہتر تھیں۔ ۱''

۱ کم خبریہ ہے اور اھلکنا کا مفعول ہونے کی حیثیت سے منصوب ہے من قرن 'کم کی تمیز ہے۔ ہر زمانہ کے لوگوں کو قرن کہا جاتا ہے کیونکہ وہ زمانہ میں باہم ملے ہوئے ہوتے ہیں۔ علامہ بغوی نے اثاثا کا معنی ساز وسامان اور اموال کیا ہے۔ مقاتل نے کپڑے اور لباس کیا ہے (1)۔ قاموس میں اثاث کا معنی متاع البیت گھر کا سامان لکھا ہے اور فرمایا اس صورت میں یہ بغیر واحد کے ہوگا اور اس کا معنی مال ہو تو پھر یہ جمع ہوگا اور اس کا واحد اثاثه ہوگا(2)۔ اثاثا اور رءیا دونوں احسن کی نسبت سے تمیز ہیں اور ضمیر کا مرجع قرن ہے یعنی ان لوگوں کا مال ومتاع ظاہری سج دھج بہتر تھی۔ رئیا کو قالون اور ابن ذکوان نے یاء کی تشدید کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ ہمزہ یاء سے بدلا گیا پھر یاء کو یاء میں ادغام کیا گیا ہے۔ یا یہ ری سے مشتق ہے۔ جو عطش (پیاس) کی ضد ہے اور اس کا معنی نعمت سے سیر ہونا ہے۔ جمہور نے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اس صورت میں اس کا معنی خوش منظر ہے۔ حمزہ نے ھمزہ کے ابدال کے ساتھ وقف کیا ہے اور قالون کی موافقت کی ہے۔ ھم احسن کا جملہ قرن کی صفت ہے۔

قُلْ مَنْ كَانَ فِي الضَّلٰلَةِ فَلْيَمْدُدْ لَهُ الرَّحْمٰنُ مَدًّا ۚ حَتّٰٓى اِذَا رَاَوْا مَا يُوْعَدُوْنَ اِمَّا الْعَذَابَ وَاِمَّا السَّاعَةَ ؕ فَسَيَعْلَمُوْنَ مَنْ هُوَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضْعَفُ جُنْدًا ﴿٧٥﴾

''آپ فرمایئے جو گمراہی میں (گمن) ہو تو ڈھیل دیئے رکھتا ہے اسے رحمٰن لمبی ڈھیل ۱ یہاں تک کہ جب دیکھیں گے وہ چیز جس کا وعدہ کیا گیا ہے یعنی عذاب یا قیامت تو اس وقت انہیں پتہ چلے گا کہ کون مکان کے لحاظ سے برا اور لشکر کے اعتبار سے کمزور ہے۔ ۲''

۱ فلیمدد امر کا صیغہ ہے لیکن بمعنی خبر ہے۔ نیز امر کا صیغہ وارد کرنے میں اس بات کا شعور دلاتا ہے کہ مہلت ایسی چیز ہے جو رحمٰن کو عطا کرنی چاہئے تاکہ کافروں کا کوئی عذر باقی نہ رہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَوَلَمْ نُعَمِّرْكُمْ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيْهِ مَنْ تَذَكَّرَ۔ (کیا ہم نے تمہیں اتنی لمبی عمر نہیں دی تھی جس میں (بآسانی) نصیحت قبول کر سکتا جو نصیحت قبول کرنا چاہتا)

اما العذاب اور اسکا معطوف ما یوعدون سے بدل ہیں اور اجمال کی تفصیل ہیں عذاب سے مراد دنیا میں قیدی ہونا اور قتل ہونا ہے اور الساعة سے مراد آخرت کا عذاب ہے۔ یہ فلیمدد کی غایت ہے یا قال الذین کفرو اللذین امنوا ای الفریقین الخ کی غایت ہے۔

۲ قیامت کے روز جب عذاب الٰہی کو دیکھیں گے یا دنیا میں قتل اور قید کو دیکھیں گے تو انہیں معلوم ہوگا کہ کون مکان کے لحاظ برا ہے اور کون لشکر کے لحاظ سے کمزور ہے۔ شیاطین کافروں کے لشکر ہیں اور مومنین کے معاون ولشکر فرشتے ہیں۔ فسیعلمون کا جملہ جواب

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (التجاریۃ)
2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 263 (التراث العربی)

شرط ہے اور یہ کلام مشرکین کے قول کا رد ہے جو انہوں نے کہا تھا۔ اَیُّ الْفَرِیْقَیْنِ خَیْرٌ مَّقَامًا وَ اَحْسَنُ نَدِیًّا۔ اللہ تعالیٰ نے خیر مقاما کے مقابلہ میں شر مکاناً اور احسن ندیا کے مقابلہ میں اضعف جندا فرما کر ان کا رد فرما دیا۔ مجلس کا حسن اور رونق لوگوں کے اجتماع سے ہوتی ہے اور ان کی شان و شوکت کے اظہار سے ہوتی ہے لیکن جب معاونین کم ہوں گے تو رونق و محبت بھی کم ہوگی۔

وَ يَزِيْدُ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اهْتَدَوْا هُدًى ؕ وَ الْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّ خَيْرٌ مَّرَدًّا ﴿۷۶﴾

"اور زیادہ کرتا رہتا ہے اللہ تعالیٰ ہدایت یافتہ لوگوں (کے نور) ہدایت کو۔[1] اور باقی رہنے والی نیکیاں بہتر ہیں آپ کے رب کے نزدیک ثواب کے اعتبار سے اور انہیں کا انجام اچھا ہے۔[2]"

[1] یعنی اللہ تعالیٰ اپنے مخلص بندوں کے ایمان میں تقویت اور اضافہ فرماتا ہے اور انہیں ان کے مقاصد عالیہ تک پہنچا دیتا ہے اور ان نفوس قدسیہ کا مطمح نظر (مال و جاہ کا حصول نہیں) بلکہ قرب الٰہی ہوتا ہے۔ اس جملہ کا عطف قل کے بعد والے جملہ شرطیہ من کان فی الضلالۃ الخ کے مضمون پر ہے۔ یعنی کافروں کو ڈھیل دینا اور دنیا کے سامان عیش و طرب سے انہیں لطف اندوز کرنا اللہ کی بارگاہ میں ان کی فضیلت کی وجہ سے نہیں ہے اور مومنین کے پاس دنیا کا مال و متاع کم ہونا اللہ کی بارگاہ میں ان کے مرتبہ کی کمی کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں دنیا کا مال کم عطاء فرمایا تاکہ ان کے ثواب میں اضافہ کرے ان کے درجات کو بلند فرمائے اور انہیں اپنے قرب کی نعمت عظمیٰ سے سرفراز فرمائے۔

بعض علماء فرماتے ہیں اس جملہ کا عطف فلیمدد پر ہے کیونکہ وہ خبر کے معنی میں ہے۔ تقدیر عبارت گویا اس طرح ہوگی جو گمراہ ہوتا ہے اللہ اس کی گمراہی میں اضافہ فرماتا ہے اور جن سے وہ گمراہ دشمنی رکھتا ہے (یعنی مومنین) ان کی ہدایت میں اضافہ فرماتا ہے۔

[2] الباقیات الصالحات سے مراد اذکار اور اعمال صالحہ ہیں جن کا فائدہ ہمیشہ نیکوکار کو ملتا رہتا ہے۔ فرمایا یہ فائدہ بہتر ہے اس دنیوی مال و متاع سے جس سے کافر متمتع ہوتے ہیں اور فخر سے پھولے نہیں سماتے اور انجام کے اعتبار سے بھی نیک اعمال بہتر ہیں۔ یہاں خیر کا لفظ صرف زیادتی کے معنی میں ہے یہ عربوں کے اس قول کے مطابق ہے۔ الصیف احر من الشتاء یعنی گرمیوں میں گرمی سردیوں میں سردی کی نسبت زیادہ ہے۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت خباب بن الارت سے روایت فرمایا ہے، آپ فرماتے ہیں میں لوہاروں کا کام کیا کرتا تھا۔ عاص بن وائل کے ذمہ میری کچھ رقم تھی میں اس سے مانگنے کے لئے گیا تو اس نے کہا بخدا میں یہ رقم اس وقت ادا کروں گا جب تو محمد (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرے گا۔ میں نے کہا بخدا میں ان کی نبوت کا انکار نہیں کروں گا یہاں تک کہ تو مر جائے پھر تجھے قیامت کے روز اٹھایا جائے۔ اس نے کہا مرنے کے بعد میں قبر سے اٹھایا جاؤں گا۔ میں نے کہا ہاں (تجھے اٹھایا جائے گا) وہ گستاخ کہنے لگا اس وقت میرے پاس مال اور اولاد کی فراوانی ہوگی، میں وہاں تیرا قرض ادا کروں گا۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ذیل کی آیت نازل فرمائی (1)۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ كَفَرَ بِاٰيٰتِنَا وَ قَالَ لَاُوْتَيَنَّ مَالًا وَّ وَلَدًا ﴿۷۷﴾

"کیا آپ نے دیکھا اس کو جس نے انکار کیا ہماری آیتوں کا اور کہنے لگا کہ مجھے ضرور ضرور دیا جائے گا مال اور اولاد۔[1]"

1۔ صحیح بخاری، جلد 2، صفحہ 36 (دار المعرفت بیروت)

لہ چونکہ رؤیت (دیکھنا) کسی خبر کے لئے قوی ترین ذریعہ ہے اس لئے ارایت کو اخبرنی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہے یا مخاطب غیر معین ہے۔ رایت کا کلمہ فاء کے ساتھ ذکر فرمایا ہے یہ محذوف کلام پر معطوف ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اوقع نظرک فرایت۔ الذی کفر سے مراد العاص بن وائل ہے۔ قال کا عطف کفر پر ہے۔ حمزہ اور کسائی نے ولداً کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے دونوں کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں یہ دونوں لغتیں ہیں جیسے عرب عرب، عجم عجم۔ بعض علماء فرماتے ہیں واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ ہو تو جمع ہے اور دونوں فتحہ کے ساتھ ہوں تو مفرد ہے۔ جیسے اسد اور اسد۔

اَطَّلَعَ الْغَيْبَ اَمِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۷۸﴾

''(اس لاف زنی کی وجہ کیا ہے) کیا وہ آگاہ ہو گیا ہے غیب پر لہ یا لے لیا ہے اس نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ ۲ے''

لہ یہ جملہ بتاویل مفرد ہو کر ارایت کا مفعول ثانی ہے اطلعه یہاں اطلع الجبل کے قبیل سے ہے جس کا معنی پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ جانا ہے یعنی کیا یہ اتنا بلند ہو گیا ہے کہ غیب پر مطلع ہو گیا ہے۔ ہمزہ استفہام ذکر کیا گیا ہے اور باب افتعال کے ہمزہ وصلی کو حذف کیا گیا ہے (یعنی اطلع سے پہلے ہمزہ مفتوحہ ہمزہ استفہام ہے) ابن عباس فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ اس نے لوح محفوظ کو دیکھ لیا ہے' مجاہد فرماتے ہیں کیا اس نے علم غیب جان لیا ہے(1) کہ وہ آخرت میں مال اور اولاد ملنے کا دعویٰ کرتا ہے۔

۲ے یا اس نے خداوند رحمٰن سے کوئی عہد لیا ہے۔ یعنی کیا اس نے لا الہ الا اللہ کہا ہے۔ قتادہ فرماتے ہیں کوئی اس نے نیک عمل کیا ہے۔ کلبی کہتے ہیں کیا اللہ سے اس نے عہد لیا ہے کہ وہ اسے جنت میں داخل کرے گا(2)۔

كَلَّا ۚ سَنَكْتُبُ مَا يَقُوْلُ وَ نَمُدُّ لَهٗ مِنَ الْعَذَابِ مَدًّا ﴿۷۹﴾

''ہرگز ایسا نہیں۔ ہم لکھ لیں گے جو یہ کہہ رہا ہے لہ اور لمبا کر دیں گے اس کے عذاب کو خوب لمبا کرنا ۲ے''

لہ سنکتب کا معنی ہم محفوظ کر لیں گے یا ہم اس کی بات کو ظاہر کریں گے کہ ہم نے اس کی بات کو لکھا ہوا ہے یا یہ معنی کہ ہم نے جو اس کا قول لکھا ہے اس سے اس کا انتقام لیں گے۔ یہ تاویلات کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نفس کتابت' قول (بات) سے متاخر نہیں ہوتا (بلکہ جونہی وہ منہ سے بات کرتا ہے لکھ لی جاتی ہے) کیونکہ ارشاد ہے مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ۔ (سین جو مستقبل میں کسی کام کے کرنے پر دلالت کرتا ہے اس کو نکتب پر داخل کرنے کی پہلی وجہ بیان فرمائی کہ سین صرف کتابت کے ظہور اور اس کی وضاحت کرنے کے لئے ہے اور دوسرا معنی کر کے یہ ظاہر فرمایا کہ یہاں مجازی معنی کا استعمال ہوا ہے۔ سبب بول کر مسبب مراد لیا گیا ہے۔)

انسان کے اعمال کراماً کاتبین لکھتے ہیں یہاں لکھنے کی نسبت اپنی طرف فرمائی اس کی وجہ یہ ہے کہ فرشتے اللہ کے حکم سے لکھتے ہیں۔

۲ے کفر کی وجہ سے جس عذاب کا مستحق تھا اب اس بکواس کی وجہ سے ہم اس کے عذاب میں مزید اضافہ کر دیں گے۔

وَّ نَرِثُهٗ مَا يَقُوْلُ وَ يَاْتِيْنَا فَرْدًا ﴿۸۰﴾

''اور ہم ہی وارث ہوں گے جو وہ کہتا ہے (یعنی اس کے مال و اولاد کے) اور وہ ہمارے پاس تنہا آئے گا لہ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 210 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

لے یعنی ہم اس گستاخ کو ہلاک کر دیں گے اور اس کی جھوٹی ملکیت کو باطل کر دیں گے اور قیامت کے دن جب زنجیروں میں جکڑا ہوا ہمارے پاس آئے گا تو اس کے پاس نہ مال ہوگا، نہ اس کے ساتھ اولاد ہوگی' تن تنہا ہوگا' چہ جائیکہ اسے وہاں مزید ملے گا سنکتب اپنے معطوف سے مل کر علت ہے اس زجر و توبیخ کی جو کلا سے مستفاد ہے۔

وَاتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اٰلِهَةً لِّيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا ﴿٨١﴾

''اور انہوں نے بنا لئے ہیں اللہ کے سوا اور خدا کہ وہ ان کے لئے مددگار بنیں۔ لے''

1۔ یعنی کفار قریش نے بتوں کو خدا بنا رکھا ہے تا کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کے مددگار بنیں وہ ان کو وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔

كَلَّا ۭ سَيَكْفُرُوْنَ بِعِبَادَتِهِمْ وَيَكُوْنُوْنَ عَلَيْهِمْ ضِدًّا ﴿٨٢﴾

''ہرگز نہیں وہ جھوٹے خدا انکار کر دیں گے ان کی عبادت کا لے اور وہ (الٹے) ان کے دشمن ہو جائیں گے ع''

1۔ کلا ان کی بات کو رد کرنے کے لئے آیا ہے کہ وہ قیامت کے روز ان کی کچھ معاونت نہ کریں گے، وہ بت اس مشکل گھڑی میں ان مشرکوں کی عبادت کا انکار کر دیں گے اور ان سے براءت کریں گے اور کہیں گے تَبَرَّاْنَآ اِلَيْكَ ۡ مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ۔ (ہم (ان سے) بیزار ہو کر تیری طرف متوجہ ہوتے ہیں اور وہ ہماری پوجا نہیں کیا کرتے تھے) یا یہ مطلب کہ کفار بتوں کی عبادت سے بالکل مکر جائیں گے اور کہیں گے وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِيْنَ (اللہ کی قسم جو ہمارا رب ہے نہ تھے ہم شرک کرنے والے)

ع وہ بت کفار کی ذلت اور رسوائی کا باعث بنیں گے کیونکہ ذلت و رسوائی' عزت کی ضد ہے، اس لئے یہاں عزاً کے مقابلہ میں ضدًا آیا ہے اس لئے یہاں اس کا معنی ذلت و رسوائی ہوگا۔ یہ تاویل پہلی تاویل کی تائید کرتی ہے یا یہ معنی کہ وہ بت ان کے مخالف ہو جائیں، یعنی وہ ان کے دشمن بن جائیں گے اور ان کی تکذیب کریں گے اور ان پر لعنت بھیجیں گے یا کفار کو عذاب دلانے میں مددگار بنیں گے اس طرح کہ پتھر کے بنے ہوئے بتوں کو آگ میں ڈال کر بھڑکایا جائے گا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یکونون میں ضمیر کفار کے لئے ہو اور علیہم کی ضمیر بتوں کے لئے ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ کافر اپنے بتوں کے منکر ہو جائیں گے اور دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہنے کے بعد قیامت کے روز ان کی عبادت سے انکاری ہو جائیں گے۔

ضد کے لفظ کا واحد ہونا معنی کی وحدت کی وجہ سے ہے، یعنی وہ مخالفت میں ایک چیز ہوں گے۔ جس طرح حضور ﷺ نے فرمایا وَهُمْ يَدٌ عَلٰى مَنْ سِوَاهُمْ۔ وہ مخالف کے سامنے ایک ہاتھ ہیں۔ اس حدیث کو ابوداؤد اور ابن ماجہ نے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ کی سند سے روایت کیا ہے۔ ابوداؤد اور نسائی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے اور ابن حبان نے حضرت ابن عمر سے روایت کیا ہے۔ قاموس میں ہے کہ ضد جمع بھی استعمال ہوتا ہے(1)۔ جیسے اس ارشاد میں ہے ویکونون علیھم ضداً۔

اَلَمْ تَرَ اَنَّآ اَرْسَلْنَا الشَّيٰطِيْنَ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ تَؤُزُّهُمْ اَزًّا ﴿٨٣﴾

''کیا آپ نے ملاحظہ نہیں کیا کہ ہم نے مسلط کر دیا ہے لے شیطانوں کو کفار پر لے وہ انہیں (اسلام کے خلاف) ہر وقت اکساتے رہتے ہیں ع''

لے استفہام انکاری ہے اور نفی کا انکار اثبات ہوتا ہے تو معنی یہ ہوگا کہ ہم نے کافروں پر شیطانوں کو مسلط کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 430 (التراث العربی)

ہے وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ۔ (اور جو شخص (دانستہ) اندھا بنتا ہے رحمٰن کے ذکر سے تو ہم مقرر کر دیتے ہیں اس کے لئے ایک شیطان پس وہ ہر وقت اس کا رفیق رہتا ہے) امام بغوی فرماتے ہیں اس ارشاد سے اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاسْتَفْزِزْ مَنِ اسْتَطَعْتَ مِنْهُمْ بِصَوْتِكَ۔ (اور گمراہ کرنے کی کوشش کر جن کو تو گمراہ کر سکتا ہے ان میں سے اپنی آواز (کی فسوں کاری) سے یا یہ معنی کہ ہم نے کافروں اور شیطانوں کو آزاد کر دیا ہے کہ وہ آپس میں یارانہ گانٹھیں۔ اس صورت میں یہ ارسلت البعیر سے مشتق ہوگا جس کا معنی ہے میں نے اونٹ کو آزاد کر دیا۔

ۓ وہ شیطان انہیں گناہوں پر اور جھوٹی امیدیں دلا کر بدکاریوں پر اکساتے رہتے ہیں اور نفسانی خواہشات کی پیروی پر برانگیختہ کرتے رہتے ہیں۔ الاز اور الھز کا معنی حرکت دینا ہے۔ توء زھم ازاً پورا جملہ الشیاطین سے حال ہے۔ اس کلام میں حضور نبی کریم ﷺ کو تعجب دلانا ہے کہ دیکھو آیات بینات کے ذریعے حق کے واضح ہونے کے بعد بھی یہ بدبخت کفر پر اڑے ہوئے ہیں اور گمراہی کی عمیق وادی میں سرپٹ دوڑے جا رہے ہیں اور کیسی گستاخانہ باتیں کرتے ہیں۔

فَلَا تَعْجَلْ عَلَيْهِمْ ۖ إِنَّمَا نَعُدُّ لَهُمْ عَدًّا ﴿٨٤﴾

''پس عجلت نہ کیجئے ان پر (نزول عذاب کے لئے) ہم گن رہے ہیں ان کے ایام زندگی کو اچھی طرح[1]''

[1] ان پر آپ نزول عذاب کی بددعا کرنے میں جلدی نہ فرمائیں۔ ہم نے جوان کی عمر متعین کی ہے اس کو ہم شمار کر رہے ہیں ایک ایک دن شمار ہو رہا ہے۔ ان کی زندگی کے ایام محدود ہیں (جونہی وقت مقرر آجائے گا تو اپنے انجام بد کو پہنچ جائیں گے) فلا تعجل پر فاء سببیہ ہے اور انما نعدلھم کا جملہ معللہ ہے یا جملہ مستانفہ ہے اور جملہ الم تر انا ارسلنا الخ واتخذوا من دونہ الھۃ کی تائید اور تقریر ہے۔

يَوْمَ نَحْشُرُ الْمُتَّقِينَ إِلَى الرَّحْمٰنِ وَفْدًا ﴿٨٥﴾

''وہ دن جب ہم اکٹھا کریں گے پرہیزگاروں کو رحمٰن کے حضور میں (معزز و مکرم مہمان بنا کر)[1]''

[1] یوم نحشر المتقین اپنے معطوفات سے مل کر فعل محذوف نفعل بالفریقین ما نفعل کی ظرف ہے یا اذکر کی وجہ سے منصوب ہے یا لا یملکون کے متعلق ہے۔ الی الرحمن سے مراد اللہ تعالیٰ کے عزت و کرامت عطاء کرنے اور اس کی تجلیات کا عکس پڑنے کی جگہ ہے۔ وفداً متقین سے حال ہے اور یہ وافد کی جمع ہے، یعنی جس طرح وفد بادشاہوں کے پاس پوری سج دھج کے ساتھ جاتے ہیں اور بادشاہوں سے عزت و کرامت کے منتظر ہوتے ہیں۔

حاکم، بیہقی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد المسند میں، ابن جریر اور ابن ابی حاتم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے یہ آیت کریمہ پڑھی اور پھر فرمایا قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر نہیں جائیں گے اور نہ انہیں ہانک کر لے جایا جائے گا بلکہ جنت سے ایسی اونٹنیوں کے ذریعے ان کو لایا جائے گا جن کی مثل مخلوق نے پہلے نہ دیکھی ہوں گی۔ ان اونٹنیوں پر کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی مہاریں زبرجد کی ہونگی، وہ تقویٰ کے پیکر ان پر سوار ہو کر آئیں گے اور جنت کے دروازے کھٹکھٹائیں گے (1)۔ امام بغوی نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول اس طرح نقل کیا ہے کہ قسم بخدا متقین اپنے قدموں پر چل کر نہیں آئیں گے بلکہ ایسی

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 508 (العلمیۃ)

اونٹنیوں پر سوار ہو کر آئیں گے جن کے کجاوے سونے کے ہوں گے اور ان کی سواریوں کی زینیں یواقیت کی ہوں گی۔ متقین انہیں چلانے کا ارادہ کریں گے تو وہ چل پڑیں گی، وہ ٹھہرانے کا ارادہ کریں گے تو ٹھہر جائیں گی(1)۔ امام بیہقی نے طلحہ بن ابی طلحہ عن ابن عباس کے طریق سے اس آیت یوم نحشر الخ کا یہ مفہوم نقل کیا ہے کہ ہم متقین کو رحمٰن کے حضور میں سوار کر کے اکٹھا کریں گے (2) اور (ونسوق المجرمین الخ) کا یہ معنی بیان فرمایا ہے کہ ہم مجرموں کو پیاسا ہانک کر لے جائیں گے۔

ابن جریر نے ابی طلحہ عن ابی ھریرہ کے طریق سے وفداً کا یہ معنی نقل کیا ہے کہ ہم انہیں اونٹنیوں پر سوار کر کے لائیں گے۔ ابن ابی حاتم نے عمر بن قیس الملائی سے روایت کیا ہے کہ مومن جب قبر سے اٹھے گا تو اسکا عمل ایک خوبصورت شکل اور انتہائی خوشبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ مومن سے پوچھے گا کیا تو مجھے پہچانتا ہے؟ مومن کہے گا نہیں صرف اتنا جانتا ہوں کہ تیری خوشبو بڑی پاکیزہ ہے اور تیری شکل بڑی دلکش ہے۔ وہ کہے گا میں تیرا عمل صالح ہوں۔ دنیا میں' میں تجھ پر سوار رہا' آج تو مجھ پر سوار ہو جا۔ پھر یہ آیت یوم نحشر المتقین الی الرحمن وفداً تلاوت فرمائی۔ اور جب کافر قبر سے اٹھے گا تو اس کا عمل انتہائی قبیح شکل میں اور انتہائی بری بدبو کے ساتھ اس کا استقبال کرے گا۔ وہ کافر سے پوچھے گا تو مجھے جانتا ہے۔ وہ کہے گا نہیں۔ صرف اتنا معلوم ہے کہ تیری صورت بڑی بھدی اور بدشکل ہے اور بدبو بڑی گندی ہے' وہ کہے گا اسی طرح بات ہے' میں تیرا برا عمل ہوں دنیا میں تو مجھ پر سوار رہا، آج میں تجھ پر سوار ہونگا۔ اور پھر یہ آیت وَهُمْ يَحْمِلُونَ أَوْزَارَهُمْ عَلَىٰ ظُهُورِهِمْ تلاوت فرمائی۔

وَّنَسُوْقُ الْمُجْرِمِيْنَ اِلٰى جَهَنَّمَ وِرْدًا ﴿٨٦﴾

''اور اس روز ہانک کر لائیں گے مجرموں کو جہنم کی طرف پیاسے جانوروں کی طرح لے''

لے علامہ بغوی نے وردا کا معنی پیدل چلنا کیا ہے۔ بعض نے پیاسا کیا ہے، یعنی مجرموں کو ہانک کر جہنم کی طرف لایا جائے گا جبکہ پیاس کی وجہ سے ان کی گردنیں ٹوٹ رہی ہوں گی۔ الورد اس جماعت کو کہتے ہیں جو پانی پر وارد ہوتی ہے اور پانی پر کوئی شخص اس وقت وارد ہوتا ہے جب پیاسا ہوتا ہے(3)۔ ابن عباس نے بھی اس کا معنی عطاشا (یعنی پیاسے) کیا ہے۔

میں کہتا ہوں اللہ تبارک و تعالیٰ نے دونوں فریقوں کا حال بیان فرمایا ہے' ایک فریق کاملین متقین اور انبیاء کرام کا ہے اور دوسرا فریق کفار کا ہے لیکن عام نیکوکاروں اور گنہگار مومنین کا ذکر نہیں فرمایا۔ ان کا ذکر حدیث میں ہے۔ لوگوں میں سے کچھ پیدل جائیں گے وہ عام مومنین ہیں۔ ہم نے تفصیل سے حدیث ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حدیث معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سورۂ بنی اسرائیل میں وَنَحْشُرُهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ عَلَىٰ وُجُوهِهِمْ عُمْيًا وَبُكْمًا وَصُمًّا کے تحت ذکر کی ہے(4)۔

ابوذر کی احادیث میں ہے کہ لوگ تین کیفیتوں میں جمع کیے جائیں گے سوار' پیدل اور مونہوں کے بل۔

امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا لوگ تین طریقوں پر جمع ہوں گے۔ راغبین (رغبت کرنے والے) راہبین (خوفزدہ) اور ایک اونٹ پر دو اور ایک اونٹ پر تین ایک اونٹ پر دس اور باقی لوگوں کو آگ ہانک کر لے جائیگی۔ جہاں وہ دوپہر کو ٹھہریں گے، آگ بھی ان کے ساتھ ٹھہرے گی اور جہاں وہ رات گزاریں گے، وہ آگ بھی ان کے ساتھ رات گزارے گی(5)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریۃ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 8-507
3۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریۃ) 4۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 484 (قدیمی) 5۔ ایضاً، صفحہ 483

ابن حجر فرماتے ہیں راغبین اور راھبین سے عام مومنین مراد ہیں۔اور جو ایک اونٹ پر دو دو تین تین کا ذکر فرمایا ہے لیکن ایک اونٹ پر ایک شخص کا ذکر نہیں فرمایا یہ اشارہ ہے کہ ایک اونٹ پر ایک سوار وہ ہوں گے جو ابرار ہیں۔امام بیہقی فرماتے ہیں راغبین اشارہ ہے ابرار کی طرف اور راھبین اشارہ ہے ایسے لوگوں کی طرف جو خوف و رجاء کے درمیان ہیں اور جن کو آگ ہانک کر لے جائے گی وہ کفار ہیں۔الحلیمی نے بھی اسی کی مثل تشریح کی ہے لیکن یہ زائد لکھا ہے کہ ابرار سے مراد متقین ہیں جنہیں جنت کی اونٹنیوں پر لایا جائے گا اور وہ اونٹ جن پر خوف و رجاء والے سوار ہوں گے ہوسکتا ہے وہ اونٹ ہوں جن کو قیامت کے دن زندہ کیا جائے گا۔امام سیوطی فرماتے ہیں چونکہ یہ لوگ خوف و رجاء کے بین بین ہوں گے اس لئے انہیں جنت کی اونٹنیوں پر لوٹانا مناسب نہیں ہے اور فرماتے ہیں یہ وہ لوگ ہوں گے حساب کے وقت جن کے گناہ بخش دیئے جائیں گے اور عذاب میں مبتلا نہ ہوں گے۔لیکن وہ لوگ جن کو گناہوں کی وجہ سے عذاب دیا جائے گا، وہ پیدل چلیں گے۔احتمال ہے کہ وہ پیدل چلیں اور سوار نہ ہوں یا پہلے وہ سوار ہوں اور پھر جب محشر کے قریب پہنچیں تو پیدل چلیں۔فرماتے ہیں کفار اپنے مونہوں کے بل چلیں گے۔

طبرانی نے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے،فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا قیامت کے روز انبیاء کرام کو جانوروں پر لایا جائے گا تا کہ وہ اسی حالت میں محشر میں پہنچیں۔نیک آدمی کو اونٹنی پر لایا جائے گا، مجھے براق پر لایا جائے گا، میرے شہزادوں حسن اور حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو جنت کی دو اونٹنیوں پر لایا جائے گا۔اور بلال کو بھی جنت کی اونٹنیوں میں سے ایک اونٹنی پر لایا جائے گا، حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ شہادت کی اذان دیں گے حتیٰ کہ جب اشھد ان محمد رسول اللہ ﷺ کہیں گے تو اولین و آخرین میں سے سب مومنین شہادت دیں گے۔پس جس کی شہادت قبول کی جائے گی اس کی شہادت قبول کی جائے گی جس کی رد ہوگی اس کی رد کی جائے گی۔

نوٹ: حلیمی اور غزالی نے لکھا ہے کہ وہ لوگ جو سوار کر کے لائے جائیں گے وہ اپنی قبور سے سوار ہو کر آئیں گے۔اسماعیلی کا میلان اس طرف ہے کہ وہ موقف کی طرف پیدل چل کر آئیں گے اور پھر وہاں سواریوں پر سوار ہوں گے۔وہ یہ تاویل اس لیے کرتے ہیں تا کہ دونوں قسم کی احادیث جمع ہو جائیں۔صحیحین اور ترمذی کی حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے،فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کھڑے ہوئے اور فرمایا اے لوگو! تم اللہ کی بارگاہ میں ننگے پاؤں، برہنہ بدن، غیر مختون اور پیادہ پا حاضر ہو گے۔پھر آپ ﷺ نے یہ آیت کریمہ پڑھی كَمَا بَدَاْنَاۤ اَوَّلَ خَلْقٍ نُّعِیْدُهٗ۔اور سب سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو لباس پہنایا جائے گا۔

اسی طرح امام بخاری اور مسلم نے حضرت عائشہ سے، طبرانی نے سودہ بنت زمعہ اور ام سلمہ، سہل بن سعد، حسن بن علی رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے اور البزار نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے۔ان احادیث میں آیت کی قرات اور ابراہیم علیہ السلام کو سب سے پہلے لباس پہنائے جانے کا ذکر نہیں ہے اور ان احادیث میں یہ زائد ہے کہ ازواج مطہرات میں سے کسی نے عرض کی حضور! کتنی بری بات ہوگی کہ ہم ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں گے۔آپ ﷺ نے فرمایا لوگ اس چیز سے غافل ہوں گے لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ۔(ہر شخص کو ان میں سے اس اس دن ایسی فکر لاحق ہوگی جو اسے (سب سے) بے پرواہ کردے گی۔

لَا یَمْلِكُوْنَ الشَّفَاعَةَ اِلَّا مَنِ اتَّخَذَ عِنْدَ الرَّحْمٰنِ عَهْدًا ﴿۸۷﴾

''انہیں کوئی اختیار نہیں ہوگا شفاعت کا بجز ان کے جنہوں نے (خداوند) رحمٰن سے کوئی وعدہ لے لیا ہے۔[1]''

لے لا یملکون کی ضمیر عباد کے لئے ہے جن پر دونوں قسموں کا ذکر دلالت کر رہا ہے اور لا یملکون کا جملہ المتقین اور المجرمین سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے، یعنی کوئی شفاعت کرنے کا مالک نہیں ہے مگر ایمان، عمل صالح اور جن کو اللہ تعالیٰ نے اس عظمت کے لئے تیار فرمایا ہے اور جن کو گنہگاروں کی سفارش کا شرف بخشا ہے وہ سفارش کریں گے اور اللہ تعالیٰ ان کی سفارش کو قبول فرمائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے خود ہی ارشاد فرمایا اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ۔ مجھے پکارو میں تمہاری دعا قبول کروں گا) ایک اور مقام پر فرمایا وَ یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَ یَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ۔ (اور وہی قبول کرتا ہے دعائیں ان لوگوں کی جو ایمان لے آئے اور نیک عمل کرتے رہے اور (ان کے حق سے بھی) انہیں زیادہ (اجر) دیتا ہے اپنی مہربانی سے)

ابن صالح حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت فرماتے ہیں اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمانداروں اور عمل صالح کرنے والوں کی ان کے بھائیوں کے حق میں شفاعت قبول فرمائے گا اور یزیدهم من فضله کا مطلب یہ ہے کہ ان پر مزید کرم نوازی ہوگی کہ بھائیوں کی بھی شفاعت قبول فرمائے گا۔ یا یہ معنی کہ وہ سفارش اور شفاعت فرمائیں گے جنہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اذن ہوگا جیسا کہ ارشاد ہے مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗٓ اِلَّا بِاِذْنِهٖ (کون ہے جو سفارش کر سکے اس کے پاس بغیر اس کی اجازت کے) عَهِدَ الْاَمِیْرُ اِلٰی فُلَانٍ بِکَذَا اس وقت کہا جاتا ہے جب امیر کسی کو کسی کام کا حکم دے۔ اور من موصول لا یملکون کی ضمیر سے بدل ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے۔ یا استثناء کی بناء پر منصوب ہے اور جائز ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور یملکون میں واؤ علامت جمع ہو ضمیر نہ ہو جیسے اَكَلُوْنِيَ الْبَرَاغِيْثُ میں ہے تقدیر یوں ہوگی لا یملک الشفاعة احد الا من اتخذ۔ بعض علماء فرماتے ہیں من اتخذ عند الرحمن عهداً سے مراد وہ شخص ہے جس نے لا الہ الا اللّٰہ کہا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مومنین کی مغفرت کا وعدہ فرمایا ہے فرمایا فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ۔ اور فرمایا اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا۔ اسی طرح حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا اللہ پر بندوں کا حق ہے کہ انہیں عذاب نہ دے جو شرک نہیں کرتے (1)۔

یہ حدیث امام بخاری اور مسلم نے حضرت معاذ سے روایت کی ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اسم موصول محل نصب میں ہوگا اور اس سے پہلے شفاعہ مضاف مقدر ہوگا۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی لا یملکون الشفاعة الا شفاعة من اتخذ عند الرحمن عهداً۔ یعنی شفاعت مفعول کی طرف مضاف ہے۔ اس کی مثال یہ ارشاد ہے لَا يَشْفَعُوْنَ ۙ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى بعض علماء فرماتے ہیں الضمیر مجرمین کے لئے ہے اور الشفاعۃ فعل مجہول کا مصدر ہے۔ اس صورت میں استثناء منقطع ہوگا۔ مطلب یہ ہوگا کہ مجرموں کے حق میں شفاعت قبول نہ ہوگی اور مومنین کے حق میں شفاعت قبول ہوگی۔

وَقَالُوا اتَّخَذَ الرَّحْمٰنُ وَلَدًا ۝

''اور کفار کہتے ہیں بنالیا ہے رحمٰن نے (فلاں کو اپنا) بیٹا لے''

لے یہود و نصاریٰ اور بعض عرب کہتے تھے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں قالوا کی ضمیر کا مرجع مذکور نہیں ہے لیکن (یہود و نصاریٰ) کی طرف بغیر مرجع کے ضمیر لوٹانا جائز ہے کیونکہ ان سے یہ قول مشہور تھا گویا وہ معلوم اور معہود ہیں۔

حمزہ اور کسائی نے اس صورت میں ہر مقام پر اور سورۂ زخرف اور سورۂ نوح میں' ولد کو واؤ کے ضمہ اور لام کے سکون کے ساتھ پڑھا

1۔ صحیح مسلم، جلد 1 صفحہ 205، حدیث: 49 (العلمیہ)

ہے۔ابن کثیر ابوعمرو اور یعقوب نے سورۂ نوح میں ان کی موافقت کی ہے، جبکہ باقی قراء نے دونوں کے فتح کے ساتھ پڑھا ہے۔

لَقَدْ جِئْتُمْ شَيْـًٔا اِدًّا ﴿۸۹﴾

''(اے کافرو!) یقیناً تم نے ایسی بات کی ہے جو سخت معیوب ہے۔ ل''

ل جئتم کے مخاطبین یہ جھوٹ بکنے والے ہیں جو اللہ کی اولاد بناتے ہیں۔اس آیت میں ان کے قول کی برائی بیان کرنے کے لئے غیب سے خطاب کی طرف التفات کیا گیا ہے۔ابن عباس نے ادا کا معنی منکر اور مجاہد نے عظیماً فی الانکار کیا ہے یعنی سخت معیوب اور قبیح چیز۔عرب کہتے ہیں وادنی الامر و آدنی۔یعنی اس کام نے مجھ پر بوجھ ڈال دیا اور وہ کام مجھ پر بہت بھاری ہو گیا۔امام بغوی فرماتے ہیں ادا کلام عرب میں بہت بڑی مصیبت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے (1)۔

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْهُ وَتَنْشَقُّ الْاَرْضُ وَتَخِرُّ الْجِبَالُ هَدًّا ﴿۹۰﴾

''قریب ہے آسمان شق ہو جائیں اس (خرافات) سے اور زمین پھٹ جائے اور پہاڑ گر پڑیں لرزتے ہوئے۔ ل''

ل نافع اور کسائی نے یہاں اور سورۂ حم عسق میں تکاد کو یاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فعل مقدم ہے اور فاعل مؤنث غیر حقیقی ہے، جبکہ باقی قراء نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ فاعل مؤنث ہے۔یتفطرن کو نافع، ابن کثیر، حفص، کسائی اور ابوجعفر نے یاء اور تاء اور طاء مشددہ کے ساتھ باب تفعل سے پڑھا ہے، جبکہ باقی قراء نے باب انفعال سے تاء کی جگہ نون اور طاء مکسورہ مخففہ کے ساتھ پڑھا ہے۔انفطر کا معنی بھی پھٹنا ہے لیکن باب تفعل سے پڑھنا زیادہ بلیغ ہے کیونکہ یہ تفعیل کا مطاوع ہے (جس میں کثرت کا معنی پایا جاتا ہے) بخلاف باب انفعال کے کہ وہ فعل مجرد کا مطاوع ہے اور دوسری وجہ باب تفعل کے بلیغ ہونے کی یہ ہے کہ اس میں تکلیف کا خاصہ ہے۔قاموس میں ھد کا معنی الھدم الشدید و الکسر لکھا ہے، یعنی سختی سے گرنا اور ٹوٹ جانا (2)۔ بعض علماء نے یتفطرن السمٰوٰت کا معنی یسقطن علیھم (یعنی ان پر وہ گرتے ہیں) لکھا ہے اور تنشق الارض کا معنی تخسف بھم (یعنی زمین ان کے ساتھ دھنستی ہے) لکھا ہے۔وتخر الجبال کا معنی تنطبق علیھم (یعنی وہ پہاڑ ان پر مل جائیں) کیا ہے۔

اَنْ دَعَوْا لِلرَّحْمٰنِ وَلَدًا ﴿۹۱﴾

''کیونکہ وہ کہہ رہے ہیں کہ رحمٰن کا ایک بیٹا ہے۔ ل''

ل ولداً میں قرأت کا وہی اختلاف ہے جو پیچھے دو مرتبہ گزر چکا ہے۔ان موصول حرفی اپنے صلہ کے ساتھ مل کر مضاف کے حذف کے ساتھ مفعول لہ کی حیثیت سے محل نصب میں ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ کراھۃ ان دعوا یا ظرفیت کی بناء پر محل نصب میں ہوگا اور یتفطرن، تنشق اور تخر کے متعلق علی سبیل التنازع ہوگا۔(یعنی ہر ایک فعل تقاضا کرتا ہے کہ یہ میرے متعلق ہو) یا لام کے اضمار کے ساتھ یا منہ کی ضمیر سے بدل ہونے کی وجہ سے محل جر میں ہوگا۔یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی وجہ سے محل رفع میں ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الموجب لذالک ان دعوا۔یا ھدا کا فاعل ہونے کی حیثیت سے محل رفع میں ہے یعنی ھدھا دعاء الولد۔اور یہ اس سے مشتق ہوگا جس کا معنی سمّی (نام رکھنا) ہے اور سمّی کے دو مفعول ہوتے ہیں لیکن یہاں ایک مفعول پر اکتفاء کیا گیا

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریہ) 2۔القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 472 (التراث العربی)

تا کہ جن کو بھی اللہ کا بیٹا کہا جاتا ہے سب کو شامل ہو جائے (جیسے عزیر علیہ السلام عیسیٰ علیہ السلام وغیرہما) یا یہ اس دعا سے مشتق ہے جس کا معنی نسب ہے جو دعا کا مطاوع ہے جو کوئی کسی کی طرف منسوب ہو تو ادعیٰ الی فلان کہتے ہیں۔ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور کعب فرماتے ہیں جب یہود و نصاریٰ نے کہا کہ اللہ کا بیٹا ہے تو آسمان زمین اور پہاڑ بلکہ ساری مخلوق لرز گئی سوائے جن و انس کے۔ قریب تھا کہ ہر چیز اپنی جگہ سے ہٹ جاتی اور سارا نظام عالم درہم برہم ہو جاتا ان کے اس قول پر ملائکہ کو انتہائی غصہ آیا اور جہنم بھڑک اٹھی(1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ یہ کلمہ اتنا ہولناک اور قبیح ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات صفت حلم سے متصف نہ ہوتی تو سارے عالم کو نیست و نابود کر دیتی اور جنہوں نے یہ قبیح کلام کی ان پر غصہ کی وجہ سے سارا جہاں گرا دیتا۔

وَمَا يَنْۢبَغِیْ لِلرَّحْمٰنِ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا ﴿۹۲﴾

''اور نہیں جائز رحمٰن کے لئے کہ وہ بنائے کسی کو (اپنا) فرزند۔ ؎۱''

؎۱ انبغیٰ ینبغی مطاوع ہے بغیٰ کا جس کا معنی طلب کرنا ہے (اور مطاوع کا مطلب ہوتا ہے کہ کسی نے کسی چیز کو طلب کیا اور وہ پائی گئی) مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا بیٹا ہو ہی نہیں سکتا اگر چہ وہ بفرض محال طلب بھی کرے، یعنی یہ اس کی قدرت کے تحت داخل ہی نہیں ہے کیونکہ یہ محال اور غیر ممکن ہے۔ یا یہ معنی کہ اس کی شان اتنی بلند و بالا ہے کہ یہ بیٹا بنانا اس کے لائق ہی نہیں ہے کیونکہ یہ نقص ہے اور اللہ تعالیٰ تمام نقائص سے پاک ہے اور ہر اس صفت سے بھی منزہ ہے جو اس کی شان کے لائق نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں شاید رحمانیت کی صفت پر حکم کو مرتب کرنا اس وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا ہر چیز یا نعمت ہے یا منعم علیہ ہے۔ تو جو نعمت ہے یا منعم علیہ وہ نعمتیں عطا کرنے والے اور چھوٹی بڑی نعمتیں بخشنے والے کی ہم جنس نہیں ہو سکتی پس اس کے لئے بیٹا بنانا ممکن ہی نہیں ہے(2)۔

اِنْ كُلُّ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّاۤ اٰتِی الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ﴿۹۳﴾

''کوئی ایسی چیز نہیں جو آسمانوں اور زمین میں ہے مگر وہ حاضر ہوگی رحمٰن کی بارگاہ میں بندہ بن کر۔ ؎۱''

؎۱ مَن نکرہ ہے جس کی صفت ظرف ہے۔ کل مبتدا ہے اور مستثنیٰ مفرغ اس کی خبر ہے یعنی کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے مگر وہ اس کی مملوک اور مخلوق ہے، اس کی عبادت اور انقیاد کے ساتھ اس کی بارگاہ میں پناہ لیتی ہے اور قیامت کے روز عاجزی کرتے ہوئے آئیگی عبودیت مجازی بھی بیٹا ہونے کے منافی ہے، اسی وجہ سے جو اپنے بیٹے کا مالک ہوتا ہے تو وہ بیٹا آزاد ہو جاتا ہے تو پھر عبودیت حقیقیہ جو مخلوق کے مساوی ہے وہ بیٹے کے منافی کیسے نہ ہوگی۔ (یعنی بیٹا ہونا اور عبد ہونا دونوں ایک ذات میں جمع نہیں ہو سکتے۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرما دیا کہ ساری مخلوق اس کی عبد ہے تو ثابت ہو گیا کہ وہ اس کا بیٹا نہیں ہے) کل کے معنی کی مناسبت سے آتی اور عبد جمع ہونے چاہئے تھے لیکن لفظ کل کا اعتبار کرتے ہوئے انہیں مفرد ذکر کیا گیا ہے۔

لَقَدْ اَحْصٰىهُمْ وَعَدَّهُمْ عَدًّا ﴿۹۴﴾

''اللہ تعالیٰ نے ان سب کا شمار کر رکھا ہے اور انہیں گن لیا ہے اچھی طرح ؎۱''

؎۱ یعنی وہ سب اس کے شمارے میں ہیں، اس نے ان کا احاطہ کر رکھا ہے، اس کی قدرت کاملہ اور علم کامل سے کوئی بھی خارج نہیں ہے۔ اس نے ان کی ذوات، نفوس، اعمال، احوال اور رزق کو شمار کر رکھا ہے کیونکہ ہر چیز کا اس کے پاس اندازہ ہے۔ كُلُّ شَیْءٍ عِنْدَهٗ بِمِقْدَارٍ۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 211 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 591 (العلمیۃ)

وَكُلُّهُمْ اٰتِيْهِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فَرْدًا ﴿۹۵﴾

''اور وہ سب پیش ہوں گے اس کے سامنے قیامت کے دن تنہا۔ لے''

لے یعنی قیامت کے روز ان کے ساتھ دنیا کی کوئی چیز بھی نہ ہوگی، دنیا کے اعوان وانصار سے جدا اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے۔

ابن جریر نے عبدالرحمن بن عوف سے روایت کیا ہے کہ جب عبدالرحمن بن عوف نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو مکہ کے دوستوں شیبہ بن ربیعہ، عتبہ بن ربیعہ اور امیہ بن خلف کی یاد محسوس کرنے لگے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے مندرجہ ذیل ارشاد نازل فرمایا(1)۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَيَجْعَلُ لَهُمُ الرَّحْمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾

''بلاشبہ جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے پیدا فرما دے گا خدائے مہربان ان کے لئے (دلوں میں) محبت۔ لے''

لے یعنی مومنین کے دلوں میں محبت پیدا فرمائے گا یا ان کے لئے ایسے محبت پیدا فرمائے گا جو ان سے محبت کریں گے۔ قاموس میں ہے کہ ود کی واؤ پر تینوں حرکتیں پڑھنی جائز ہیں اور ودا کا معنی محب بھی ہے۔ بہت زیادہ محبت کرنے والا(2)۔ اس آیت کریمہ میں عبدالرحمن بن عوف کے لئے تسلی اور اطمینان ہے اور ان کے ساتھ وعدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے لئے کافروں کے بدلے میں مومنین محبت کرنے والے پیدا فرمائے گا۔

طبرانی نے الاوسط میں حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں یہ آیت کریمہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق نازل ہوئی۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان کی محبت کافروں کے علاوہ مومنین کے دلوں میں(3) اور ساری کائنات میں پیدا فرما دے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مَنْ كُنْتُ مَوْلَاهُ فَعَلِيٌّ مَوْلَاهُ(4)۔ میں جس کا مولا ہوں، علی اس کا مولیٰ (دوست، مددگار) ہے۔ اس حدیث کو امام احمد، ابن ماجہ نے براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے، امام احمد نے بریدہ سے، ترمذی اور نسائی نے زید بن ارقم سے روایت کیا ہے۔ اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد ہے، علی کا ذکر عبادت ہے (ذکر علی عبادة) اس ارشاد کو صاحب سند الفردوس نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے روایت کیا ہے اور ایک روایت میں حب علی عبادة آیا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ قَالَ لِجِبْرِيْلَ قَدْ اَحْبَبْتُ فُلَانًا فَاَحِبَّهٗ فَيُحِبُّهٗ جِبْرِيْلُ ثُمَّ يُنَادِيْ فِيْ اَهْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰهَ قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ فَيُحِبُّهٗ اَهْلُ السَّمَاءِ ثُمَّ وُضِعَ لَهُ الْقُبُوْلُ فِي الْاَرْضِ(5)۔ ترجمہ: جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے سے محبت کرنے لگتا ہے تو جبرئیل کو فرماتا ہے کہ میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت کر تو جبرئیل بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر آسمان والوں میں یہ اعلان کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے۔ تم بھی اس سے محبت کرو پس تمام آسمان والے اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد زمین میں اس کی محبت ڈال دی جاتی ہے (یعنی زمین کی مخلوق بھی اس سے محبت کرتی ہے)

اس حدیث کو امام بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کیا ہے۔ میں کہتا ہوں اس آیت کریمہ کی یہ تاویل

1۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 12-511 (العلمیہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 468 (التراث الاسلامی)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 512 (العلمیہ) 4۔ مجمع الزوائد: 14613 (الفکر) 5۔ صحیح مسلم، جلد 2، صفحہ 331 (قدیمی)

بھی ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے اپنی ذات کا محب بنا دیتا ہے کیونکہ حدیث قدسی ہے لَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اَحْبَبْتُہٗ۔ بندہ نوافل کے ذریعے میرا قرب حاصل کرتا رہتا ہے حتیٰ کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔

فَاِنَّمَا یَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِیْنَ وَ تُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾

''صرف اس لئے ہم نے آسان کر دیا ہے قرآن کو آپ کی زبان میں اتار کر تا کہ آپ مژدہ سنائیں اس سے پرہیزگاروں کو اور ڈرائیں اس کے ذریعہ اس قوم کو جو بڑی جھگڑالو ہے۔ ۱؎ ''

۱؎ بلسانک میں باء بمعنی علی ہے یا باء اپنے ہی اصل معنی میں ہے اور یسرناہ کو باء کے صلہ کے ساتھ متعدی فرمایا کیونکہ اس کے ضمن میں انزلناہ کا معنی ہے۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت پر اتارا۔ اس معنی کے اعتبار سے بلسانک حال ہوگا۔ میں کہتا ہوں یہ کہنا بھی ممکن ہے۔ یسرناہ علی امتک متلبساً بلغتک۔ یعنی ہم نے اس قرآن کو آپ کی لغت میں اتار کر آپ کی امت پر آسان کر دیا۔ یسرناہ کی ضمیر منصوب اور تنذر بہ میں مجرور ضمیر کا مرجع قرآن ہے۔ قوماً لداً سخت جھگڑالو قوم جو حق کے واضح ہونے کے باوجود تعصب، عناد اور خصومت کی بناء پر آگ کو اختیار کرتے ہیں۔ حضرت حسن نے لدا کا معنی حق سے بہرہ کیا ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی یہ فرمایا ہے۔ الظالم الذی لا یستقیم، یعنی ایسا ظالم جو کبھی سیدھا نہ ہوتا ہو اور راہ راست پر نہ آتا ہو۔ ابوعبیدہ فرماتے ہیں جو حق کو قبول نہ کرتا ہو اور باطل کا مدعی ہو(1)۔ اور یہاں حصر اضافی ہے۔ یعنی ہم نے قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ آپ ان کے ایمان لانے کی وجہ سے قلق واضطراب میں مبتلا رہیں اور اپنے نفس کو مشقت میں ڈالتے رہیں ہم نے تو اس لئے نازل کیا ہے کہ آپ شرک سے بچنے والوں کو دنیا و آخرت کی کامیابی کی بشارت دیں اور مجرموں اور منکروں کو خوفناک انجام سے ڈرائیں۔

وَ كَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ ؕ هَلْ تُحِسُّ مِنْهُمْ مِّنْ اَحَدٍ اَوْ تَسْمَعُ لَهُمْ رِكْزًا ﴿۹۸﴾

''اور کتنی قومیں تھیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے پہلے کیا محسوس کرتے ہو ان میں سے کسی کو یا سنتے ہو ان کی کوئی آہٹ ۱؎ ''

۱؎ اس ارشاد میں کفار قریش کو ڈرانا اور نبی کریم ﷺ کو ان کو ڈرانے پر جرأت دلانا ہے۔ فرمایا ان گزشتہ قوموں میں سے کسی فرد کا حواس خمسہ میں سے کسی حاسہ کے ذریعے کچھ پتہ محسوس کرتے ہو۔ بعض نے تحس کا معنی تریٰ (دیکھنا) بعض نے تجد (پایا) اور بعض نے تشعر (محسوس کرنا) کیا ہے۔ الرکز خفی آواز کو کہتے ہیں۔ رکز کی ترکیب خفاء کے معنی کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ مثلاً رکز الرمح بولتے ہیں جب نیزہ کی ایک طرف زمین میں چھپ جائے۔ رکاز دفن شدہ مال کو کہتے ہیں۔ واللہ اعلم۔

اس سورۂ پاک کی تفسیر بروز سوموار 5 صفر 1203ھ میں مکمل ہوئی۔ الحمد للّٰہ رب العالمین والصلوٰۃ والسلام علی سید الانبیاء والمرسلین سورۂ مریم کا ترجمہ بروز سوموار 21 ربیع الثانی 1421ھ بمطابق 24 جولائی 2000ء بوقت پانچ بجے شام مکمل ہوا۔ اے مالک الملک میری اس سعی ناتمام کو قبول فرما اور آخرت میں بغیر حساب اور مناقشہ کے سرخروئی کا باعث بنا اور تادم آخر اپنے کلام مقدس اور سنت نبوی (ﷺ) کی خدمت میں مشغول فرما۔ آمین ثم آمین بجاہ سید المرسلین امام المتقین خاتم النبیین محمد المصطفیٰ ﷺ۔ الحمد للّٰہ رب العالمین۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 212 (التجاریۃ)

سورۂ طٰہٰ

اٰیاتُھا ۱۳۵ ﴿ سُوْرَۃُ طٰـہٰ مَکِّیَّۃٌ ۲۰ ﴾ رکوعاتُھا ۸

سورہ طٰہٰ مکیہ ہے اس میں 8 رکوع اور 135 آیتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو بہت ہی مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے

آغاز ترجمہ سورۂ طٰہٰ 22 ربیع الثانی 1421 بمطابق 25 جولائی 2000 بروز منگل۔

طٰہٰ ﴿۱﴾

ابوبکرؒ حمزہ اور کسائی نے طاء اور ھاء کے فتحہ کے امالہ کے ساتھ، ورش اور ابوعمر نے صرف ھا کے امالہ کے ساتھ اور باقی قراء نے دونوں کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں (طا، ھا) حروف کے اسماء ہیں۔ ان پر تفصیلی گفتگو سورۂ بقرہ کی ابتداء میں گذر چکی ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ گذر چکی ہے بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک اسم ہے۔ اور یہ قسم ہے جیسے حضور کریم ﷺ کا ارشاد ہے۔ حم لا ینصرون(1)۔

ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور حاکم نے براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے خندق کی رات فرمایا حم لا ینصرون (قسم بخدا کافر کبھی کامیاب نہ ہوں گے) مقاتل بن حبان فرماتے ہیں طٰہٰ کا معنی یہ ہے کہ اپنے دونوں قدموں کو زمین پر رکھو۔ آپ ﷺ نماز تہجد ایک پاؤں پر کھڑے ہو کر ادا فرماتے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اس تکلیف میں مبتلا نہ ہونے کا ارشاد فرمایا(2)۔ بزار اور ابن مردویہ نے اپنی تفسیر میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے نقل کیا ہے کہ جب حضور نبی کریم ﷺ پر یٰۤاَیُّھَا الْمُزَّمِّلُ ﴿۱﴾ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا کا ارشاد نازل ہوا تو آپ ساری رات قیام فرماتے حتیٰ کہ آپ کے پاؤں مبارک سوج جاتے، آپ تھکاوٹ کی وجہ سے ایک پاؤں اٹھا لیتے اور ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے۔ جبرئیل نازل ہوئے اور کہا طه علی الارض بقدمیک یا محمد اے پیارے محمد ﷺ اپنے دونوں پاؤں زمین پر رکھیے(3)۔ اس طرح بھی پڑھا گیا ہے۔ اس معنی کے اعتبار سے اس کی اصل طَاءِ ہوگئی اور یہ وَطَاءِ یطأُ سے مشتق ہوگا۔ ہمزہ ھاء سے بدل گیا ہے اور یطا میں ہمزہ الف سے بدل گیا ہے پھر امر کا صیغہ بنایا گیا تو اس کے ساتھ ھا السکت ملائی گئی۔ یہ بھی احتمال ہو سکتا ہے کہ الف ہمزہ کا بدل ہو اور ھا ضمیر ہو جس کا مرجع الارض ہو لیکن حرف کی صورت میں اس کا لکھا ہوا ہونا اس کی تائید نہیں کرتا۔ مجاہد، عطاء اور ضحاک نے اس کا معنی یا رجل (اے شخص) کیا ہے اور قتادہ فرماتے ہیں یہ سریانی زبان میں یا رجل کے معنی میں ہے، کلبی کہتے ہیں قبیلہ عک کی لغت میں اس کا معنی یا انسان ہے(4)۔ اس معنی کے اعتبار سے خطاب نبی کریم ﷺ کو ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ طٰہٰ کو نبی کریم ﷺ کے اسماء میں شمار کیا گیا ہے کیونکہ یہ آپ کی ذات کی طرف

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 343 (قدیمی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)

3۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 516 (العلمیہ) 4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)

اشارہ ہے۔علامہ بغوی فرماتے ہیں کلبی نے لکھا ہے کہ جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ پر وحی نازل ہوئی کہ آپ عبادت میں انتہائی کوشش فرمائیں تو آپ ﷺ قیام کے طویل ہونے کی وجہ سے کبھی ایک قدم پر کھڑے ہوتے اور کبھی دوسرے پر اور آپ ساری رات قیام میں گذار دیتے۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی اور تھوڑی مشقت کرنے کا حکم فرمایا(1)۔

مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى ﴿۲﴾

''نہیں اتارا ہم نے آپ پر یہ قرآن کہ آپ مشقت میں پڑیں۔ لے''

لے قاموس میں الشقاء کا معنی شدت اور تنگی لکھا ہے(2)۔جوہری کہتے ہیں شقاوۃ (بدبختی) سعادت کی ضد ہے جس طرح شقاوۃ کی دو صورتیں ہیں دنیوی اور اخروی اسی طرح سعادت کی بھی دو صورتیں ہیں پھر سعادت دنیوی کی تین صورتیں ہیں۔نفسیہ' بدنیہ اور خارجیہ۔ اسی طرح شقاوت کی بھی یہ تمام صورتیں بنتی ہیں۔اس آیت کریمہ میں شقاوت دنیویہ بدنیہ مراد ہے،یعنی تھکاوٹ۔بعض علماء فرماتے ہیں الشقاء کا لفظ التعب (تھکاوٹ) کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔مثلاً اَشْقٰی مِنْ رَائِضِ الْمُهْرِ (یعنی گھوڑے کے بچے کو سواری کے لئے تیار کرنے والے شخص سے بھی وہ زیادہ تھکا ہوا ہے) اسی طرح عرب کہتے ہیں۔سَيِّدُ الْقَوْمِ اَشْقَاهُمْ قوم کا سردار قوم سے زیادہ مشقت کرنے والا ہوتا ہے۔کلام کو اس اسلوب میں بدل کر بیان کرنے میں یہ حکمت ہے کہ مراد کے خلاف مفہوم نہ سمجھا جائے اگر اتعب استعمال ہوتا تو مراد کے خلاف کا وہم ہوتا اور مراد یہ ہے کہ ہم نے قرآن اس لئے اتارا ہے کہ آپ سعادت دارین حاصل کریں(3)۔ (اس لئے نہیں کہ آپ مشقت میں پڑ جائیں) ابن مردویہ نے حضرت ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ پر وحی کا آغاز ہوا تو آپ ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو قدموں کے اگلے حصہ پر سہارا لے کر کھڑے ہوتے۔اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کی یہ مشقت دیکھ کر ارشاد فرمایا۔طٰهٰ ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى (4) عبد بن حمید نے ربیع بن انس سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ جب نماز ادا فرماتے تو ایک پاؤں پر کھڑے ہوتے اور دوسرا پاؤں اٹھا لیتے تو اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد طٰهٰ ﴿۱﴾ مَآ اَنْزَلْنَا الخ نازل فرمایا(5)۔

بعض علماء فرماتے ہیں یہ آیت کفار کی (بدزبانی) کا رد ہے۔انہوں نے جب آپ ﷺ کی عبادت میں اجتہاد اور کوشش دیکھی تو کہنے لگے کہ یہ قرآن آپ پر اس لئے نازل ہوا ہے تاکہ آپ تکلیف میں مبتلا ہوں۔اس وقت اللہ تعالیٰ نے یہ ارشاد نازل فرمایا۔یہ بھی ہوسکتا ہے کہ کفار نے ساری کائنات سے زیادہ سعادت مند اور ارجمند کی طرف شقاوت کی نسبت کی ہو،اس وجہ سے کہ انہوں نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ دیا ہے۔اللہ تعالیٰ نے ان کے قول کا رد فرمادیا اور اس برگذیدہ ذات کی سعادت کو بیان فرمایا کہ اس پر تو قرآن نازل ہوا ہے اور وہ تو صفات کمالیہ سے متصف ہے واللہ علم۔اسی مفہوم پر ابن مردویہ نے جوعوفی کے طریق سے ابن عباس سے روایت نقل کی ہے وہ بھی دلالت کرتی ہے۔کفار نے کہا کہ یہ شخص (خاک بدہن اشقیاء) بدبخت ہوگیا ہے تو اس وقت یہ ارشاد نازل ہوا مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰٓى۔اور یہ معنی بھی ہوسکتا ہے ہم نے قرآن اس لئے تو نازل نہیں کیا کہ اگر آپ کی قوم واضح اور روشن آیات کو سن کر ایمان نہ لائیں تو آپ ان کے غم میں بیقرار و بے چین رہیں،یہ قرآن تو نصیحت ہے۔اور آپ پر صرف اس کی تبلیغ لازم ہے اور بس اگر طٰہٰ کو سورت یا قرآن کی تاویل میں کر کے مبتدا بنایا جائے تو ما انزلنا کا جملہ خبر ہوگا اور اسی جملہ میں لفظ

1۔تفسیر بغوی،جلد 4،صفحہ 213 (التجاریہ) 2۔القاموس المحیط،جلد 2،صفحہ 1705 (التراث العربی)
3۔تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ،جلد 5،صفحہ 595 (العلمیہ) 4۔الدر المنثور،جلد 4،صفحہ 516 (العلمیہ) 5۔ایضاً

القرآن ضمیر عائد کے قائم مقام ہوگا اور اگر طٰہٰ کو قسم بنایا جائے تو یہ جواب قسم ہوگا۔ اور اگر طٰہٰ کو منادی (یعنی یا رجل رجل) بنایا جائے تو یہ جملہ اس منادیٰ لہ ہوگا۔ اگر اسے جملہ فعلیہ یا مبتدا کے اضمار کے ساتھ جملہ اسمیہ بنایا جائے تو جملہ مستانفہ ہوگا۔

اِلَّا تَذْكِرَةً لِّمَنْ يَّخْشٰى ۝۳

''بلکہ یہ نصیحت ہے۱؎ اس کے واسطے جو (اپنے رب سے) ڈرتا ہے۔۲؎ ''

۱؎ یہ مستثنیٰ منقطع ہے اور لتشقیٰ کے محل سے اسے بدل بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ (شقاوت اور نصیحت) کی جنسیں مختلف ہیں (ایک جنس نہ دوسری کا عین ہے نہ بعض ہے اور نہ ایک دوسری پر مشتمل ہے اس لئے بدل بننے کی کوئی صورت بھی نہیں) اور نہ یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے کیونکہ ایک فعل دو علتوں کی طرف متعدی نہیں ہوتا۔ اور یہ ہوسکتا ہے کہ مستثنیٰ مفرغ ہو اور فعل محذوف کی علت کی بناء پر منصوب ہو۔ تقدیر عبارت اس طرح ہو ما انزلناہ الا تذکرۃً بعض علماء فرماتے ہیں تذکرہ مصدر ہے اور ک ضمیر سے یا القرآن سے حال ہے۔ یا یہ انزلنا کا مفعول لہ ہے اس بنا پر کہ لتشقیٰ اس محذوف کے متعلق ہے جو القرآن کی صفت ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی ما انزلنا علیک القرآن المنزل لتتعب بتبلیغہٖ لغرض اِلّا تذکرۃً۔

۲؎ لمن یخشیٰ سے مراد وہ شخص ہے جس کے دل میں خشیت الٰہی اور نرمی ہے ڈرانے کے ساتھ نرم ہو جاتا ہے یا وہ شخص مراد ہے جس کے متعلق اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ یہ ڈرانے کے ساتھ ڈر جائے گا۔ کیونکہ خوف رکھنے والا ہی اس قرآن سے نفع حاصل کرتا ہے۔

تَنْزِيْلًا مِّمَّنْ خَلَقَ الْاَرْضَ وَ السَّمٰوٰتِ الْعُلٰى ۝۴

''یہ اتارا گیا ہے اس ذات کی طرف سے جس نے پیدا فرمایا زمین کو اور بلند آسمانوں کو۱؎ ''

۱؎ تنزیلاً اپنے فعل کے اضمار کے ساتھ یخشیٰ کی وجہ سے یا بطور مدح یا تذکرہ سے بدل ہونے کی بناء پر منصوب ہے بشرطیکہ تذکرہ کو حال بنایا جائے لفظاً یا معنیً مفعول لہ نہ بنایا جائے کیونکہ ایک چیز اپنی ہی ذات یا اپنی نوع کے لئے علت نہیں بن سکتی۔ ممن خلق الخ تنزیلاً کے متعلق ہے یا اس کی صفت ہے اس میں تفنن کلام کے لئے متکلم سے غیبۃ کی طرف التفات کیا ہے اور دو وجہ سے منزل کی عظمت شان بیان کی گئی ہے۔ اس کے انزال کی نسبت اس ذات کی طرف ہے جس کی شان بلند و بالا ہے اور اس کی نسبت اس ذات کی طرف کی گئی جو صفات کمالیہ اور افعال عظیمہ کے لئے مختص ہے۔ پھر بالترتیب اس ذات بے ہمتا کے افعال اور صفات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے اور ترتیب وہ اختیار فرمائی ہے جو عقل کے زیادہ قریب ہے، پہلے زمین و آسمان کی تخلیق کا تذکرہ کیا جو عالم کی اصل ہیں۔ زمین کا ذکر پہلے فرمایا کیونکہ یہ جس کے زیادہ قریب ہے اور بلند و بالا آسمانوں سے زیادہ اس میں قدرت کی نشانیاں عیاں ہیں۔ العُلیٰ جمع ہے عُلیا کی جو اَعلیٰ کی مونث ہے۔

اَلرَّحْمٰنُ عَلَى الْعَرْشِ اسْتَوٰى ۝۵ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِي الْاَرْضِ وَ مَا بَيْنَهُمَا وَ مَا تَحْتَ الثَّرٰى ۝۶

''وہ بے حد مہربان (کائنات کی فرمانروائی کے) تخت پر متمکن ہوا۱؎ اسی کے ملک میں ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور جو کچھ ان دونوں کے درمیان ہے اور جو کچھ گیلی مٹی کے نیچے ہے۲؎ ''

۱؎ اس کی تفسیر سورۂ یونس میں گذر چکی ہے۔

ؔ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ سے مراد ملائکہ ستارے وغیرہ ہیں اور و ما فی الارض سے مراد پہاڑ انہار معادن اشجار حیوانات جن وانس شیطان اور ملائکہ وغیرہ ہیں۔ اور مابینھما سے مراد ہوا بادل گرج چمک وغیرہ ہیں اور الثریٰ سے مراد گیلی مٹی ہے حدیث شریف میں ہے کہ کتا پیاس کی وجہ سے گیلی مٹی کھاتا ہے عرب ثوی التراب بولتے ہیں جب مٹی پر پانی چھڑکا جائے امام بغوی نے لکھا ہے کہ ضحاک فرماتے ہیں وما تحت الثریٰ سے مراد وہ ہے جو گیلی مٹی کے نیچے ہے۔ ابن عباس فرماتے ہیں زمینیں مچھلی کی پیٹھ پر ہیں اور مچھلی سمندر پر ہے اور مچھلی کا سرا اور دم عرش کے نیچے ملے ہوئے ہیں اور سمندر ایک سبز چٹان پر ہے اور آسمان کی سبزی اس کی چٹان کی وجہ سے ہے۔ اور یہ وہ چٹان ہے جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے لقمان کے قصہ میں بیان فرمایا ہے۔ (فتکن فی صخرۃ) اور وہ چٹان بیل کے سینگ پر ہے اور بیل گیلی مٹی پر ہے اور اس کے نیچے جو کچھ ہے اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور وہ بیل اپنا منہ کھولے ہوئے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ سب سمندروں کو ایک سمندر بنا دے گا تو وہ بہہ کر اس بیل کے پیٹ میں چلے جائیں گے اور وہاں خشک ہو جائیں گے (1)۔ الرحمٰن مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے یا مدح کی بناء پر موفوع ہے اور مابعد مبتدا محذدوف کی خبر ہے یا الرحمٰن مبتدا محذوف ھو کی خبر ہے اور علی العرش استویٰ کا جملہ اور له ما في السمٰوٰت الخ کا جملہ دونوں بغیر حرف عطف کے یکے بعد دیگرے خبریں ہیں۔ جیسے زیدٌ عالم عاقلٌ میں عالم اور عاقلٌ خبریں ہیں اور الرحمن اپنی اخبار سے مل کر جو جملہ بنا ہے یا تو یہ جملہ مستانفہ ہے اور جو مسائل کا جواب ہے جو کہتا ہے کہ ہمارے سامنے اس قرآن نازل کرنے والے کی صفت بیان کرو۔ یا یہ خلق کے جملہ کے مضمون کی تاکید ہے۔

وَ اِنْ تَجْهَرْ بِالْقَوْلِ فَاِنَّهٗ يَعْلَمُ السِّرَّ وَ اَخْفٰى۝

''اور اگر تو بلند آواز سے بات کرے (تو تیری مرضی) وہ تو بلاشبہ جانتا ہے رازوں کو بھی اور دل کے بھیدوں کو بھی ؔ۔''

ؔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اگر تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو اور اسے جہری لہجہ میں پکارو (تمہاری اپنی مرضی) جان لو وہ تمہارے جہر سے مستغنی ہے کیونکہ وہ تو پوشیدہ اور پردے میں کہی ہوئی بات کو بھی جانتا ہے اور جو ابھی دل میں تصور اور خیال ہے اسے بھی جانتا ہے (2)۔ میرے نزدیک اس کا یہ مفہوم ہے کہ تم اللہ کا ذکر بلند آواز سے کرو یا آہستہ کرو اللہ تعالیٰ اسے جان لے گا اور اس کا اجر و ثواب دے گا۔ کیونکہ وہ تو اسرار کی باتوں اور دل کے تصورات کو بھی جانتا ہے چہ جائیکہ جہری آواز میں ذکر ہو۔ بسیاق کلام کی وجہ سے اور تخافت حذف کیا گیا ہے جیسا کہ اس ارشاد میں البرد محذوف ہے۔ سَرَابِيْلَ تَقِيْكُمُ الْحَرَّ۔ امام بغوی فرماتے ہیں حسن فرماتے ہیں السر وہ راز کی بات جو کسی غیر کے سامنے بیان کی گئی ہو اور اخفی جو ابھی نہاں خانہ دل میں انگڑائیاں لے رہی ہوا بھی اس کا اظہار زبان سے نہ ہوا ہو۔ ابن عباس اور سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ سر وہ بات ہے جو ابھی دل میں ہی ہے اور اخفیٰ وہ بات جو بعد میں اللہ تعالیٰ تیرے دل میں ڈالے گا اور تو ابھی تک خود اسے نہیں جانتا کہ ایسا بھی ہوگا۔ کیونکہ تو تو فقط آج کی بات اور خیال کو جانتا ہے، کل جو تیرے دل میں آئے گا اس کی آج تجھے خبر نہیں ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی ذات جو تو آج دل میں آرزوئیں اور امنگیں لیئے بیٹھا ہے وہ انہیں بھی جانتا ہے اور جو تو کل سوچے گا اور خیال کرے گا وہ اسے بھی جانتا ہے۔ حضرت علی بن طلحہ، ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں السر وہ بات جو ابھی ابن آدم کے دل میں ہوتی ہے اور اخفیٰ وہ عمل جو ابھی تک کیا نہیں، بعد میں کرے گا۔ مجاہد فرماتے ہیں السر وہ عمل ہے جو تم لوگوں سے پوشیدہ کرتے ہو اور اخفیٰ دل کا وسوسہ ہے۔ بعض فرماتے ہیں السر سے مراد عزیمت ہے، یعنی کسی کام کا پختہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 599 (العلمیہ)

ارادہ کرنا۔ اور اخفیٰ وہ بات جو دل میں کھٹک تو رہی ہے لیکن اس پر عزم نہیں ہے۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں وہ ذات جو ہمہ بیں اور ہمہ دان ہے اپنے بندوں کے سر و اخفٰی کو جانتی ہے دوسرا کوئی نہیں جانتا(1)۔ صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں سر اور اخفٰی مجردات خمسہ میں سے ہیں جو عرش کے اوپر کشف کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انسان کے بدن میں ان کے جلوے منعکس ہوتے ہیں اور وہ مجردات خمسہ (ایسی پانچ چیزیں جو مادہ سے خالی ہیں) یہ ہیں قلب، روح، سر، خفی، اخفٰی قلب ولایت انسانیہ کی تجلیات کا مہبط ہے اور روح ولایت توحیہ ابراہیمہ کے انوار کی جلوہ گاہ ہے، اور سر ولایت موسویہ کی تجلیات کا مہط ہے اور اخفٰی ولایت عیسویہ کے انوار کا مہبط ہے اور اخفٰی ولایت محمدیہ کے انوار کی منزل ہے۔

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ⑧

”اللہ (وہ ہے کہ) کوئی عبادت کے لائق نہیں بغیر اس کے اسکے لئے بڑے خوبصورت نام ہیں [1]“

[1] اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ مبتدا خبر ہیں اور له الاسماء الحسنیٰ خبر ثانی ہے اور جملہ کبریٰ له ما فی السموٰت جملہ کے مضمون کے لئے ہے۔ کیونکہ جو آسمانوں اور زمینوں کا مالک ہے اس کے لئے الوھیت میں یکتا ہونا اور ان تمام صفات کمالیہ کے ساتھ متصف ہونا ضروری ہے جن پر اس کے وہ خوبصورت اسماء دلالت کرتے ہیں جن کے ساتھ کسی غیر کو موسوم کرنا جائز ہی نہیں ہے۔ الحسنیٰ مونث ہے الاحسن کی۔ اللہ تعالیٰ کے تمام اسماء کو باقی تمام اسماء پر حسن و خوبصورتی میں اس لئے فضیلت ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے اسماء ایسے معانی پر دلالت کرتے ہیں جو تمام معانی سے بلند اور افضل ہیں۔ ہم نے سورۂ اعراف میں اسماء حسنیٰ کی بحث تفصیل سے وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا کے تحت ذکر کردی ہے۔

وَ هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى ⑨

”اور (اے حبیب!) کیا پہنچی ہے آپ کو اطلاع موسیٰ کے قصہ کی؟ [1]“

[1] یہ استفہام تقریری ہے۔ یعنی تیرے پاس موسیٰ کی خبر یقیناً پہنچ چکی ہے۔ اور اس جملہ کا عطف سابقہ کلام کے مضمون پر ہے۔ یعنی اِلَّا تذکرۃً کے مضمون پر عطف ہے کیونکہ اس کا مفہوم یہ ہے ”لیکن ہم نے اسے بطور نصیحت اتارا ہے“۔ یا یہ کہ اس کا عطف تنزیلاً کے مضمون پر ہے۔ یعنی تیرے پاس قرآن آیا، آپ کو عبادت کی تھکاوٹ پہنچی، آپ نے سعادت کی سب منزلیں طے کیں اور آپ کے پاس موسیٰ کلیم کی خبر بھی پہنچی ہے جس میں ان کی مشقتوں اور منازل عالیہ کا تذکرہ بھی ہے۔ آپ ﷺ کی نبوت کی تمہید کے بعد اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کا ذکر فرمایا تاکہ نبوت کے بار گراں کو اٹھانے، پیغام رسانی کی مشکلات اور تکالیف پر صبر کرنے میں موسیٰ علیہ السلام کی اقتداء کریں۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جو آغاز نبوت میں نازل ہوئی تھیں۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْٓا اِنِّيْٓ اٰنَسْتُ نَارًا لَّعَلِّيْٓ اٰتِيْكُمْ مِّنْهَا بِقَبَسٍ اَوْ اَجِدُ عَلَى النَّارِ هُدًى ⑩

”جب (مدین سے واپسی پر تاریک رات میں) آپ نے آگ دیکھی تو اپنے گھر والوں کو کہا تم (ذرا یہاں) ٹھہرو۔ میں نے آگ دیکھی ہے شاید میں لے آؤں تمہارے لئے اس سے کوئی چنگاری [1] یا مجھے مل جائے آگ کے پاس کوئی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 213 (التجاریۃ)

راہ دکھانے والا ۲؎ ‘‘

۱؎ اذ ظرف ہے حدیث موسیٰ کی یعنی کیا تمہارے پاس موسیٰ علیہ السلام کی خبر پہنچی جب انہوں نے آگ کو دیکھا تھا۔ یا اذ فعل مضمر را ای کی ظرف ہے۔ یا اذ کر مقدر کا مفعول فیہ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے حضرت شعیب علیہ السلام سے اپنی والدہ اور ہمشیرہ کی زیارت کے لئے مصر واپس آنے کی اجازت مانگی تو انہوں نے اجازت دے دی۔ موسیٰ علیہ السلام اپنے اہل اور مال کو لے کر چل پڑے۔ سردیوں کا موسم تھا۔ آپ نے ظالم بادشاہوں کے خوف سے راستہ بھی غیر معروف اختیار فرمایا۔ آپ کی بیوی امید سے تھیں، معلوم نہیں دن میں بچہ کی پیدائش ہو جائے یا رات کو۔ آپ کسی راہنما کے بغیر صحرا میں چل پڑے۔ آپ کو مجبوراً تاریک ٹھنڈی اور برفانی رات میں طور کی مغربی جانب چلنا پڑا۔ راستہ میں بیوی کو دردِ زہ شروع ہو گیا آپ نے چقماق کو رگڑا لیکن وہ نہ جلی۔ کہا جاتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام بڑے غیرت مند شخص تھے۔ رات کے وقت اپنے رفقاء سفر کے ساتھ چلتے تھے اور دن کے وقت دوستوں سے علیحدہ ہو جاتے تھے تاکہ ان کی بیوی پر کسی کی نظر نہ پڑے۔ پس آپ چلتے ہوئے راستہ بھول گئے، رات بڑی اندھیری اور سرد تھی۔ انہوں نے چقماق جلایا لیکن وہ نہ جلا، آپ کو اس وقت طور کی بائیں جانب دور آگ دکھائی دی (1)۔ آپ نے اپنے گھر والوں سے کہا تم ٹھہرو۔ آپ کا یہ خطاب بیوی اور دوسرے ہمراہیوں سے ہے۔ بعض فرماتے ہیں یہ خطاب آپ کا اپنی بیوی کو تھا لیکن چونکہ وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی تھیں اس لئے تعظیم کے لئے جمع کا صیغہ استعمال فرمایا۔ حمزہ نے یہاں اور سورۂ قصص میں لاهله کی ضمیر کو وصل کی صورت میں ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ انّی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ الئس بمعنی ابصَرَ ہے، یعنی اچھی طرح دیکھنا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ایناس کا معنی مانوس چیز کو دیکھنا ہے۔ لَعَلِّیٓ کو کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ باقی قراء نے یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ قَبَسٍ آگ کا شعلہ چنگاری جسے بڑی آگ سے حاصل کیا جاتا ہے (2)۔ قاموس میں اسی طرح لکھا ہے۔

۲؎ هدی سے مراد ہادی ہے، یعنی میں کوئی راہنما پالوں جو صحیح راستہ پر میری راہنمائی کرے یا یہ معنی کہ دین کے ابواب کی طرف میری راہنمائی کرے۔ کیونکہ ابرار و نیکوکار لوگ جس حالت میں بھی ہوں ان کا میلان دین کے ابواب کی طرف ہوتا ہے۔ جب آگ کا لانا اور راہنما کا ملنا متوقع تھا تو ان کو رجاء اور طمع کے صیغہ (لعلی) کے ساتھ ذکر کیا۔ لیکن آگ کا دیکھنا یقینی تھا اس لئے اسلوب بیان یقین والا ذکر فرمایا۔ اور علی النار میں استعلاء (غلبہ) کا معنی ہے کیونکہ آگ جلانے والے آگ کے اوپر ہوتے ہیں یا یہ معنی کہ وہ آگ قریبی مکان کے اوپر تھے (ان معانی کی خاطر علی استعمال فرمایا جو غلبہ اور استعلاء کے لئے آتا ہے) جیسا کہ مررت بذیدمیں باء اس مکان کے قریب سے گذرنے کے معنی میں ہے جو زید کے قریب ہے۔

فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۱﴾

’’ پس جب آپ وہاں پہنچے تو ندا کی گئی اے موسیٰ ۱؎ ‘‘

۱؎ لما اتا ھا نودی کی ظرف ہے۔ جب موسیٰ علیہ السلام وہاں پہنچے تو ایک سرسبز درخت دیکھا جس کے اوپر نیچے آگ ہی آگ ہے۔ طرفہ تماشا یہ کہ آگ اپنی جگہ میں روشن اور سبزی اپنی جگہ میں گہری اور شدید تھی۔ درخت کی سبزی آگ کی چمک میں مخل نہ تھی اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 14-213 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 773 (التراث العربی)

نہ آگ کی چمک درخت کی سبزی میں کوئی تبدیلی کا باعث تھی۔ قتادہ، مقاتل اور کلبی کہتے ہیں وہ درخت عوسج کا تھا۔ وہب فرماتے ہیں علیق کا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں عناب کا تھا۔ یہ آخری قول ابن عباس سے مروی ہے۔ اہل تفسیر فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے جو کچھ دیکھا تھا وہ آگ نہیں نور تھا۔ اور نار (آگ) کے لفظ سے اس لئے ذکر فرمایا کیونکہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اس کو نار (آگ) گمان کیا تھا۔ اکثر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ رب تعالیٰ کا نور تھا۔ یہ ابن عباس، عکرمہ وغیرہما کا قول ہے۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں وہ آگ ہی تھی اور آگ ہی اللہ کا حجاب ہے۔ اور اس کی دلیل ابو موسیٰ اشعری کی روایت ہے۔ کہ حضور ﷺ نے فرمایا اللہ کا حجاب نار (آگ) ہے اگر وہ اس حجاب کو اٹھا دے تو اس کے چہرے کی تجلیات حد نظر تک تمام مخلوق کو جلا دے (1)۔ امام بغوی نے یہ حدیث اسی طرح نقل کی ہے کہ صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں نار کی جگہ نور ہے۔ میں کہتا ہوں نور وہ ہوتا ہے۔ جو آگ کا لطیف حصہ ہوتا ہے جو جلاتا نہیں ہے۔ نور اور آگ دونوں کا مال ایک ہی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں ہے کہ آپ نے خشک گھاس لی اور درخت کے قریب گئے جب وہ قریب ہوتے آگ دور ہو جاتی۔ آپ حیران و ششدر ہو گئے، آپ نے وہاں ملائکہ کی تسبیح سنی اور آپ پر سکینت طاری ہو گئی اور اس وقت آپ کو یہ ندا کی گئی۔

اِنِّیْۤ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ ۚ اِنَّكَ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى ﴿۱۲﴾

"بلا شبہ میں تیرا پروردگار ہوں [1] پس تو اتار دے اپنے جوتے [2] بے شک تو طوی کی مقدس وادی میں ہے [3]"

[1] اِنِّی کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ، باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ابن کثیر ابو عمرو اور ابو جعفر نے انی کے ہمزہ کو فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ باقی قراء نے قول کے اضمار یا ندا کو قول کے قائم مقام کرنے کی وجہ سے ہمزہ کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے اور متکلم کی ضمیر (ی/انا) کا تکرار تاکید اور تحقیق کے لئے ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں حضرت وہب نے فرمایا درخت سے آواز آئی اے موسیٰ تو موسیٰ علیہ السلام نے فوراً جواب دیا لیکن آپ کو معلوم نہ تھا کہ کون مجھے بلا رہا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا مجھے بلانے والے میں تیری آواز سن رہا ہوں لیکن مجھے تیرے مکان کا علم نہیں ہے کہ کہاں ہے؟ ارشاد ہوا میں تیرے اوپر، تیرے ساتھ، تیرے آگے، تیرے پیچھے اور تجھ سے زیادہ تیرے قریب ہوں۔ موسیٰ علیہ السلام جان گئے کہ ایسی ذات اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے تو آپ کو یقین ہو گیا (2)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں بعض علماء فرماتے ہیں جب ندا آئی تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کلام کرنے والا کون ہے۔ فرمایا میں اللہ ہوں۔ شیطان نے وسوسہ ڈالا کہ شاید تم شیطان کی کلام سن رہے ہو۔ یہاں پھر آپ نے فرمایا میں پہچان گیا ہوں کہ یہ اللہ کی کلام ہے کیونکہ میں اسے تمام جہات، اور تمام اعضاء سے سن رہا ہوں۔ یہ اشارہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے رب سے کلام روحانی طور پر لیا پھر وہ کلام بدن کے لئے تمثیل بنا اور حس مشترک کی طرف منتقل ہوا پھر بغیر کسی عضو اور جہت کے اختصاص کے حس مشترک میں منقش ہو گیا (3)۔

[2] آپ جب وادی مقدس پہنچے تو حکم ہوا کہ جوتے اتار دو۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں تواضع اور ادب واحترام کے تقاضے پورے کرنے کے لئے حکم دیا گیا۔ امام بغوی فرماتے ہیں جوتے اتارنے کے حکم کا سبب وہ ہے جو ابن مسعود سے مرفوعاً مروی ہے۔ کہ آپ کے جوتے مردار گدھے کی کھال کے بنے ہوئے تھے اور یہ بھی روایت ہے کہ وہ غیر مدبوغ چمڑے کے تھے۔ عکرمہ اور مجاہد نے یہ وجہ بیان

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (التجاریہ) 2۔ ایضاً 3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 2-601 (العلمیہ)

کی ہے کہ یہ وادی مقدس ہے، جوتے اتار دو تا کہ اس بابرکت وادی کی خاک تمہارے قدموں سے لگے اور تم اس سے برکت حاصل کرو۔ اس وادی کو دومرتبہ پاک کیا گیا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم سنتے ہی جوتے اتار دیئے اور وادی کے باہر پھینک دیئے(1)۔

ع طوی کو کوفی اور شامی علماء نے یہاں بھی اور سورۃ النازعات میں بھی مکان کی تاویل میں تنوین کے ساتھ پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ الطی سے ثنی کی طرح نودی یا المقدس کا مصدر ہے یعنی دو ندائیں دی گئیں یا دومرتبہ سے پاک کیا گیا۔ میں کہتا ہوں الطی کا اصل معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ اس مشابہت کی وجہ سے یہ تثنیہ کے معنی میں استعمال ہوا ہے، باقی قراء نے علمیت اور عدل کی وجہ سے بغیر تنوین کے پڑھا ہے۔ یعنی غیر منصرف بنایا ہے۔ اور یعنی اس میں غیر منصرف کے دو سبب علمیت اور عدل پائے جاتے ہیں کیونکہ یہ وادی کا علم ہے اور یہ طاوٗ سے معدول ہے۔ یا علمیت کے ساتھ دوسرا سبب تانیث پایا جاتا ہے۔ جب کہ اسے بقعہ کی تاویل میں کیا جائے، طوی الوادی کا عطف بیان ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں وادی طوی گول اور گہری تھی۔ گولائی میں طور کی مثل تھی(2) بعض علماء فرماتے ہیں طویٰ تنوین کے ساتھ اپنے فعل کے قائم مقام مصدر ہے اور ظرف میں پوشیدہ ضمیر مرفوع سے حال ہے جو ضمیر موسیٰ کی طرف راجع ہے۔ یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جو آپ کو بطریق اجتباء (بانتخاب الٰہی) حاصل ہوئی گویا آپ نے اللہ تعالیٰ کی دستگیری سے وہ وادی طے کی۔ یہ وادی آپ نے تھوڑے سے وقت میں طے فرمائی حالانکہ اگر اپنی کوشش سے اس مسافت کو (جو اللہ اور بندے کے درمیان ہے) طے فرماتے تو بڑی مشکل سے طے ہوتی۔

صوفیاء رحمہم اللہ فرماتے ہیں قلب کا اصلی مقام عرش پر ہے۔ اگر انسان عبادت واجتہاد سے اس تک پہنچنا چاہے تو اسے پچاس ہزار برس کی مدت درکار ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ مدت چاہئے کیونکہ زمین اور عرش کے درمیان پچاس ہزار سال کی مسافت ہے۔ اسی کی طرف قرآن نے اشارہ فرمایا فِیْ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسِیْنَ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ لیکن اس عروج اور بلندی کو ایک سالک شیخ کامل کے جذب کے ذریعے بطور اجتباء (چناؤ، انتخاب) فوراً حاصل کر لیتا ہے۔ (یعنی مرشد کامل کی توجہ سے اللہ تعالیٰ خود اس کا انتخاب فرما کر اسے اس منزل مقصود تک پہنچا دیتا ہے)

سیر زاہد ہر شبے یک روزہ راہ سیر عارف ہر دمے تا تخت شاہ

کہ زاہد تو ایک رات میں ایک دن کی مسافت ہی طے کرتا ہے لیکن عارف کی سیر ہر لحظہ بادشاہ حقیقی کے تخت (عرش) تک ہوتی ہے۔

وَ اَنَا اخْتَرْتُكَ فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی ﴿۱۳﴾

''اور میں نے پسند کرلیا ہے تجھے (رسالت کے لئے) سو خوب کان لگا کر سن جو وحی کیا جاتا ہے [1]''

[1] یعنی میں نے تجھے نبوت اور رسالت کے لئے منتخب فرمالیا ہے۔ حمزہ نے انا کو انّا یعنی نون کی تشدید کے ساتھ اور اخترت کو اخترنا (بطور تعظیم) جمع کا صیغہ پڑھا ہے۔ لما یوحی کالام علی سبیل التنازع استمع اور اخترت دونوں فعلوں کے متعلق ہے۔

اِنَّنِیْۤ اَنَا اللّٰهُ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ ۙ وَ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ ﴿۱۴﴾

''یقیناً میں ہی اللہ ہوں نہیں ہے کوئی معبود میرے سوا [1] پس تو میری عبادت کیا کر اور ادا کیا کر نماز مجھے یاد کرنے کے لئے [2]''

[1] اِنّیْ کو نافع، ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ جملہ مایوحیٰ سے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 214 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

بدل ہے نیز اس میں توحید کا ذکر ہے جو علم کا کمال ہے۔ دوسرا اس میں عبادت کا حکم ہے جو عمل کا کمال ہے (یعنی علم وعمل کی معراج کا اس جملہ میں ذکر ہے)

۳۔ نماز چونکہ تمام عبادات سے افضل ترین عبادت ہے اس لئے اس کی اہمیت اور علوشان کے اظہار کے لئے دوبارہ علیحدہ ذکر فرمایا حالانکہ فاعبدنی کے امر میں اس کا ذکر بھی ضمناً آچکا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا نماز دین کا ستون ہے(1)۔ اس حدیث کو ابونعیم اور بیہقی نے حضرت عمر سے روایت کیا ہے اور صاحب مسند الفردوس نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے اس طرح روایت کی ہے کہ نماز ایمان کا ستون ہے(2) ابن عساکر نے حضرت انس سے یہ روایت کیا ہے کہ نماز ایمان کا نور ہے(3) صحیحین میں حضرت ابن مسعود سے روایت ہے، فرماتے ہیں میں نے رسول اللہ ﷺ سے پوچھا حضور ﷺ کون سا عمل اللہ کی بارگاہ میں محبوب ترین ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا نماز(4)۔ مسلم نے حضرت جابر سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بندے اور کفر کے درمیان (فاصل) نماز کا ترک ہے(5)۔ امام احمد اور اصحاب سنن نے حضرت بریدہ سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام احمد، دارمی اور بیہقی نے عبداللہ ابن عمر بن العاص سے روایت کیا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے ایک دن نماز کی اہمیت بیان کرتے ہوئے فرمایا جو نماز کی حفاظت کرے گا نماز قیامت کے روز اس کے لئے نور، دلیل اور نجات ہوگی اور جو اس کی محافظت نہیں کرے گا اس کے لئے نہ نور ہوگا اور نہ نجات اور وہ شخص قیامت کے روز قارون فرعون اور ھامان اور ابی بن خلف کے ساتھ ہوگا(6)۔

ترمذی نے عبداللہ بن شقیق سے روایت کیا ہے کہ فرمایا صحابہ کرام اعمال میں سے کسی عمل کو چھوڑنے کو کفر نہیں سمجھتے تھے لیکن نماز کے ترک کو کفر سمجھتے تھے(7)۔ ان احادیث کے ظاہری مفہوم کی بناء پر امام احمد بن حنبل نے فرمایا مَنْ تَرَکَ الصَّلٰوۃَ مُتَعَمِّداً فَقَدْ کَفَرَ جس نے جان بوجھ کر نماز کو ترک کیا اس نے کفر کیا۔ نماز کے تمام عبادات سے افضل ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اس کی ذات میں حسن ہے، جب کہ دوسری عبادات میں حسن کسی واسطہ سے ہے۔ مثلاً روزہ میں حسن ہے کیونکہ یہ نفس امارہ بالسوء کی نحوست کو ختم کرتا ہے۔ زکوٰۃ میں حسن ہے کہ یہ فقیر کی حاجت کو پورا کرتی ہے۔ حج میں حسن ہے کہ اس میں بیت اللہ شریف کی تعظیم ہے۔ اس نماز کے ذاتی حسن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کی اقامت کے حکم کے لئے علت (لذکری) ذکر فرمائی لذکری کو نافع اور ابوعمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز قائم کرو تا کہ مجھے اس میں یاد کرو۔ کیونکہ نماز اپنے تمام ارکان کے ساتھ ذکر الٰہی ہے۔ اس میں دل زبان اور جوارح کی عبادت ہے۔ بعض علماء لذکری کا معنی یہ فرماتے ہیں کہ میں نے نماز کا اپنی کتابوں میں ذکر کیا ہے اور ان میں میں نے نماز کا حکم دیا ہے۔ بعض نے یہ معنی فرمایا کہ تم نماز قائم کرو میں تمہارا رحمت اور ثناء کے ساتھ ذکر کروں گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں میں اپنے بندے کے ساتھ اس کے گمان کے مطابق سلوک کرتا ہوں اور جب وہ میرا ذکر کرتا ہے تو میں اس کے ساتھ ہوتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر دل میں کرتا ہے تو میں بھی تنہا اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اگر وہ میرا ذکر کسی محفل میں کرتا ہے تو میں اس کی محفل سے بہتر محفل میں اس کا ذکر کرتا ہوں۔ اس حدیث کو بخاری اور مسلم نے حضرت ابو ہریرہ سے روایت کیا ہے(8)۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ (لذکری) تقیید ہے۔ نماز کے قیام کے حکم کی تعلیل نہیں

1۔ کنز العمال، جلد 7، صفحہ 284 (التراث الاسلامی) 2۔ ایضاً، جلد 1، صفحہ 278 3۔ ایضاً، صفحہ 228
4۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 58 (قدیمی) 5۔ ایضاً
6۔ ایضاً، صفحہ 59 7۔ ایضاً 8۔ مشکوۃ المصابیح، صفحہ 196 (قدیمی)

ہے۔اور اس کا معنی یہ ہے کہ خالصۃً میری یاد کے لئے نماز ادا کرو، اس میں کوئی ریاءکاری کا شائبہ نہ ہو اور میرے ذکر کے ساتھ کسی غیر کی آمیزش نہ ہو۔ یہ آیت انہیں معنی کے اعتبار سے مجمل ہے اور اس کی تفصیل دوسرے مقام پر ہے۔ فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ اسی طرح جبرئیل کی امامت والی مشہور حدیث میں اس کی تفصیل ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے میری نماز کے ذکر کے لئے نماز قائم کرو۔ حضرت انس سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جو شخص نماز ادا کرنا بھول جائے یا نماز کے وقت سو گیا تو اس کا کفارہ یہ ہے کہ جس وقت اسے یاد آئے اسی وقت نماز ادا کرے۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ نماز کا اس کے علاوہ کوئی کفارہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے(1) حضرت ابو قتادہ سے مروی ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا سونے میں کوتاہی نہیں بلکہ کوتاہی صرف بیداری میں ہے، جب تم میں سے کوئی نماز بھول جائے یا نماز کے وقت سو گیا ہو تو اسے جب یاد آئے اس نماز کو ادا کرے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِیْ اس حدیث کو مسلم نے روایت کیا ہے(2)۔

اِنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ اَكَادُ اُخْفِيْهَا لِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا تَسْعٰى ﴿۱۵﴾

"بے شک وہ گھڑی (قیامت) آنے والی ہے [1] میں اسے پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں [2] تاکہ بدلہ دیا جائے ہر شخص کو اس کام کا جس کے لئے وہ کوشاں ہے [3]"

[1] یہ جملہ عبادت کے امر کی تعلیل کے مقام پر ہے یا عبادت کے امر کے فائدہ کے بیان کے لئے جملہ مستانفہ ہے۔ یا ڈرانے کے لئے جملہ معترضہ ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں اِنَّ سے پہلے واؤ حرف عطف مقدر ہے۔

[2] اخفش نے اکاد کا معنی ارید کیا ہے، یعنی میں قیامت کے وقت کو پوشیدہ رکھنا چاہتا ہوں۔ امام بغوی فرماتے ہیں کاد کا لفظ زائد ہے۔ معنی اخفی وقتھا ہے۔ یعنی میں اس کے وقت کو پوشیدہ رکھتا ہوں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کا یہ معنی ہے کہ میں اس کو چھپائے رکھتا اور میں یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ اگر بندوں پر شفقت اور ان کے عذروں کو ختم کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں اس کے آنے کی بھی خبر نہ دیتا۔ اس کی مثال قرآنی یہ ہے تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ (یعنی اگر اللہ کا حکم نہ ہوتا تو اللہ کا بیٹا بنانے والوں پر آسمان پھٹ پڑے)۔ میں کہتا ہوں شاید یہ اشارہ ہے کہ ایمان باللہ اور اللہ کی عبادت ایسے شرف حسن اور فضیلت والے اعمال ہیں کہ یہ لوگوں سے بذات مقصود ہونے چاہئے کسی غرض وعنایت اور جنت کی امید اور دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہیں ہونے چاہیں اگر چہ ایمان لانے اور عبادت کرنے کا ثمرہ جنت اور ایمان نہ لانے اور عبادت نہ کرنے کا نتیجہ دوزخ ہی ہے۔ لیکن ایمان ایسا عزت اور شرف والا عمل ہے کہ اس کا کرنا لازمی ہے۔ اور کفر فی نفسہ ذلت اور خسارہ ہے اس لئے اس سے اجتناب ضروری ہے۔ اگر اللہ تبارک وتعالیٰ قیامت کے آنے کی خبر نہ دیتے تو تب بھی ایمان لانے والوں کا ایمان جنت کے لالچ یا دوزخ کے خوف کی وجہ سے نہ ہوتا بلکہ خالصتاً اللہ کی رضا کے لئے ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا صہیب اچھا آدمی ہے اگر اسے اللہ کے عذاب کا خوف نہ بھی ہوتا تو یہ اس کی نافرمانی نہ کرتا۔ حضرت رابعہ بصریہ نے فرمایا میں چاہتی ہوں کہ جنت کو جلا دوں اور دوزخ کو بجھا دوں تاکہ لوگ بغیر کسی لالچ اور خوف کے خالصاً اللہ کی رضا کے لئے عبادت کریں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے بندوں پر مہربانی کرتے ہوئے اور کفار کے عذروں کو ختم کرتے ہوئے

1۔ مشکوٰۃ المصابیح صفحہ 196 (قدیمی) صفحہ 61 2۔ ایضاً

قیامت کی آمد کی خبر دے دی۔ اکثر مفسرین فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ میں قیامت کے وقت کو اپنے آپ سے پوشیدہ رکھتا ہوں تو پھر کوئی دوسرا کیسے پہچانے گا۔ اس تاویل کی تائید بعض قراءتوں سے ہوتی ہے جن میں فَكَيْفَ اُظْهِرُهَا لَكُمْ کے الفاظ موجود ہیں۔ یہ کلام عربوں کے محاورہ کی طرح ہے کہ جب وہ کسی چیز کے پوشیدہ کرنے میں مبالغہ کا اظہار کرتے ہیں تو کہتے ہیں میں نے تیرے راز کو اپنے سے چھپائے رکھا۔ یعنی میں نے اسے انتہائی پوشیدہ رکھا اور قیامت کے وقت کو بیان نہ کرنے میں حکمت یہ ہے کہ جب لوگوں کو اس کے آنے کے وقت کا علم نہیں ہوگا تو وہ ہر وقت خوفزدہ رہیں گے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہاں افعال کا ہمزہ سلب کے لئے ہے۔ معنی یہ ہوگا کہ میں اس سے پردہ ہٹا دوں گا۔ اسے ظاہر کر دوں گا۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں اظہار والے معنی کی تائید اخفی کے ہمزہ کے فتحہ والی قرأت بھی کرتی ہے(1)۔ امام بغوی فرماتے ہیں اخفی کو ہمزہ کے فتحہ کے ساتھ پڑھا گیا ہے، جس کا معنی ہوگا، میں ظاہر کروں گا عرب کہتے ہیں خفیت الشئی جب کوئی کسی چیز کو ظاہر کر دے اور اخفیت الشئی جب کوئی کسی چیز کو چھپا دے(2)۔ نهايه للجزری میں یہی تحقیق لکھی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ جب خفا (مجرد) کا معنی ظاہر کرنا ہے اور متواتر ذہنی (مذید فیہ) کا معنی چھپانا ہے تو پھر قرات متواترہ کا معنی ظاہر کرنا کیسے ہو سکتا ہے اور حضرت حسن بصری کی قرأت اس کی تائید کیسے کرتی ہے۔ میں کہتا ہوں خفا مجرد کبھی ظاہر کرنے اور کبھی چھپانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے خفي' يخفي' خفيًا۔ بروزن رفى يرفى اظهره واستخرجه(3) (خفی کا معنی ظاہر کرنا ہے) خفي يخفيٰ بروزن رضی یرضیٰ۔ خفا فهو خاف وخفی اس کا معنی چھپنا اور ظاہر نہ ہونا ہے۔ پس جب ماضی مجرد باب ضرب پر همزہ افعال زائدہ کیا جائے گا تو اس کا معنی چھپانا اور ظاہر نہ کرنا ہوگا۔ جیسا کہ مشہور معنی ہے اور جب باب سمع پر همزہ افعال زائدہ کیا جائے گا تو معنی ظاہر کرنا اور نہ چھپانا ہوگا۔

ﷺ یہ آتية يا اخفيها کے متعلق ہے بشرطیکہ اخفيها کا معنی ظاہر کرنا ہو۔ اگر یہ معنی ہو کہ میں اس کی آمد کے وقت کو چھپائے رکھتا اور یہ بھی نہ کہتا کہ یہ آنے والی ہے۔ تب بھی بما تسعیٰ اتية يا اخفيها کے متعلق ہوگا۔ یعنی میں اس کے آنے کی خبر نہ دوں گا حتی کہ ہر نفس کو بدلہ دیا جائے گا جو اس نے اللہ کی رضا کے لئے کیا، اس عمل میں نہ اسے جنت کا لالچ تھا اور نہ دوزخ کا خوف تھا اور پھر ایسے عمل کی جزاء اللہ کی ملاقات اور زیارت اور اس کے قرب کے مراتب ہیں۔

فَلَا يَصُدَّنَّكَ عَنْهَا مَنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهَا وَ اتَّبَعَ هَوٰىهُ فَتَرْدٰى ⑯

''پس ہرگز نہ روکے تجھے اس (کو ماننے) سے لے وہ شخص جو نہیں ایمان رکھتا اس پر اور پیروی کرتا ہے اپنی خواہش کی ﷺ ورنہ تم بھی ہلاک ہو جاؤ گے ﷺ''

لے عنها کی ضمیر کا مرجع 'لقاء الله' یا قیامت کے آنے پر ایمان' یا اقامة الصلوٰة ہے۔ ظاہراً یہاں کافر کو منع فرمایا کہ موسیٰ علیہ السلام کو اس سے نہ روکے' لیکن مراد موسیٰ علیہ السلام کو منع کرنا ہے کہ کافر کے کہنے اور روکنے پر آپ اس پر ایمان لانے سے نہ رکیں۔ اس اسلوب سے اس بات پر تنبیہ ہے کہ فطرت سلیمہ قیامت سے اعراض کرنے کا انکار کرتی ہے اور وہ دین میں رسوخ اور پختگی کا تقاضا کرتی ہے۔ اور کافر کا اس بات سے روکنا دین میں کجی پیدا کرنے کے لئے ہے۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 650 (العلمیۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریۃ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1680 (التراث الاسلامی)

۲ یعنی وہ نہ روکے جو اس پر خود ایمان نہیں رکھتا اور خواہش نفس کا بندہ ہے۔ مالی لذتوں کی طرف مائل ہے اور اس نے اس بات سے آنکھیں بند کر رکھی ہیں کہ اس قیامت کے انکار میں کتنی برائی ہے اور اس پر کتنا عذاب ہے۔ واتبع یا تو لایومن پر معطوف ہے۔ یا قد کی تقدیر کے ساتھ لایومن کے فاعل سے حال ہے۔

۳ قیامت پر ایمان لانے سے رکنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاؤ گے۔ فاء کے بعد ان مقدر ہے، اس کے سبب فعل منصوب ہے۔

وَ مَا تِلْكَ بِيَمِيْنِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۱۷﴾

"اور (ندا آئی) یہ آپ کے دائیں ہاتھ میں کیا ہے اے موسیٰ ۱"

۱ یہ استفہام اور سوال لاعلمی اور بے خبری کی وجہ سے نہیں بلکہ اس بات پر آگاہ کرنے کے لئے ہے، کہ یہ ڈنڈا ہے اس سے بڑے بڑے عجائب اور معجزات کا اظہار ہوگا۔ ما کا کلمہ مبتدا ہے۔ اور تلک خبر ہے بیمینک محذوف منصوب کے متعلق ہو کر حال ہے اور اس کا عامل اسم اشارہ کا معنی ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قارةً او ماخوذةً بیمینک۔ یا تلک (بقول علماء کوفہ) اسم موصول ہے اور بیمینک اس کا صلہ ہے۔ یا موسیٰ کا تکرار مانوس کرنے اور تنبیہ کرنے کے لئے ہے۔

قَالَ هِيَ عَصَايَ ۚ اَتَوَكَّؤُا عَلَيْهَا وَاَهُشُّ بِهَا عَلٰى غَنَمِيْ وَلِيَ فِيْهَا مَاٰرِبُ اُخْرٰى ﴿۱۸﴾

"عرض کی (میرے رب) یہ میرا عصا ہے میں ٹیک لگاتا ہوں اس پر اور میں پتے جھاڑتا ہوں اس سے اپنی بکریوں کے لئے اور میرے لئے اس میں کئی اور فائدے بھی ہیں۔ ۱"

۱ امام بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کے عصا کی دو شاخیں تھیں اور نیچے نوک بنی ہوئی تھی اور اس پر شانبہ چڑھی ہوئی تھی۔ مقاتل فرماتے ہیں اس ڈنڈے کا نام نبعہ تھا(1)۔ جب درخت سے پتے جھاڑنے کے لئے زور سے ڈنڈا مارا جاتا ہے تو اس کے لئے هش الورق۔ استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں اس کی یہی تشریح لکھی ہے(2)۔ وَلِیَ ورش اور حفص نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ ما رب کا معنی مقاصد اور اُخریٰ مارب کی صفت ہے۔ قیاس کا تقاضا تو یہ تھا کہ اُخرٰ ہوتا لیکن آیت کے سرے ملانے کے لئے اُخریٰ ذکر فرما دیا۔ موسیٰ علیہ السلام دوسرے جو مقاصد اس ڈنڈے سے حاصل کرتے تھے وہ یہ تھے آپ جب چلتے تو اسے کندھے پر رکھ لیتے اور اس کے ساتھ اپنا لوٹا اور سامان لٹکا لیتے، اس کی شاخوں پر آگ جلانے والی لکڑیاں رکھتے جن کی وجہ سے آگ نکل پڑتی، اس کے اوپر کپڑا ڈال کر سایہ حاصل کرتے، کنویں سے پانی نکالنے والی رسی چھوٹی ہوتی تو ڈنڈا اس کے ساتھ باندھ کر اسے لمبا کر لیتے اور جب درندے آپ کی بکریوں پر حملہ کرتے تو آپ اس کے ساتھ ان کا دفاع کرتے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام سوال کا مقصود سمجھ گئے تھے کہ اللہ تعالیٰ اس کی حقیقت اور اس کے منافع کا بیان چاہتے ہیں۔ پھر جب آپ نے اس حقیقت کے خلاف اس میں کچھ معجزات دیکھے اور اس کے دوسرے خصائص مشاہدہ فرمائے تو آپ کو یقین ہو گیا کہ یہ معجزہ ہے(3) اسی وجہ سے اس کی حقیقت اور اس کے منافع کو مفصل اور مجمل بیان فرمایا تا کہ جواب اس غرض کے مطابق ہو جائے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 215 (التجاریہ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 830 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 607 (العلمیہ)

جوموسیٰ علیہ السلام نے سمجھی تھی۔ کلام کا معنی یہ ہے کہ یہ ڈنڈا دوسرے ڈنڈوں کی جنس سے ہے، اس سے وہ منافع حاصل ہوتے ہیں جو دوسرے ڈنڈوں سے حاصل ہوتے ہیں۔

بعض اہل محبت وعشق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے بقدر ضرورت جواب سے زائد کلام اس لئے فرمائی تا کہ محبوب سے کلام کی لذت حاصل کریں پھر زیادہ تفصیل سے بھی جواب نہیں دیا تا کہ کلام کے طویل ہونے کی وجہ سے بے ادبی نہ ہو جائے، یعنی ادب واحترام کے تقاضا کی بناء پر کلام کو زیادہ طویل بھی نہیں کیا۔

قَالَ اَلْقِهَا يٰمُوْسٰى ﴿۱۹﴾

''حکم ہوا ڈال دے اسے زمین پر موسیٰ ۱؎ ''

۱؎ یعنی اپنے عصا کو زمین پر ڈال دو اور اس کے دوسرے مقاصد کی حقیقت جان لو گے وھب فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے یہ سمجھا کہ اللہ تعالیٰ مجھے اسے پھینکنے کا حکم فرما رہے ہیں(1)۔

فَاَلْقٰىهَا فَاِذَا هِيَ حَيَّةٌ تَسْعٰى ﴿۲۰﴾

''تو آپ نے اسے زمین پر ڈال دیا پس اچانک وہ سانپ بن کر (ادھر ادھر) دوڑنے لگا۔ ۱؎ ''

۱؎ جونہی موسیٰ علیہ السلام نے اس ڈنڈے کو پھینکا تو وہ سانپ بن کر تیزی سے پیٹ کے بل دوڑنے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر (حیۃ) کی جگہ جان فرمایا ہے۔ كَاَنَّهَا جَآنٌّ۔ جان چھوٹے باریک جسم والے سانپ کو کہتے ہیں۔ اور ایک مقام پر ثعبان فرمایا فاذا ھی ثعبان' ثعبان تمام سانپوں سے بڑا ہوتا ہے حیۃ کا لفظ چھوٹے' بڑے مذکر اور مونث تمام قسم کے سانپوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ ثعبان اور جان ایک سانپ کے لئے استعمال نہیں ہوسکتے تو اس کا جواب کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک ہی سانپ کے لئے کبھی ثعبان کبھی جان اور کبھی حیہ کا لفظ استعمال فرمایا۔ بعض علماء نے ان آیات میں تطبیق اس طرح کی ہے کہ اس کی ابتدائی حالت کے اعتبار سے اسے جان فرمایا۔ کیونکہ پہلے وہ ڈنڈے کی مقدار میں تھا۔ پھر وہ پھول گیا حتیٰ کہ ثعبان بن گیا۔ یعنی اس کی انتہائی اور آخری حالت کے اعتبار سے ثعبان فرمایا۔ بعض نے اس طرح مطابقت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ سانپ بڑائی میں ثعبان تھا، تیزی میں جان تھا اسی وجہ سے كانها جان فرمایا (گویا وہ جان تھا) فاذا ھی جان نہیں فرمایا جس طرح کہ فرمایا فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ (تو فوراً وہ صاف اژدھا بن گیا) محمد بن اسحاق فرماتے ہیں کہ موسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ ڈنڈا ایک بڑا سانپ بن گیا ہے اور اس کی شاخیں اس کے لئے باچھیں بن گئی ہیں اور نوک (برچھی) گردن اور کلغی ہوگئی ہے اور وہ حرکت کر رہی ہے اور اس کی آنکھیں آگ کی طرح چمک رہی ہیں۔ وہ جب بڑی بڑی چٹانوں کے پاس سے گذرتا جو اونٹوں کی مثل تھیں تو انہیں بھی نگل لیتا، وہ درختوں کے نیچے آتا تو پتے خود بخود جھڑنے لگتے اور موسیٰ علیہ السلام نے اس کے دانتوں کے پیسنے کی آواز سنی۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ ہیبت ناک منظر دیکھا تو آپ پیٹھ پھیر کر بھاگ پڑے۔ پھر اپنے رب کو یاد کیا اور ندامت آمیز کیفیت میں کھڑے ہو گئے(2)۔

قَالَ خُذْهَا وَلَا تَخَفْ ۫ سَنُعِيْدُهَا سِيْرَتَهَا الْاُوْلٰى ﴿۲۱﴾

''حکم ہوا اسے پکڑ لو اور مت ڈرو ہم لوٹا دیں گے اسے اپنی پہلی حالت پر ۱؎ ''

1۔ تفسیر بغوی، جلد4، صفحہ 215 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً، صفحہ 216

لہ اے کلیم واپس آؤ اور اسے پکڑلو اور ڈریئے مت۔ اِنِّیْ لَا یَخَافُ لَدَیَّ الْمُرْسَلُوْنَ ۝ اِلَّا مَنْ ظَلَمَ ثُمَّ بَدَّلَ حُسْنًۢا بَعْدَ سُوْٓءٍ فَاِنِّیْ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔ میرے حضور ڈرا نہیں کرتے جنہیں رسول بنایا جاتا ہے مگر وہ شخص جو زیادتی کرے (وہ ڈرے) پھر (وہ ظالم بھی اگر نیکی کرنے لگے برائی کرنے کے بعد تو میں بے شک غفور رحیم ہوں)

ہم اسے بالکل پہلی ہیئت پر لوٹا دیں گے۔ سیرہ فعلة کے وزن پر سیر سے مصدر ہے اس کا معنی طریقہ اور ہیئت ہے اور سیرة ترکیب نحوی کے اعتبار سے سنعیدھا کی ضمیر منصوب سے بدل اشتمال ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں حرف جر کے حذف کے ساتھ منصوب ہے اصل میں الی سیرتھا تھا یا یہ کہا جائے گا کہ اعاذ عادہ سے منقول ہے اور عاد الیہ کے معنی میں ہے یا ظرف کی وجہ سے منصوب ہے۔ یعنی سنعیدھا فی سیرتھا تھا۔ یا فعل مقدر کے مصدر کی حیثیت سے منصوب ہے یا اس طریقہ پر منصوب ہے ضربتہ سوطاً۔ (یعنی مفعول مطلق کے قائم مقام اس کا آلہ رکھا جائے) یا یہ مفعول ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے کیونکہ نعید جعل کے معنی کی تضمین کے ساتھ ہے۔ یعنی ہم اس عصا کو لوٹا دیں گے درآں حالیکہ ہم اس کو پہلی حالت پر بنا دیں گے پھر اس سے اسی طرح نفع اٹھائے گا جس طرح تو پہلے اٹھاتا تھا۔ امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے ایک اونی قمیص پہنی ہوئی تھی، جب اللہ تعالیٰ نے سانپ کو پکڑنے کا حکم دیا تو آپ نے قمیض کی ایک طرف اپنے ہاتھ پر لپیٹ دی۔ اللہ تعالیٰ نے ہاتھ کھولنے کا حکم فرمایا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ کھول دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ جب آپ نے ہاتھ پر کپڑا لپیٹا تو موسیٰ علیہ السلام سے ایک فرشتہ نے کہا جناب جس مصیبت سے آپ بچنا چاہتے ہیں اگر اللہ تعالیٰ اس کا حکم فرما دیں تو کیا یہ کپڑا تمہیں اس مصیبت سے بچا سکتا ہے؟ فرمایا نہیں لیکن میں خلیفہ ہوں اور میری تخلیق ہی کمزور کی گئی ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ سے کپڑا اتار دیا اور (توکل برخدا کر کے) اپنا ہاتھ سانپ کے منہ میں ڈال دیا۔ تو وہ فوراً پہلے کی طرح ڈنڈا بن گیا۔ اور آپ کے ہاتھ ان شاخوں پر تھے جہاں آپ سہارا لینے کے وقت ہاتھ رکھا کرتے تھے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو ایسے معجزات دکھانے کا اس لئے ارادہ فرمایا تا کہ جب فرعون جیسے ظالم و جابر بادشاہ کے سامنے آپ اپنے ڈنڈے کو پھینکیں (اور یہ سانپ بن جائے) تو آپ گھبرا نہ جائیں (1) امام بغوی نے لکھا ہے کہ ابن عباس سے مروی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اپنے عصا پر کھانا، مشکیزہ اٹھاتے تھے اور وہ آپ کے ساتھ چلتے ہوئے کلام بھی کرتا تھا۔ آپ اسے زمین پر مارتے تو اس کا کھانا نکل آتا، آپ اسے زمین میں گاڑھتے تو پانی نکل آتا، جب آپ اسے کھینچ لیتے تو پانی رک جاتا، اور کبھی آپ کا دل پھل فروٹ کھانے کا ہوتا تو اسے گاڑھ دیتے، اس پر ٹہنیاں پتے اور پھل لگ جاتے اور جب کنویں سے پانی نکالنے کا ارادہ فرماتے تو اسی عصا کو لٹکاتے تو وہ کنویں کی مقدار لمبا ہو جاتا۔ اور اس کی شاخیں ڈول کی طرح ہو جاتیں۔ حتیٰ کہ آپ پانی نوش فرما لیتے۔ رات کو وہی عصا چراغ کا کام دیتا اور جب کوئی دشمن حملہ آور ہوتا تو آپ اسی ڈنڈے کے ساتھ جنگ کرتے اور اپنا دفاع کرتے (2)۔

وَاضْمُمْ يَدَكَ اِلٰى جَنَاحِكَ تَخْرُجْ بَيْضَآءَ مِنْ غَيْرِ سُوْٓءٍ اٰيَةً اُخْرٰى ۝۲۲

''اور (حکم ملا) دبالو اپنا ہاتھ اپنے بازو کے نیچے لہ یہ نکلے گا خوب سپید ہو کر بغیر کسی بیماری کے یہ دوسرا معجزہ (ہم نے تمہیں دیا ہے ۲''

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریہ) 2۔ ایضاً صفحہ 215

لہ امام بغوی فرماتے ہیں جناح سے مراد بائیں بغل ہے۔ مجاہد نے اس کا معنی تحت لکھا ہے۔ جناح الانسان انسان کے بازو کو کہتے ہیں اور یہ بغل تک کو شامل ہے (1)۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ پرندے کے پروں سے استعارہ ہے۔ ان کو جناح اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں کو جھکاتا ہے (2)۔ قاموس میں ہے کہ جوانح سے مراد وہ پسلیاں ہیں جو سینے کے نیچے ہوتی ہیں اور سینے سے ملی ہوئی ہوتی ہیں اس کا واحد جانحۃ ہے (3)۔ جناح کا لفظ ید (ہاتھ) عضو مضد (بازو) اور ابط (بغل) کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔
تخرج جواب امر کی وجہ سے مجزوم ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ اضمم یدک الی جناحک واخرج تخرج۔ بیضاء کا معنی چمک دار ہے۔ یہ تخرج کی ضمیر مستتر سے حال ہے۔ من غیر سوء یعنی بغیر کسی عیب اور قبح کے یہ برص کی بیماری سے کنایہ ہے کیونکہ طبیعت برص کی بیماری (جس سے جسم پر سفید داغ بن جاتے ہیں) نفرت کرتی ہے۔ یہ بیضاء کے متعلق ہے کیونکہ یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ گویا ابیضت من غیر سوء ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ابن عباس نے فرمایا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ میں ایسا نور تھا جو دن رات سورج اور چاند کی طرح چمکتا تھا (4)۔
ﷺ ایۃ اخری یعنی تمہارے دعویٰ نبوت کی صداقت پر یہ دوسری دلیل ہے اور یہ تخرج کی ضمیر مستتر سے یا بیضاء کی ضمیر سے دوسرا حال ہے۔ یا خذ مضمر یا دونک (بمعنی خذ) مضمر کا مفعول ہے۔

لِنُرِيَكَ مِنْ اٰيٰتِنَا الْكُبْرٰى ۝۲۳

"تاکہ ہم دکھائیں تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں لہ"

لہ لنریک خذیا دونک مضمر کے متعلق ہے یا جس فعل پر آیت یا قصہ دلالت کر رہا ہے۔ یعنی ہم نے ایسا اس لئے کیا ہے تاکہ تمہیں اپنی بڑی بڑی نشانیاں دکھائیں۔ الکبری یا تو ایاتنا کی صفت ہے۔ لنریک کا دوسرا مفعول ہے اور من آیاتنا اس سے حال ہے۔ الکبر کی بجائے الکبری فرمایا تاکہ آیات کے سرے مل جائیں۔ بعض علما فرماتے ہیں اس کلام میں اضمار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے لِنُرِيَكَ الْاٰيَةَ الْكُبْرٰى مِنْ اٰيٰتِنَا۔ ابن عباس فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ مبارک اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانی تھی (5)۔

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۲۴

"(اب) جائیے فرعون کے پاس وہ سرکش بن گیا ہے لہ"

1۔ یعنی موسیٰ علیہ السلام کو حکم فرمایا کہ اپنی صداقت کی دو نشانیاں لے کر فرعون کے پاس جاؤ اور اسے میری عبادت کی دعوت دو۔ وہ حد سے بڑھ گیا ہے اور سرکشی اور نافرمانی میں انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس نے مملکت اور اقتدار کے نشے میں بدمست ہو کر الوہیت کا دعویٰ کر دیا ہے۔ انه طغیٰ کا جملہ اذھب کی تعلیل بیان کر رہا ہے۔

قَالَ رَبِّ اشْرَحْ لِيْ صَدْرِيْ ۝۲۵

"آپ نے دعا مانگی اے میرے پروردگار کشادہ فرما دے میرے لئے میرا سینہ لہ"

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریہ)
2۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 609 (العلمیہ)
3۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 216 (التجاریہ)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216
6۔ ایضا

لہ موسیٰ علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے التجا کی کہ میرا سینہ کشادہ فرما دے، اس میں وہ عرفان اور معارف ڈال دے جن کا ادراک عقل انسانی سے وراء ہے۔ اوران ادراکات میں ایک درک یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی انسان کسی چیز کے نفع اور نقصان کے پہنچانے کی قدرت نہیں رکھتا۔ عرض کی اے مولا ایسا یقین اور عرفان عطاء فرما کہ دل سے فرعون کا اور اس کے لشکریوں کا خوف نکل جائے۔ حضرت ابن عباس فرماتے ہیں آپ کی مراد یہ تھی کہ میرا سینہ اس طرح منشرح فرما دے کہ میں تیرے سوا کسی سے نہ ڈروں۔ موسیٰ علیہ السلام فرعون کی سطوت و شوکت سے اور اس کے لشکر کی ہیبت سے بہت خوفزدہ تھے اس لئے آپ نے اس خوف سے نجات کی التجا کی (1)۔

وَ يَسِّرْ لِيْٓ اَمْرِيْ ﴿٢٦﴾

''اور آسان فرما دے میرے لئے میرا یہ (کٹھن) کام لہ''

لہ نافع اور ابو عمرو نے لِیَ کو یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ یعنی اے میرے پالنہار تو نے تبلیغ رسالت کا کام میرے کندھوں پر ڈالا ہے۔ اس کو میرے لئے آسان فرما دے تاکہ مجھ سے کسی مشکل اور کٹھن کام کی تکلیف کا اندیشہ دور ہو جائے اور تکالیف کے کانٹوں کو برداشت کر کے میرا نفس لذت محسوس کرے۔ لی ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ پہلے اشرح لی اور یسر لی فرمایا تو مشروح اور مُیَسَّرْ (جس کی شرح کرنی ہے اور جس کو آسان کرنا ہے) کا علم تو ہو گیا لیکن اس میں ابہام تھا۔ پھر مشروح اور میسر کو ذکر فرما کر ابہام کو دور کر دیا اور وہ مشروح و میسر۔ سینہ اور امر ہیں۔ تو ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنا۔ یہ تاکید اور مبالغہ کے لئے ہے (کیونکہ ابہام کے بعد ابہام کو دور کرنے میں اجمال اور تفصیل کے طریق سے ایک معنی کا تکرار ہوتا ہے)۔

وَ احْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ ﴿٢٧﴾

''اور کھول دے گرہ میری زبان کی لہ''

لہ من لسانی یا تو عقدۃ کی صفت ہے یا احلل کے متعلق ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام صغر سنی میں فرعون کی پرورش میں تھے تو ایک دن موسیٰ علیہ السلام نے اسے زور سے طمانچہ مارا اور اس کی داڑھی سے پکڑ لیا۔ فرعون نے اپنی بیوی آسیہ سے کہا یہ میرا دشمن ہے، فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا (تمہارا دماغ اپنی جگہ پر ہے؟) یہ معصوم بچہ ہے۔ بے سمجھ ہے (اگر اس نے تجھے طمانچہ مار بھی دیا ہے تو کون سا آسمان گر پڑا ہے) ایک روایت میں ہے۔ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے جب آپ کا دودھ چھڑایا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام کو آسیہ کے پاس پہنچا دیا۔ آپ فرعون اور آسیہ کی پرورش میں تھے۔ دونوں نے آپ کو بیٹا بنایا ہوا تھا۔ اسی صغر سنی کے دوران آپ ایک دن فرعون کے سامنے کھیل رہے تھے اور آپ کے ہاتھ میں ایک چھڑی تھی جس سے آپ کھیل رہے تھے۔ آپ نے اچانک چھڑی اٹھائی اور فرعون کے سر پر دے ماری۔ (فرعون کو غصہ آیا) اور اس نے آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ آسیہ نے کہا اے بادشاہ یہ معصوم بچہ ہے، اسے کوئی سمجھ نہیں ہے، اس کی بے سمجھی کا تو اگر چاہتا ہے تو تجربہ کر لے۔ آسیہ دو تھال (ڈش) لے کر آئی جن میں سے ایک میں آگ کے انگارے تھے اور دوسری میں جواہر و موتی تھے۔ وہ دونوں تھال جب موسیٰ علیہ السلام کے سامنے رکھے گئے۔ تو موسیٰ علیہ السلام نے جواہر اٹھانے کا ارادہ کیا لیکن جبرئیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ آگ پر رکھ دیا اور ایک انگارہ اٹھا کر منہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 216 (التجاریۃ)

میں ڈال لیا۔اس سے آپ کی زبان جل گئی اوراس پر ایک گرہ بن گئی(1)۔

عبد بن حمید، ابن المنذر، ابن ابی حاتم نے سعید بن جبیر سے نقل کیا ہے کہ فرعون ایک دن موسیٰ علیہ السلام کو اٹھائے ہوئے تھا تو آپ نے اس کی داڑھی سے پکڑا اورا سے زور سے کھینچا۔ وہ ظالم غصہ سے لال پیلا ہو گیا اور آپ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا۔آسیہ نے کہا۔ یہ چھوٹا بچہ ہے اسے تو انگاروں اور جواہر و یاقوت کے فرق کا بھی پتہ نہیں چلتا۔آپ کے سامنے یہ دونوں چیزیں لائی گئیں تو آپ نے جواہر کو اٹھانے کا ارادہ فرمایا لیکن جبرئیل نے آپ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ پھر آپ نے اپنا ہاتھ انگارے پر رکھا اور انگارہ اٹھا کر منہ میں ڈال دیا جس کی وجہ سے آپ کی زبان جل گئی اور گرہ پڑ گئی۔

يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ ﴿۲۸﴾

''تا کہ اچھی طرح سمجھ سکیں وہ لوگ میری بات ۱؎ ''

۱؎ آپ کی زبان کی گرہ مکمل طور پر کھلنے میں اختلاف ہے۔

جو علماء فرماتے ہیں کہ آپ کی زبان کی گرہ مکمل طور پر ختم ہو گئی تھی ان کی دلیل یہ ارشاد ہے۔قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى (منظور کر لی گئی ہے تیری درخواست اے موسیٰ) کیونکہ جو آپ نے دعا اور التجا کی تھی اس آیت میں اس کی قبولیت کا مژدہ ہے۔تو معلوم ہوا کہ آپ کی زبان کی گرہ بھی کھل گئی تھی اور جو کہتے ہیں کہ یہ گرہ نہیں کھلی تھی وہ اس ارشاد سے استدلال کرتے ہیں۔هُوَ اَفْصَحُ مِنِّيْ لِسَانًا دوسری دلیل یہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت کرتے ہوئے کہا ہے۔اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۚ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ۔ ترجمہ:۔کیا میں بہتر نہیں ہوں اس شخص سے جو ذلیل ہے اور بات بھی صاف نہیں کر سکتا پہلے قول کا۔دوسرے طبقہ کے علماء نے یہ جواب دیا ہے کہ آپ نے مطلقاً اپنی زبان کی گرہ کھولنے کا سوال نہیں کیا تھا بلکہ اتنی گرہ دور کرنے کا سوال کیا تھا جو دوسروں کو بات سمجھانے سے مانع ہو،اسی وجہ سے اس کو نکرہ ذکر فرمایا اور یفقھو کو امر کے جواب میں مجزوم ذکر فرمایا ہے۔

وَ اجْعَلْ لِّيْ وَزِيْرًا مِّنْ اَهْلِيْ ﴿۲۹﴾ هٰرُوْنَ اَخِي ﴿۳۰﴾

''اور مقرر فرما میرا وزیر میرے خاندان سے یعنی ہارون کو جو میرا بھائی ہے ۱؎ ''

۱؎ وزیراً، وزرٌ سے مشتق ہے جس کا معنی بوجھ ہے۔چونکہ وزیر امیر (بادشاہ) کا بوجھ اٹھاتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں یا یہ اس الوزر سے مشتق ہے۔جس کا معنی وہ پناہ گاہ ہے جو پہاڑ میں ہوتی ہے کیونکہ بادشاہ اس کی رائے اور مشورے کی وجہ سے محفوظ ہو جاتا ہے اور تمام امور میں اس کی طرف پناہ لیتا ہے اس لئے اسے وزیر کہتے ہیں۔اسی سے الموازرة ہے۔بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل ازیر ہے اور یہ الازر سے مشتق ہے۔جس کا معنی قوت ہے، یہ فعیل بمعنی مفاعل ہے جیسے عشیر بمعنی معاشر اور جلیس بمعنی مجالس ہے۔ چونکہ امواززمیں ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے اس لئے ازیر میں بھی ہمزہ واؤ سے بدل جاتا ہے کیونکہ ان دونوں کا معنی ایک ہے۔ من اھلی یا تو وزیر کی صفت ہے یا اجعل کے متعلق ہے اور ھارون اجعل کا مفعول اول ہے اور وزیر مفعول ثانی ہے لیکن اہمیت کے پیش نظر اسے مقدم کیا گیا ہے۔اور لی یا تو فعل کے متعلق ہے۔یا محذوف کے متعلق ہو کر وزیراً سے حال ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لی مفعول ثانی ہو اور وزیراً مفعول اول ہو۔اور ہارون وزیر کا عطف بیان ہو۔یہ بھی ترکیب ہو سکتی ہے کہ وزیراً مفعول اول ہو اور من

1۔تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

اھلی مفعول ثانی ہو اور لی تبیین ہو جیسے وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ میں ہے اخی کو ابن کثیر اور ابو عمرو نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یا کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ اور اخی ہارون سے بدل ہے یا مبتدا ہے اور مابعد اس کی خبر ہے۔

اشْدُدْ بِهٖٓ اَزْرِيْ ۝

''مضبوط فرما دے اس سے میری کمر لے''

لے قاموس میں الازر کا معنی احاطہ قوت' ضعف ضد التقويه اور پیٹھ لکھا ہے(1)۔ معنی یہ ہے کہ اس سے میری کمر مضبوط کر دے یا میری قوت مضبوط کر دے یا میرے ضعف کو قوت عطا فرما دے۔

وَ اَشْرِكْهُ فِيْٓ اَمْرِيْ ۝

''اور شریک کر دے اسے میری (اس) مہم میں لے''

لے اسے امر نبوت اور تبلیغ میں میرا شریک بنا دے۔ ابن عامر نے اشدد کو الف کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، یعنی ہمزہ قطعی کے ساتھ پڑھا ہے اور اشرک کو مضارع کا صیغہ کر کے همزہ کو ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور اسے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ جمہور علماء نے اشدد کو ہمزہ وصلی مفہوم کے ساتھ اور اشرک کو ہمزہ قطعی مفتوح کے ساتھ پڑھا ہے کیونکہ یہ اجعل سے بدل اشتمال ہے۔

كَيْ نُسَبِّحَكَ كَثِيْرًا ۝ وَّ نَذْكُرَكَ كَثِيْرًا ۝ اِنَّكَ كُنْتَ بِنَا بَصِيْرًا ۝

''تاکہ ہم دونوں کثرت سے تیری پاکی بیان کریں اور ہم کثرت سے تیرا ذکر کریں بیشک تو ہمارے (ظاہر باطن کو) خوب دیکھنے والا ہے لے''

لے کلبی نے نسبح کا معنی نصلی کیا ہے، یعنی ہم کثرت سے تیری نماز پڑھیں(2) آپ نے یہ درخواست اس لئے کی تھی کیونکہ تعاون رغبت کو مزید بڑھاتا ہے اور زیادہ نیکیاں کرنے پر برانگیختہ کرتا ہے تو ہمارے حال سے اچھی طرح باخبر ہے اور تو یہ بھی جانتا ہے کہ تعاون ہمارے لئے بہتر ہے اور تجھے یہ بھی علم ہے کہ میرے اس معاملہ میں جس کا تو نے مجھے حکم فرمایا ہے ہارون بہتر مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

قَالَ قَدْ اُوْتِيْتَ سُؤْلَكَ يٰمُوْسٰى ۝

''جواب ملا منظور کر لی گئی ہے آپ کی درخواست اے موسیٰ لے''

لے سئول بروزن فعل ہے اور یہ مفعول کے معنی میں ہے جیسے خبز بمعنی مخبوز اور اکل بمعنی ماکول ہوتا ہے۔

وَ لَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً اُخْرٰىٓ ۝

''اور ہم نے احسان فرمایا تھا تم پر ایک بار پہلے بھی لے''

لے یہ محذوف قسم کا جواب ہے، یعنی قسم بخدا ہم نے تم پر انعام کیا تھا۔ اس سے پہلے بھی۔ مرة اخریٰ مَنَنَّا کی ظرف ہے۔ بعض نے مَرَّةً اُخْرٰى کا معنی اس مرتبہ کیا ہے۔

اِذْ اَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اُمِّكَ مَا يُوْحٰٓى ۝

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 491 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)

"جب ہم نے وہ بات الہام کی تھی تمہاری ماں کو1۔ جو الہام ہی کئے جانے کے قابل تھی 1۔"

1۔ اذ تعلیل کے لئے ہے اور مَنَنَّا کی ظرف بھی ہوسکتا ہے۔ یہاں وحی سے مراد الہام ہے یا خواب میں بتانا ہے یا اس وقت جو نبی تھا اس کے ذریعے بتانا ہے یا فرشتے کے ذریعے بتانا ہے جیسے حضرت مریم کو فرشتے کے ذریعے پیغام بھیجا تھا لیکن یہ نبوت کے طریقہ پر نہ تھا۔

نوٹ: وحی اور نبوت تشریعی انبیاء کرام کے ساتھ مختص ہے اور انبیاء کرام سب مرد تھے اور یہ سلسلہ نبوت محمد ﷺ پر ختم ہوگیا۔ لیکن وہ وحی جو تشریعی نہیں ہوتی خواہ وہ بطریق الہام ہو یا ملائکہ کی کلام کے ذریعے ہو (جس طرح مریم علیہا السلام کے ساتھ ہوئی تھی) انبیاء کے ساتھ مختص نہیں ہے۔ بلکہ یہ اولیاء کے لئے بھی ہوسکتی ہے اور یہ غیر تشریعی وحی کا سلسلہ نبی کریم ﷺ کے بعد بھی منقطع نہیں ہوا۔ اسی طرح پیروی کی وجہ سے کمالات نبوت کا حصول بھی غیر انبیاء کے لئے ہوتا رہتا ہے۔ شیخ اکبر محی الدین ابن عربی قدس سرہ الفتوحات کے دوسو بہترویں باب میں لکھتے ہیں کہ نبوت تشریع کے حکم کے اعتبار سے اس امت میں ختم ہو چکی ہے لیکن اس کی میراث ختم نہیں ہوئی۔ پس کچھ لوگ نبوت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ رسالت کے وارث ہوتے ہیں اور کچھ نبوت اور رسالت دونوں کے وارث ہوتے ہیں۔ علماء جو یہ فرماتے ہیں کہ نبوت اختصاص الٰہی ہے اس سے مراد نبوت تشریعی ہے، یعنی وحی الٰہی کے ذریعے احکام کا نزول انبیاء کرام پر ہوتا ہے اور یہی نبوت تشریعی ہے۔ جس کے متعلق حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا نبوت و رسالت ختم ہو چکی ہے۔ میرے بعد نبوت نہیں ہے۔ شیخ صاحب نے فتوحات کے باب الصلوٰۃ میں بھی اس طرح لکھا ہے۔ فرماتے ہیں یہ مقربین لوگ ہیں جن کے متعلق فرمایا۔ عَیْنًا یَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ۔ میں نے سورۂ نساء اور سورۂ واقعہ میں ذکر کیا ہے کہ مقربین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو وارثہ کمالات نبوت حاصل ہوتے ہیں، وہ وحی جو تشریعی نہیں ہے انبیاء کرام کے ساتھ مختص نہیں ہے، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اسی وحی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا لَقَدْ کَانَ فِیْمَا قَبْلَکُمْ مِنَ الْاُمَمِ نَاسٌ مُحَدَّثُوْنَ فَاِنْ یَّکُنْ مِنْ اُمَّتِیْ مِنْهُمْ اَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ۔ تم سے پہلی امتوں میں کچھ لوگ محدث تھے میری امت میں سے اگر کوئی ایک محدث ہے تو وہ عمر ہے(1)۔ بخاری، مسلم، نسائی اور ابو نعیم الموصلی نے اپنی مسند میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے، صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث اس طرح مروی ہے۔ لَقَدْ کَانَ فِیْمَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ مِنْ بَنِیْ اِسْرَائِیْلَ رِجَالٌ یُکَلَّمُوْنَ مِنْ غَیْرِ اَنْ یَّکُوْنُوْا اَنْبِیَاءَ فَاِنْ یَّکُنْ مِنْ اُمَّتِیْ اَحَدٌ فَعُمَرُ۔ تم سے پہلے بنی اسرائیل میں ایسے کامل مرد تھے جن سے (وحی کے ذریعے) کلام کی جاتی تھی لیکن وہ انبیاء نہیں تھے پس اگر میری امت میں کوئی ایسا شخص ہے تو وہ عمر ہے۔ اسی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ لَوْ کَانَ بَعْدِیْ نَبِیٌّ لَکَانَ عُمَرُ بْنُ الْخَطَّابِ(2) (اگر میرے بعد نبی ہوتا تو عمر بن الخطاب ہوتا۔ اس حدیث کو امام احمد ترمذی نے روایت کیا ہے۔ ترمذی نے اسے حسن کہا ہے، ابن حبان اور حاکم نے عقبہ بن عامر سے روایت کی ہے اور دونوں نے اسے صحیح کہا ہے، طبرانی نے عصمہ بن مالک سے روایت کی ہے۔ ابو سعید الخدری اور ابن عساکر نے ابن عمر سے روایت کیا ہے۔

شیخ شعرانی الیواقیت والجواہر میں فرماتے ہیں کیا الہام بغیر واسطہ کے ہوسکتا ہے؟ پھر خود ہی جواب دیتے ہیں کہ ہاں ہوسکتا ہے، کبھی بندے کو اس خاص وجہ سے الہام ہوتا ہے جو ہر بندے اور اس کے رب کے درمیان ہوتی ہے اور اس وجہ کو فرشتہ بھی نہیں جانتا۔ لیکن اس وجہ کے انکار کی طرف لوگ جلدی کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام پر انکار کیا تھا۔ اس وضاحت سے معلوم ہوا کہ رسول اور نبی فرشتہ کو آنکھوں سے دیکھتے ہیں لیکن غیر رسول اس کا اثر محسوس کرتا ہے لیکن اس کا مشاہدہ

1۔ مشکوٰۃ المصابیح، صفحہ 556 (قدیمی)　2۔ ایضاً، صفحہ 558

نہیں کرتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ غیر رسول کو کبھی فرشتہ کے ذریعے الہام فرماتا ہے۔ اور کبھی سارے واسطے ختم کر کے اس مخصوص تعلق اور وجہ کی بناء پر الہام فرماتا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کا عظیم ترین القاء ہے۔ اور یہ القاء رسول اور ولی دونوں کو ہوتا ہے۔

شیخ عبدالوہاب الشعراوی، شیخ ابوالمواہب الشاذلی قدس اللہ سرہما سے روایت کر کے لکھتے ہیں کہ جب بعض لوگوں نے کسی کے اس قول پر اعتراض کیا کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بات بتائی تو آپ نے فرمایا اس قول کے انکار کی کوئی وجہ نہیں، کیوں کہ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ میرے دل نے مجھے اپنے رب کی طرف سے بطریق الہام بات بتائی۔ اور یہ الہام اولیاء کرام کی وحی ہے، یہ وہ انبیاء کرام والی وحی نہیں ہے۔ ان کا انکار صرف اس پر ہوسکتا ہے جو یہ کہے۔ كَلَّمَنِىْ رَبِّىْ كَمَا كَلَّمَ مُوْسٰى عَلَيْهِ السَّلَامُ کہ میرے رب نے مجھ سے کلام فرمایا جس طرح اس نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام فرمایا تھا (شیخ موصوف کا کلام ختم ہوا)

میں کہتا ہوں ولی بھی فرشتے کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے جیسے مریم نے جبرئیل امین کو دیکھا تھا جب وہ بشری لباس میں تشریف لائے تھے۔ فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَرًا سَوِيًّا (پس وہ ظاہر ہوا اس کے سامنے ایک تندرست انسان کی صورت میں)

[1] مایوحیٰ سے مراد ایسی چیز ہے جو صرف وحی کے ذریعے ہی معلوم ہوسکتی ہے یا وہ اس لائق ہے کہ اسے وحی کیا جائے کیونکہ اس کی شان بہت بلند ہے اور اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔

اَنِ اقْذِفِيْهِ فِي التَّابُوْتِ فَاقْذِفِيْهِ فِي الْيَمِّ فَلْيُلْقِهِ الْيَمُّ بِالسَّاحِلِ يَأْخُذْهُ عَدُوٌّ لِّيْ وَ عَدُوٌّ لَّهٗ ؕ وَ اَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ۬ وَ لِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ﴿۳۹﴾

"یہ کہ رکھ دو اس معصوم بچے کو صندوق میں پھر ڈال دو اس صندوق کو دریا میں پھینک دے گا اسے دریا ساحل پر [1] پھر پکڑے گا اسے وہ شخص جو میرا بھی دشمن ہے اور اس بچے کا بھی دشمن ہے [2] اور (اے موسیٰ) میں نے پر تو ڈالا تجھ پر محبت کا اپنی جناب سے (تاکہ جو دیکھے فریفتہ ہو جائے اور (اس تدبیر کا منشا یہ تھا) کہ آپ کی پرورش کی جائے میری چشم (کرم) کے سامنے [3]"

[1] اَنْ مفسرہ ہے کیونکہ وحی بمعنی قول ہے یا مصدریہ ہے اور اس سے پہلے باء حرف جر مقدر ہے۔ اَلْيَمُّ سے مراد دریائے نیل ہے۔ الساحل سے مراد جانب ہے۔ جانب کو ساحل اس لئے کہتے ہیں کیونکہ پانی اس جانب (کنارہ) کو چھیلتا ہے اور اتارتا ہے اس سے جو اس کے اوپر ہوتا ہے۔ یہاں فلیلقه امر کا صیغہ ذکر فرمایا تاکہ ماقبل کلام سے مناسبت رہے لیکن اس کا معنی خبر ہے، یعنی دریا اسے ساحل پر ڈال دے گا۔ لفظی تناسب کے اعتبار سے عطف کیا گیا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ امر کا صیغہ اپنے معنی پر ہے۔ دریا کو حکم ہو رہا ہے اور یہ اس امر پر معطوف ہے جو موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہ اس طرح ہے جیسے کہا جاتا ہے۔ احسن الی زید ولیحسن زید' الیک بعض علماء فرماتے ہیں اس کا عطف قلنا کی تقدیر کے ساتھ اوحینا پر ہے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی قلنا لیلقه الیم بالساحل۔ میں کہتا ہوں امر اگر خبر کے معنی میں ہے تو پھر وہ وحی میں داخل ہے۔ اور اگر امر حکم کے معنی میں ہو تو پھر قلنا کی تقدیر کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اس صورت میں اس کا عطف اقذفیه فی الیم پر بھی جائز ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ دریا کو حکم کیسے ہوسکتا ہے، دریا تو عقل اور سمجھ رکھتا ہی نہیں ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ امر تکوینی ہے، اس کے لئے تعقل (سمجھنا) ضروری نہیں ہے۔ امام بیضاوی فرماتے ہیں جب دریا کا موسیٰ علیہ السلام کو ساحل پر ڈالنا واجب تھا کیونکہ ارادہ الٰہی اس کے متعلق ہو چکا تھا تو

اللہ تعالیٰ نے دریا کو ایسے بنا دیا گویا وہ عقل مند ہے اور اللہ تعالیٰ کے امر پر مطلع ہے۔ پھر یاخذ کو امر کے جواب میں ہونے کی وجہ سے مجزوم ذکر فرمایا۔

۳۔ عدو لی و عدوله سے مراد فرعون ہے۔ صوفیاء میں سے محققین فرماتے ہیں جمادات اگرچہ ہماری نسبت کے اعتبار سے ناسمجھ اور بے عقل ہیں اور ہمارے لئے ان سے خطاب کرنا بھی جائز نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے امر کے لئے یہ ذی شعور اور اطاعت گذار ہیں جیسا کہ قرآنی نصوص دلالت کرتی ہیں۔ واذنت لربها و حقت (اور کان لگا کر سنے گی/گا اپنے رب کا فرمان اور اس پر فرض بھی یہی ہے) قالتا اتینا طائعین (دونوں نے عرض کی ہم خوشی خوشی (دست بستہ) حاضر ہیں۔ اسی طرح حضور ﷺ نے ارشاد فرمایا پہاڑ پہاڑ کو ندا دیتا ہے۔ کہ اے فلاں کیا تیرے سے کوئی اللہ کا ذکر کرتے ہوئے گذرا ہے(1)۔ مولانا روم نے فرمایا

خاک و باد و آب و آتش بندہ اند پیش تو مردہ و برحق زندہ اند

مٹی، ہوا، پانی آگ سب اللہ کے بندے ہیں اے انسان تیرے سامنے یہ مردہ ہیں لیکن اللہ کے لئے زندہ ہیں

فرعون پر دشمن ہونے کا اطلاق اللہ تعالیٰ کی نسبت سے حقیقت ہے کیونکہ وہ مشرک تھا (اور مشرک اللہ کے دشمن ہیں) لیکن موسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے اس کا اطلاق مجاز ہے کیونکہ جب اس نے موسیٰ علیہ السلام کو اٹھایا تھا تو وہ اس وقت آپ کا دشمن نہ تھا۔ اسی وجہ سے عدو کا لفظ مکرر ذکر فرمایا کیونکہ حقیقت و مجاز کا ایک لفظ میں جمع کرنا ممتنع تھا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ عدو کا تکرار مبالغہ کے لئے ہو۔ اور دونوں لفظوں سے مراد مستقبل کی بات ہو یا موجود وقت مراد ہو کیونکہ فرعون کاہنوں کی خبروں کی وجہ سے موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کے درپے تو تھا۔ کیونکہ فرعون کو کاہنوں نے کہا تھا کہ بنی اسرائیل میں ایک بچہ پیدا ہوگا جو تیری بادشاہی کو ختم کردے گا۔ اسی وجہ اس نے بہت سی تعداد میں بنی اسرائیل کے بچے قتل کروا دیے تھے۔ اسے معلوم نہ ہوسکا کہ موسیٰ وہ بچہ ہے ورنہ وہ اسے بھی قتل کر دیتا۔ تمام ضمیریں موسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ بعض کو موسیٰ کی طرف اور بعض کا تابوت کی طرف لوٹنا نظم کلام میں تنافر کا باعث بنتا ہے۔ سمندر میں ڈالا جانے والا اگرچہ بالذات تابوت تھا لیکن موسیٰ علیہ السلام بھی بالعرض ان صفات سے موصوف تھے کیونکہ آپ تابوت کے اندر تھے۔

امام بغوی نے لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ نے تابوت بنایا اور اس میں دھنی ہوئی روئی رکھی پھر اس میں موسیٰ علیہ السلام کو رکھ دیا۔ پھر تابوت میں جو کچھ شگاف اور دراڑیں تھیں ان کو بند کر کے دریائے نیل میں ڈال دیا۔ دریائے نیل سے ایک بڑی نہر نکل کر فرعون کے گھر کی طرف جاتی تھی۔ فرعون اپنی بیوی آسیہ کے ساتھ اسی نہر کے کنارے بیٹھا تھا کہ پانی اس تابوت کو بہا کر لے آیا۔ فرعون نے اپنے غلاموں اور لونڈیوں کو حکم دیا کہ اس تابوت کو نکال لاؤ۔ وہ تابوت نکال کر لے آئے اور اس کا دروازہ کھولا تو اس میں ایک بچہ تھا جو انتہائی خوش شکل اور خوبصورت تھا۔ فرعون نے جب اسے دیکھا تو اس کی من بھاتی صورت پر فریفتہ ہوگیا(2) اس چیز کا اظہار قرآن نے وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ کے الفاظ میں کیا ہے۔ منّی کا لفظ ظرف مستقر ہے اور محبت کی صفت ہے یا القیت کی ظرف لغو ہے۔ مطلب یہ ہوگا کہ میں نے تجھ پر ایسی محبت کا پرتو ڈالا جو میری طرف سے ہے اور جسے میں نے دلوں میں تخلیق کیا ہے۔ یا یہ معنی کہ میں نے اپنی طرف سے تجھ پر محبت ڈال دی یعنی میں نے تجھ سے محبت کی جب کسی سے اللہ تعالیٰ محبت فرماتا ہے تو کائنات کی ہر چیز اس سے محبت فرماتی ہے۔ حضرت ابن عباس نے فرمایا کہ میں نے اس سے محبت کی اور اپنی مخلوق کے دلوں میں بھی اس کی محبت پیدا فرما دی۔ حضرت عکرمہ فرماتے ہیں جو بھی آپ کو ایک نگاہ دیکھ لیتا دیوانہ ہو جاتا۔ حضرت قتادہ نے فرمایا موسیٰ علیہ السلام کی آنکھوں میں اتنی

1۔ معجم کبیر، جلد 9، صفحہ 103 (العلوم والحکم)
2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریۃ)

ملاحت تھی کہ جو بھی آپ کے دیدار سے مشرف ہوتا اسے آپ سے عشق ہو جاتا(1)۔ یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ میں نے تیرے دل میں اپنی طرف سے محبت ڈالی اور وہ محبت تجھ پر غالب آ گئی اور تو مجھ سے دل و جان سے محبت کرنے لگا اور تو نے اپنے دل کو میری محبت کے لئے خاص کر دیا اور کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہوا اور تو محبت کرنے والوں کا سردار بن گیا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں حضرت موسیٰ کلیم کے تعین کا مبدء مُحِبِّیَة محضہ تھا اور پیارے محمد ﷺ کے تعین کا مبدء محبوبیت محضہ تھا۔ اسی وجہ سے موسیٰ کلیم عاشقوں کے سردار ہیں اور محبوب کریم ﷺ محبوبوں کے سردار ہیں۔

ایک صوفی کشف کی نظر سے محبت کے دائرہ میں ایک محیط دیکھتا ہے جو خلت ہے اور یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے۔ اور ایک اسے مرکز نظر آتا ہے جو محبت صرفہ ہے اور یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے اور مرکز محیط سے افضل اعلیٰ اور وسیع ہوتا ہے، مرکز اور محیط کی نسبت ایسی ہے جیسے چاند کی نسبت ہالہ سے ہے۔ پھر مزید بلندی کے وقت مرکز دائرہ محبت میں محیط نظر آتا ہے اور یہ موسیٰ علیہ السلام کے تعین کا مبدء ہے اور اس بلندی میں جہاں مرکز محیط بن گیا ہے وہ جو مرکز ہے وہ محبوب کریم ﷺ کا مبدء تعین ہے۔ جب محبوب کریم ﷺ محبوبیت کے اس انتہائی مقام پر فائز ہیں تو آپ کا مبدء تعین دائرہ محبوبیہ صرفہ کا مرکز ہوا اور دائرہ محبوبیت کے محیط کو آپ ﷺ نے اپنی امت کے بعض افراد کے لئے چھوڑ دیا (یہاں محیط سے مراد محبوبیت ممتزجہ ہے) اور جس ذات کے لئے یہ محبوبیت ممتزجہ آپ ﷺ نے چھوڑی ہے وہ مجدد الف ثانی رضی اللہ عنہ کی ذات ہے۔ آیت کے الفاظ کا ظاہر اس بات کا مقتضی ہے کہ دریا نے آپ کو ساحل پر پھینکا تھا اور پھر آل فرعون نے آپ کو اٹھا لیا تھا تاکہ انجام کار وہ ان کا دشمن اور حزن کا باعث ہو جائے اگر صحیح ہو کہ آل فرعون نے انہیں دریا سے نکالا تھا (جیسا کہ ابھی گذر چکا ہے) تو تطبیق اس طرح ہوگی کہ دریا نے انہیں اس نہر کے منہ پر ڈال دیا۔ جو فرعون کے باغ کی طرف جاتی تھی۔ پھر اس نہر نے انہیں باغ کے تالاب میں پہنچا دیا تھا اور آل فرعون نے انہیں تالاب سے نکالا تھا۔ القیت کا عطف اوحینا پر ہے۔

۳۔ تصنع کا یہاں معنی تربیی ہے۔ یعنی تیری تربیت کی جائے اور تجھ سے احسان کیا جائے۔ یہ صنعت فرسی سے مشتق ہے جس کا معنی کہ میں نے گھوڑے کی اچھی طرح دیکھ بھال کی اور جعفر نے اس کو جزم کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ امر ہے۔ عینی کو نافع اور ابو عمر نے یاء کے فتحہ کے ساتھ اور باقی قراء نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے۔ علی عینی لتصنع کی ضمیر مرفوع سے حال ہے۔ جمہور کی قرات کے مطابق ولتصنع ایک علت مضمرہ پر معطوف ہے جس کی تقدیر لیتعطف علیک ہے یا یہ فعل معلل کے اضمار کے ساتھ سابقہ جملہ پر معطوف ہے اس صورت میں تقدیر عبارت یہ ہے فعلت ذالک لتصنع اور ابو جعفر کی قرأت پر یہ یا خذہ پر معطوف ہوگا۔

إِذْ تَمْشِيٓ أُخْتُكَ فَتَقُولُ هَلْ أَدُلُّكُمْ عَلَىٰ مَن يَكْفُلُهُۥ ۖ فَرَجَعْنَٰكَ إِلَىٰٓ أُمِّكَ كَىْ تَقَرَّ عَيْنُهَا وَلَا تَحْزَنَ ۚ وَقَتَلْتَ نَفْسًا فَنَجَّيْنَٰكَ مِنَ ٱلْغَمِّ وَفَتَنَّٰكَ فُتُونًا ۚ فَلَبِثْتَ سِنِينَ فِىٓ أَهْلِ مَدْيَنَ ثُمَّ جِئْتَ عَلَىٰ قَدَرٍ يَٰمُوسَىٰ ۞

''یاد کرو جب چلتے چلتے آئی آپ کی بہن اور کہنے لگی (فرعون کے اہل خانہ سے) کیا میں بتاؤں تمہیں وہ آدمی جو اس کی پرورش کر سکے ۱۔ پس (یوں) ہم نے آپ کو لوٹا دیا آپ کی ماں کی طرف ۲۔ تاکہ (آپ کو دیکھ کر) اپنی آنکھ ٹھنڈی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 217 (التجاریہ)۔

کرے اورغم ناک نہ ہواور (تمہیں یاد ہے جب) تو نے مار ڈالا تھا ایک شخص کو پس ہم نے نجات دی تھی تمہیں غم واندوہ سے اور ہم نے تمہیں اچھی طرح جانچ لیا تھا۔ پھر تم ٹھہرے رہے کئی سال اہل مدین میں پھر تم آ گئے ایک مقررہ وقت پراے موسیٰ۔"

۱ے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہمشیرہ کا نام مریم تھا۔ یعنی یاد کرو جب تیری بہن مریم آئی تا کہ تیری خبر معلوم کرے۔ انہوں نے بہت سے دودھ پلانے والی عورتوں پر تمہیں پیش کیا اور تو نے کسی ایک کے پستان کو منہ لگانا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ اذ ظرف ہے القیت کی یا لتصنع کی یا یہ اذ او حینا سے بدل ہے اس بناء پر کہ اس سے مراد وسیع وقت ہو۔ بعض علماء فرماتے ہیں اذ تعلیل کے لئے ہے۔ آپ کی ہمشیرہ نے فرمایا کہ میں تمہیں ایک عورت بتاتی ہوں جو اسے دودھ پلائے گی اور یہ اس کے سینے سے چمٹ جائے گا۔ جب آپ کی ہمشیرہ نے یہ کہا تو وہ اس کی بات کے قائل ہو گئے۔ ہمشیرہ موسیٰ علیہ السلام کی والدہ کو لے آئی اس نے سینہ سے لگایا تو آپ نے ان کا دودھ قبول فرمالیا۔

۲ے ہم نے جو آپ کی والدہ سے وعدہ کیا تھا انا رادوہ الیک تو اس کو پورا کرتے ہوئے ہم نے تجھے تمہاری ماں کی طرف اپنی حسن تدبیر سے لوٹا دیا ہے تا کہ تیری ملاقات سے ان کی ممتا کو ٹھنڈک اور سکون نصیب ہو اور تیرے فراق میں پریشان نہ ہو یا تو ان کے فراق میں غمزدہ نہ ہو۔ ایک اور افعال کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اے موسیٰ یاد کرو جب تم نے ایک قبطی ظالم شخص کو قتل کیا تھا جب کہ تجھ سے ایک اسرائیلی نے مدد طلب کی تھی۔ اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عمر بارہ سال تھی۔ کعب الاحبار نے اسی طرح فرمایا ہے (1)۔ ہم نے تمہیں اس قتل پر مغفرت کا مژدہ سنا کر تم سے غم واندوہ کے گہرے بادل دور کر دیئے اور فرعون کے قصاص لینے کے خوف سے مدین کی طرف ہجرت کے ذریعے امن دیا تھا۔

۳ے فتونا مصدر ہے جیسے قعود مصدر ہے یا یہ جمع ہے۔ امام بغوی لکھتے ہیں کہ ابن عباس نے اس کا معنی اختبر ناک اختبارا کیا ہے۔ یعنی ہم نے تجھے اچھی طرح آزمایا۔ ضحاک نے یہ معنی لکھا ہے۔ ابتلیناک ابتلاءً ہم نے تمہیں خوب آزمائش میں مبتلاء کیا (2) یہ معنی فتونا کے مصدر ہونے کے اعتبار سے ہے۔ یہ معنی کہ ہم نے مختلف آزمائشوں کے ذریعے تمہیں آزمایا اس صورت میں فتونا جمع فتن ہے یا یہ فتنۃ کے معنی میں ہے اور تاء کا اعتداد ترک کیا گیا ہے۔ حجرۃ اور بدرۃ میں تاء کو ذکر نہ کر کے حجور اور بدور ذکر کیا جاتا ہے۔ مجاہد نے یہ معنی لکھا ہے اخلصاک اخلاصاً ہم نے تمہیں چن لیا ہے۔ سعید بن جبیر حضرت ابن عباس سے روایت فرماتے ہیں کہ فتون سے مراد آپ کا آزمائشوں میں واقع ہونا ہے۔ جن سے پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کو خلاصی عطا فرمائی تھی۔ پہلی آزمائش یہ تھی کہ آپ کی والدہ آپ کے ساتھ اس سال حاملہ ہوئیں جس سال میں فرعون پیدا ہونے والے بچوں کو قتل کر دیتا تھا۔ آپ کو تابوت میں رکھ کر دریا میں پھینکنا، اپنی ماں کے علاوہ کسی دایہ کے دودھ پینے سے روک دینا، آپ کا فرعون کی داڑھی کھینچنا حتیٰ کہ اس نے آپ کو قتل کا ارادہ کر لیا تھا، آپ کا موتیوں کی بجائے آگ کا انگارہ اٹھا لینا پھر آپ کا قبطی کو قتل کرنا۔ پھر آپ کا مدین کی طرف نکل جانا۔ میں کہتا ہوں پھر مدین کی طرف ہجرت کرتے وقت مختلف مشقتیں برداشت کرنا۔ مثلاً وطن کا چھوڑنا، اپنے رشتہ داروں کی جدائی اٹھانا، احتیاط کے ساتھ پیدل چلنا، زاد راہ کا ساتھ نہ ہونا اسی طرح تکلیفیں اٹھانا وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تجھے یکے بعد دیگرے مشقت کی بھٹی میں ڈال کر خوب صاف وشفاف کر لیا جس طرح سونے کو آگ میں ڈالا جاتا ہے اور اس کے خبث اور کھوٹ کو دور کر کے سونے کو خالص کر دیا جاتا ہے۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریۃ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریۃ)

موسیٰ علیہ السلام شعیب علیہ السلام کی صاحبزادی سے نکاح کرنے کے بعد مہر کی ادائیگی کے لئے کئی سال حضرت شعیب علیہ السلام کی بکریاں چراتے رہے۔ مدین مصر سے آٹھ مراحل کے فاصلہ پر ہے۔ وہب فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام کے پاس اٹھائیس سال رہے۔ دس سال ان کی بیٹی کے مہر کے طور پر اور اٹھارہ سال ویسے بعد میں رہے (اس عمر کی تکمیل کے لئے جس میں انبیاء کو نبوت ملتی ہے یعنی چالیس سال) حتی کہ آپ کی اولاد ہوگئی (1)۔

ع پھر تم وادی مقدس میں آئے اس وقت پر جو میں نے تیرے آنے کے لئے مقرر کیا تھا محمد بن کعب نے یہی مفہوم لکھا ہے۔ یا اس مقدار میں جس میں انبیاء کی طرف وحی کی جاتی ہے (2)۔ یعنی جب تیری عمر چالیس سال ہوگئی، یہ عبدالرحمٰن بن کیسان کی توجیہ ہے اور اکثر مفسرین کا بھی یہی خیال ہے۔ یعنی وہ وقت جو اللہ تعالیٰ نے رسالت عطا کرنے کا مقرر فرمایا تھا اور وہ چالیس سال کی عمر کا وقت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محبت اور انس کی وجہ سے یا موسیٰ کا تکرار فرمایا۔ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا من احب شیئاً اکثر ذکرہ (3) (جو کسی چیز سے محبت کرتا ہے وہ اکثر اس کا ذکر کرتا ہے) اس حدیث کو صاحب مسند الفردوس نے حضرت عائشہ سے روایت کیا ہے۔

وَ اصْطَنَعْتُكَ لِنَفْسِيْ ﴿٤١﴾

''اور میں نے مخصوص کرلیا ہے تمہیں اپنی ذات کے لئے ؎''

؎ یعنی میں نے تمہاری تربیت کی اور خوب تربیت کی۔ نفسی کو کوفیوں اور ابن عامر نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور لفظاً یا کو وصل کی صورت میں التقاء ساکنین کی وجہ سے ساقط کر دیتے ہیں۔ جبکہ باقی قراء یاء کو فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یعنی میں نے تیری تربیت کی اور میں نے تجھے اپنے لئے منتخب فرمایا ہے تاکہ تو ظاہر و باطن میں کسی غیر کی طرف متوجہ نہ ہو۔ میں کہتا ہوں اس کا یہ معنی بھی ممکن ہے میں نے تجھے پیکر اخلاق حسنہ بنایا اور میں نے تیری اس طرح تربیت کی ہے کہ تو اب مجھ سے مناجات کرنے، میرا قرب حاصل کرنے اور میرے پیغام پہنچانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اِذْهَبْ اَنْتَ وَ اَخُوْكَ بِاٰيٰتِيْ وَ لَا تَنِيَا فِيْ ذِكْرِيْ ﴿٤٢﴾

''اب جائیے آپ اور آپ کا بھائی میری نشانیاں لے کر اور نہ سستی کرنا میری یاد میں ؎''

؎ آیاتی سے مراد معجزات ہیں۔ ابن عباس فرماتے ہیں وہ نو نشانیاں مراد ہیں جو اللہ نے آپ کو عطاء فرمائی تھیں (4)۔ سدی نے ولا تنیا کا معنی لا تفترا کیا ہے یعنی ڈھیلا نہ پڑنا۔ محمد بن کعب نے لا تقصرا معنی لکھا ہے۔ یعنی کوتاہی نہ کرنا۔ قاموس میں ونی کا معنی تھکاوٹ، سستی اور کمزوری لکھا ہے (5)۔ ذکری کی یاء کو ابن عامر اور کوفیوں نے یاء کے سکون کے ساتھ پڑھا ہے اور وہ لفظاً یاء کو وصل کی صورت میں گرا دیتے ہیں اور باقی قراء یاء کے فتحہ کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ حکم موسیٰ علیہ السلام کو وحی کیا گیا تھا کیونکہ ہارون علیہ السلام اس وقت مصر میں تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ ہارون علیہ السلام کو ساتھ لے جائیں اور ہارون علیہ السلام کو مصر میں وحی فرمائی کہ موسیٰ علیہ السلام سے ملو۔ پس موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کی ملاقات ہوئی، موسیٰ علیہ السلام نے وہ حکم سنایا جو اللہ تعالیٰ نے آپ کی طرف وحی کیا تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں ہارون علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کے آنے کی خبر سنی تو

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 2۔ ایضاً۔ 3۔ کنز العمال: 1829 (التراث الاسلامی)
4۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ) 5۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1761 (التراث العربی)

انہوں نے راستہ میں ان کا استقبال کیا۔ پس اس وقت اللہ تعالیٰ نے دونوں کی طرف وحی فرمائی۔

اِذْهَبَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝۴۳

''آپ دونوں جائیں فرعون کے پاس وہ سرکش بنا بیٹھا ہے ۱؎''

۱؎ اس کی سرکشی کا یہ عالم ہے کہ اس نے خدا ہونے کا دعویٰ کیا ہوا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے اکیلے موسیٰ علیہ السلام کو جانے کا حکم دیا پھر انہیں اور ان کے بھائی کو جانے کا حکم دیا، اس لئے کلام میں تکرار نہیں ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلا جانا مطلقاً ہے اور دوسرا جانا مقید ہے، اس لئے تکرار نہیں ہے۔

فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى ۝۴۴

''اور گفتگو کریں اس کے ساتھ نرم انداز سے ۱؎ شاید کہ وہ نصیحت قبول کرے یا (میرے غضب سے) ڈرنے لگے ۲؎''

۱؎ ابن عباس نے اس کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ تم کلام میں درشتی اور سختی نہ کرنا۔ عکرمہ اور سدی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ اور ہارون نے اس سے کلام کرتے ہوئے اسے کنیت سے پکارا۔ انہوں نے اسے ابوالعباس کہہ کر پکارا۔ بعض نے لکھا ہے ابوالولید کہہ کر پکارا۔

مقاتل فرماتے ہیں نرم قول سے یہ مراد ہے هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى ۝ وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ فَتَخْشٰى (کیا تیری خواہش ہے کہ تو پاک ہو جائے اور (کیا تو چاہتا ہے کہ) میں تیری رہبری کروں تیرے رب کی طرف تاکہ تو (اس سے) ڈرنے لگے (1)۔ کیونکہ یہ انداز کلام ایسا ہے جس میں عرض اور مشورہ کی صورت میں دعوت ہے۔ یہ انداز اس لئے اپنایا تاکہ عارضی اقتدار کے نشہ میں بدمست فرعون جہالت کی بناء پر ان پر حملہ نہ کردے۔ بعض علماء فرماتے ہیں ان کو اس مغرور انسان سے بڑے لطیف اور شیریں لہجہ میں کلام کرنے کا حکم اس لئے دیا کیونکہ موسیٰ پر اس کا حق تربیت تھا، اس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا پوسا تھا اور آپ کی صغرسنی میں اس نے پرورش کی تھی۔ سدی کہتے ہیں قول لین سے مراد یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اس کے پاس آئے اور وعدہ کیا کہ اگر تو ایمان قبول کرے تو تجھے ایسی جوانی ملے گی جو کبھی زوال پذیر نہ ہوگی اور تجھے ایسی بادشاہی ملے گی جو تجھ سے مرنے سے پہلے چھینی نہیں جائے گی اور کھانے، پینے اور نکاح کی لذت مرنے کے وقت تک تجھ میں باقی رہے گی اور جب مرے گا تو جنت ملے گی۔

فرعون کو یہ بات اچھی لگی۔ لیکن ہمیشہ ہامان سے مشورہ کر کے کوئی حتمی فیصلہ کرتا تھا، ہامان اس وقت موجود نہ تھا۔ جب ہامان آیا اور فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کی دعوت کا اس کے سامنے ذکر کیا اور کہا کہ میں تو چاہتا ہوں کہ موسیٰ علیہ السلام کی بات قبول کرلوں۔ ہامان نے اسے کہا میں تو تجھے دانشور اور صاحب رائے سمجھتا تھا (لیکن تو تو کودن ہے) تو رب ہے اور اب تو مربوب بننے کا ارادہ کرتا ہے۔ اب تک تیری عبادت ہوتی رہی اب تو غیر کی عبادت کرنا چاہتا ہے۔ فرعون کی رائے کو ہامان نے بدل دیا اور وہ ایمان قبول کرنے سے محروم رہا۔

۲؎ شاید اس کے دل میں تمہاری صداقت متحقق ہو جائے یا اگر تمہاری صداقت اس پر متحقق نہ ہو اور نصیحت قبول نہ بھی کرے تو کم از کم اس کے دل میں خوف خدا کی چنگاری سلگ جائے۔ لعل کے معنی میں جو رجا اور امید ہے اس کا تعلق اللہ تعالیٰ سے نہیں بلکہ موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے علم سے ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کو تو علم تھا کہ یہ غرور و تکبر کی جس گہری وادی میں بھٹک رہا ہے کبھی واپس نہیں آئے گا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 218 (التجاریہ)

یہ جملہ قولا کے فاعل سے حال ہونے کی بناء پر محل نصب میں ہے۔ یعنی اس سے نرم انداز میں گفتگو کرو، جب کہ فرعون کے نصیحت قبول کرنے اور اس کے ڈرنے کا وقت ہو یا قولا کی علت کی بناء پر منصوب ہے۔ حسن بن فضل فرماتے ہیں یہ حکم فرعون کے علاوہ کسی طرف پھیرا جائے تو یہ معنی ہوگا کہ شاید نصیحت قبول کرنے والا نصیحت قبول کرے اور ڈرنے والا ڈر جائے (1)۔

قَالَا رَبَّنَآ إِنَّنَا نَخَافُ أَنْ يَّفْرُطَ عَلَيْنَآ أَوْ أَنْ يَّطْغٰى ﴿٤٥﴾

"دونوں نے عرض کی اے ہمارے رب ہمیں یہ خوف ہے کہ وہ دست درازی کرے گا ہم پر یا سرکشی سے پیش آئے گا ۔"

۔ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام نے عرض کی ہمیں اندیشہ ہے کہ وہ قتل کرنے اور مارنے میں جلدی کرے گا اور دعوت کی تکمیل اور معجزات کے اظہار سے پہلے ہمارا کام تمام کر دے گا۔ ابن عباس نے اس کی یہی تفسیر کی ہے۔ فرط علیه فلان عرب اس وقت کہتے ہیں جب کوئی تکلیف پہنچانے میں جلدی کرے (2)۔ فرط سے مشتق ہے جس کا معنی بڑھنا ہے۔ اسی سے الفارط (آگے بڑھنے والا) ہے یا کہیں ایسا نہ ہو تیری ذات کے متعلق کوئی ایسا بکواس کرے جس سے تیری ذات منزہ و مبرا ہے کیونکہ اس کا دل پتھر کی طرح سخت ہے' اندیشہ ہے کہ تیری عبادت کی نافرمانی میں کہیں اور زیادہ نہ ہو جائے۔

قَالَ لَا تَخَافَآ إِنَّنِيْ مَعَكُمَآ أَسْمَعُ وَأَرٰى ﴿٤٦﴾

"ارشاد ہوا ڈرو نہیں میں یقیناً تمہارے ساتھ ہوں (ہر بات) سن رہا ہوں اور (ہر چیز) دیکھ رہا ہوں ۔"

۔ انني' لا تخافا کی تعلیل ہے۔ یعنی ڈرو نہیں کیونکہ میں حفاظت اور مدد کرنے کے لئے تمہارے ساتھ ہوں۔ میں تمہاری پکار سنوں گا اور جو کچھ وہ تمہارے ساتھ کرے گا میں اس کو دیکھ رہا ہوں گا۔ میں اس سے تمہارا دفاع کروں گا، میں تم سے بے خبر نہیں ہوں' تم پریشان نہ ہو' یا یہ معنی کہ تمہارے اور فرعون کے درمیان جو بات ہوگی اور معاملہ ہوگا میں اسے دیکھوں گا اور سنوں گا اور ہر حال میں میں تمہاری مدد کروں گا اور تم سے تکلیف کو دور کروں گا۔ یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی چیز پر قادر نہیں ہوگا کیونکہ میں تمہارا محافظ ہوں درآں حالیکہ میں سننے والا اور دیکھنے والا ہوں۔ جب محافظ قادر' سننے والا اور دیکھنے والا ہو تو حفاظت مکمل ہوتی ہے۔

فَأْتِيٰهُ فَقُوْلَآ إِنَّا رَسُوْلَا رَبِّكَ فَأَرْسِلْ مَعَنَا بَنِيْٓ إِسْرَآءِيْلَ ۙ وَلَا تُعَذِّبْهُمْ ۭ قَدْ جِئْنٰكَ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكَ ۭ وَالسَّلٰمُ عَلٰى مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى ﴿٤٧﴾

"پس (بے خوف و خطر) اس کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ ہم دونوں تیرے رب کے فرستادہ ہیں پس بھیج دے ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو اور انہیں (اب مزید) عذاب نہ دے ہم لے آئے ہیں تیرے پاس ایک نشانی تیرے رب کے پاس سے ۔ اور سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے ۔"

۔ فارسل پر فاء سببیہ ہے۔ ہمارے ساتھ بنی اسرائیل کو شام کی طرف بھیج دے یا یہ معنی کہ انہیں اپنی بیگار اور کاموں سے آزاد کر اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے دے۔ ہم تیرے پاس اپنی رسالت و نبوت کی صداقت پر ایک نشانی لائے ہیں۔ یہاں موسیٰ علیہ السلام نے آیت (ایک نشانی) کا ذکر فرمایا۔ حالانکہ آپ کے پاس دو نشانیاں تھیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ دلیل سے بات ثابت کرنا چاہتے تھے۔ نشانیوں کی وحدت اور تعدد کی طرف اشارہ مقصود نہ تھا۔ اسی طرح قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ میں اور فات باية میں مفرد لفظ ذکر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

فرمایا ہے۔

لے یہ جملہ معترضہ ہے، مطلب یہ ہے کہ میرا سلام ملائکہ کا سلام اور جنت کے فرشتوں کا سلام ہدایت یافتہ لوگوں پر ہے یا یہ معنی کہ ہدایت کے پیروکاروں کے لئے دنیا میں مصیبت اور آخرت میں عذاب سے سلامتی ہے۔

إِنَّا قَدْ أُوحِيَ إِلَيْنَا أَنَّ الْعَذَابَ عَلَىٰ مَنْ كَذَّبَ وَتَوَلَّىٰ ﴿٤٨﴾

''بے شک وحی کی گئی ہے ہماری طرف کہ عذاب (خداوندی) اس پر آئیگا جو جھٹلاتا ہے (کلام الٰہی کو) اور روگردانی کرتا ہے لے''

لے یعنی دنیا و آخرت کا عذاب تو اسے ملے گا جو رسولوں کو جھٹلاتا ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اور اس کی عبادت سے روگردانی کرتا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں۔ یہ جملہ تذییل ہے یا آپ کے رسول ہونے کی تعلیل ہے۔ میں کہتا ہوں یہ انا رسولا ربک سے بدل ہے۔ اس کلام میں حذف ہے۔ اصل میں اس طرح ہے کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اس کے پاس آئے اور پیغام خداوندی سنایا اور حذف کا فائدہ کلام میں اختصار ہے اور دوسرا فائدہ یہ ہے کہ یہ دلالت کر رہا ہے کہ اطاعت شعار کو جب کسی کام کے کرنے کا حکم دیا جاتا ہے تو وہ ضرور کرتا ہے۔

قَالَ فَمَنْ رَّبُّكُمَا يٰمُوْسٰى ﴿٤٩﴾

''فرعون نے پوچھا موسیٰ! تم دونوں کا رب کون ہے لے''

لے فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے جواب میں کہا تمہارا وہ رب کون ہے جس نے تم دونوں کو بھیجا ہے۔ اس نے خطاب دونوں سے کیا تھا لیکن ندا کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام کو خاص فرمایا۔ اس کی وجہ یہ ہے موسیٰ علیہ السلام اصل تھے اور ہارون علیہ السلام آپ کے وزیر اور تابع تھے یا اس سابقہ تعلق تربیت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب کیا یا وہ گفتگو سے سمجھ گیا تھا کہ مرتبہ تبلیغ آپ کو حاصل ہے اور آپ کے بھائی صرف فصاحت وضاحت کے لئے ساتھ ہیں۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِيْٓ اَعْطٰى كُلَّ شَيْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰى ﴿٥٠﴾

''فرمایا ہمارا رب وہ ہے جس نے عطا کی ہر چیز کو (موزوں) صورت پھر (مقصد تخلیق کی طرف) ہر چیز کی رہنمائی کی لے''

لے حسن اور قتادہ فرماتے ہیں ہر چیز کو صلاحیت عطا فرمائی اور پھر اس کی اس طرف رہنمائی کی جو اس کے لئے باعث اصلاح ہے' مجاہد فرماتے ہیں ہر چیز کو وہ صورت عطا فرمائی جس پر وہ ہے اور اس نے حضرت انسان کی تخلیق چوپاؤں اور ڈھورڈنگروں کی طرح نہیں فرمائی اور جانور کو انسانی تخلیق کے مطابق پیدا نہیں فرمایا پھر ہر چیز کو اس کے کھانے پینے اور نکاح کے جو منافع ہیں ان کی طرف رہنمائی فرمائی(1)۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں ہر چیز کو اس کی اپنی جنس سے مادہ عطا فرمائی۔ مرد کو عورت اور اونٹ کو اونٹنی۔ گدھے کو گدھی' گھوڑے کو گھوڑی پھر اس کی رہنمائی فرمائی کہ جفتی اور جماع کیسے کرنا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ معنی ہے کہ ہر چیز جس جس چیز کی محتاج ہے اور اسے جس چیز کی ضرورت ہے وہ عطا فرمادی' مفعول ثانی کو مقدم فرمایا کیونکہ مقصود اس کا بیان ہے پھر ہر چیز کو یہ بھی سکھا دیا کہ ان اعضاء اور قوتوں سے کس طرح کام لے اور اپنی بقاء اور اپنے کمال کو کیسے حاصل کرے۔ خواہ وہ کمال طبعی ہے یا اختیاری۔ امام

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 219 (التجاریہ)

بیضاوی فرماتے ہیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس جملہ میں انتہائی بلاغت ہے کیونکہ کل موجودات کی ان کے مراتب کے ساتھ خبر دی گئی ہے اور اس جملہ میں اس چیز کا بھی بیان ہے غنی قادر اور منعم علی الاطلاق صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور باقی کائنات کی ہر چیز اپنی ذات، صفات اور افعال میں اپنی تخلیق اور اپنی بقاء میں اس کی محتاج ہے۔ اسی جامع جواب کی وجہ سے کافر مبہوت ہوگیا تھا اور فرعون نے پینترا بدلا اور کلام کا رخ دوسری باتوں کی طرف موڑ دیا(1)۔

قَالَ فَمَا بَالُ الْقُرُوْنِ الْاُوْلٰى ﴿۵۱﴾

''اس نے کہا (اچھا یہ بتاؤ) کیا حال ہوا پہلی قوموں کا؟ ۱''

۱ پہلی قوموں سے مراد قوم نوح، عاد اور ثمود ہیں جنہوں نے بتوں کی پوجا کی اور قیامت کا انکار کیا۔ فرعون پوچھنے لگا ذرا بتاؤ تو سہی پہلی قوموں کے مرنے کے بعد ان کو کیا ہوا تھا۔

قَالَ عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ فِيْ كِتٰبٍ ۚ لَا يَضِلُّ رَبِّيْ وَ لَا يَنْسَى ﴿۵۲﴾

''فرمایا ان کا علم میرے رب کے پاس ہے جو کتاب میں (مرقوم) ہے ۱ نہ بھٹکتا ہے میرا رب اور نہ (کسی چیز کو) بھولتا ہے ۲''

۱ موسیٰ علیہ السلام نے پھر بڑا اچا تلا جواب دیا ان کے اعمال میرے پروردگار کے پاس محفوظ ہیں۔ لوح محفوظ میں سب کچھ مرقوم ہے۔

۲ اور میرے رب کی شان ہے کہ نہ وہ بھٹکتا ہے اور نہ وہ بھولتا ہے۔ یہ جملہ مستانفہ ہے یا کتاب کی صفت ہے۔ یعنی سب کچھ اس کتاب میں محفوظ ہے جسے اللہ تعالیٰ نہ گم کرتا ہے اور نہ اسے بھولتا ہے۔ الضلال کا معنی کسی چیز کی جگہ کا بھول جانا ہے اور اس تک رہنمائی حاصل نہ ہونا ہے اور نسیان کا معنی یہ ہے کہ کوئی چیز اس طرح تجھ سے محو ہو جائے کہ اس کا خیال بھی تیرے دل میں نہ کھٹکے اور یہ دونوں چیزیں اس ذات کے لئے محال ہیں جو عالم بالذات ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں لایضل ربی کا معنی یہ ہے کہ نہ تو اس سے کوئی چیز غائب ہوتی ہے اور نہ وہ کسی چیز سے غائب ہوتا ہے اور لا ینسیٰ کا معنی یہ ہے کہ وہ اپنی مخلوق کے معاملات کو بھولتا نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ گزشتہ قوموں کو ان کے ہر نیک و بد عمل کی جزاء و سزا دے گا۔

الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ مَهْدًا وَّ سَلَكَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا وَّ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۭ فَاَخْرَجْنَا بِهٖٓ اَزْوَاجًا مِّنْ نَّبَاتٍ شَتّٰى ﴿۵۳﴾

''وہ ذات جس نے تمہارے لئے زمین کو بچھونا بنایا ۱ اور بنا دیئے تمہارے فائدہ کے لئے اس میں راستے اور اتارا آسمان سے پانی ۲ پھر ہم نے نکالے پانی کے ذریعے ۳ (شکم زمین سے) جوڑے گوناں گوں نباتات کے ۴''

۱ الذی اسم موصول ربی کی صفت یا محذوف مبتدا کی خبر ہونے کی بناء پر محل رفع میں ہے یا مدح کے طور پر منصوب ہے۔ کوفیوں نے یہاں اور سورۂ زخرف میں مَھْدًا پڑھا ہے اور سورۂ نبا میں بھی ان کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ مصدر ہے اور اس کے ساتھ نام رکھا گیا ہے۔ باقی قراء نے مھاداً پڑھا ہے۔ مہاد اس چیز کا اسم ہے جو بچھائی جائے مثلاً بستر یا مہد کی جمع ہے یعنی زمین کو اس نے تمہارے لئے بچھونا بنایا۔

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 625 (العلمیۃ)

۲؎ سلوک کا معنی راستہ میں چلنا ہے۔ اسی معنی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے لِّتَسْلُكُوْا مِنْهَا سُبُلًا فِجَاجًا۔ سلک کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے۔ قاموس میں ہے۔ سَلَكَ الْمَكَانَ سُلُوْكًا وَسَلَكَهُ غَيْرُهُ(1)۔ یعنی پہلی صورت میں لازم ہے اور مکان ظرف ہے اور دوسری صورت میں متعدی ہے۔ آیت میں متعدی استعمال ہوا ہے اور السبل کو مجازاً مفعول بہ بنایا گیا ہے۔ حالانکہ یہ ظرف ہے۔ یہ ایسے ہے جیسے مجازاً جاری ہونے کی نسبت نہر کی طرف کی جاتی ہے۔ حالانکہ نہر جاری نہیں ہوتی، پانی جاری ہوتا ہے۔ مطلب یہ کہ اس کی بندہ نوازی دیکھو کہ اس نے اس زمین میں تمہارے لئے بلند و بالا پہاڑوں، وادیوں اور صحراؤں کے درمیان راستے بنا دیئے ہیں جن پر تم بآسانی سفر کرتے ہو۔ اس نے اس لئے یہ راستے بنائے ہیں تاکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ تم سفر کر کے زمین میں چھپے خزانے اور منفعت بخش اشیاء حاصل کر سکو۔ حضرت ابن عباس نے جو اس آیت کے تحت سَهَّلَ لَكُمْ فِيْهَا طُرُقًا فرمایا ہے اس کا بھی یہی مفہوم ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں السلک کا معنی ایک چیز کو دوسری چیز میں داخل کرنا ہے۔ معنی یہ ہے کہ اس نے تمہاری خاطر زمین میں راستے داخل کر دیئے(2)۔ اسی معنی میں یہ ارشاد ہے مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ۔ یعنی اس عمل نے تمہیں سقر میں داخل کیا۔ وانزل من السماء ماءً سے مراد بارش ہے۔

۳؎ ہم اس پانی کے ذریعے گوناں گوں نباتات کے جوڑے نکالتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں انزل من السماء ماءً پھر موسیٰ علیہ السلام کا خطبہ مکمل ہوتا ہے اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اہل مکہ کو خطاب کرتے ہوئے اپنی قدرت کی نشانیوں کو بیان فرما رہے ہیں جن کے ساتھ موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کا تعارف کرا رہے تھے۔ ظاہر کا مقتضیٰ یہ ہے کہ یہ موسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی کہ اس نے تم پر بارش برسائی اور تم پر احسان جتلاتے ہوئے فرمایا اخرجنا بہ تاکہ تم شکر سے سجدہ ریز ہو جاؤ۔ یا یہ موسیٰ علیہ السلام کا ہی کلام ہے اور معنی یہ ہے کہ اس نے انسانوں سے ہماری جنس کے بیٹے پیدا فرمائے۔

۴؎ ازواجاً کا مطلب اصنافاً ہے، یعنی مختلف اقسام اصناف کو ازواج اس لئے کہتے ہیں کیونکہ وہ ایک دوسرے کے قریب قریب ہوتی ہیں۔ من نبات ازواج کی صفت اور بیان ہے۔ شتیٰ ازواج کی صفت ہے اور یہ بھی احتمال ہے کہ نبات کی صفت ہو کیونکہ یہ اصل میں مصدر ہے جس میں واحد جمع برابر ہوتے ہیں۔ شتی جمع ہے شتیت کی۔ جیسے مریض کی جمع مرضیٰ ہے اور یہ شت الامر سے مشتق ہے جس کا معنی جدا جدا ہونا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین سے اگنے والی نباتات کی صورتیں، اغراض اور منافع بالکل الگ الگ کر دیئے ہیں، ان میں بعض انسان کے لئے مفید ہیں اور بعض حیوانات کی اصلاح کے لئے ہیں۔

كُلُوْا وَارْعَوْا اَنْعَامَكُمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّاُولِي النُّهٰى ﴿۵۴﴾

”خود بھی کھاؤ اور اپنے مویشیوں کو بھی چراؤ۱؎ بیشک اس میں (ہماری قدرت و حکمت کی) نشانیاں ہیں دانشوروں کے لئے ۲؎“

۱؎ دعیٰ کا لفظ لازم اور متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا ہے عرب کہتے ہیں رعیت القوم فرعت۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے جانوروں کو چراؤ۔ یہ امر اباحت کے لئے اور نعمت یاد دلانے کے لئے ہیں۔ یہ جملہ قول کے ارادہ پر اخرجنا کی ضمیر سے حال ہے، یعنی

1۔ القاموس المحیط، جلد 2، صفحہ 1249 (التراث العربی) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ)

ہم نے کلوا وارعوا کہتے ہوئے مختلف نباتات پیدا فرمائے۔ تمہارے کھانے اور جانوروں کے چارہ کی منفعت کے لئے ہم نے نباتات تیار کئے ہیں اوران میں تصرف کی تمہیں اجازت بھی مرحمت فرمائی ہے۔

۲؎ ذالک کا مشار الیہ زمین کو بچھونا بنانا' آسمان سے بارش نازل کرنا اور زمین کے بطن سے انتفاع کے لئے نباتات پیدا کرنا ہے۔ فرمایا یہ سب چیزیں اور یہ سب افعال خالق کے وجود' اس کے واجب الوجود' اس کے احاطہ علم' اس کی قدرت کاملہ' اس کی تخلیق' اس کے کمالات سے متصف ہونے اور نقائص سے پاک ہونے کی بین دلیل ہیں۔ اولی النھیٰ سے مراد ذوی العقول اور دانشمند ہیں نھیٰ جمع ہے نھیۃ کی عقل کو ناھیہ اس لئے کہتے ہیں کیونکہ یہ برائیوں اور کوتاہیوں سے روکتی ہے۔

مِنْهَا خَلَقْنٰكُمْ وَ فِيْهَا نُعِيْدُكُمْ وَ مِنْهَا نُخْرِجُكُمْ تَارَةً اُخْرٰى ﴿۵۵﴾

''اسی زمین سے ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی میں ہم تمہیں لوٹائیں گے ۱؎ اور (روز حشر) اسی سے ہم تمہیں نکالیں گے ایک بار پھر ۲؎''

۱؎ منھا میں ھا ضمیر کا مرجع الارض ہے۔ یعنی ہم نے زمین کی مٹی سے تمہارے باپ آدم اور تمہارے بدنوں کا مواد تیار کیا کیونکہ نطفہ انسانی غذاؤں سے پیدا ہوتا ہے اور غذا مٹی سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے فرمایا ہم نے تمہیں زمین سے پیدا فرمایا۔ امام بغوی نے عطاء الخراسانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ فرشتہ اس مکان سے مٹی اٹھاتا ہے جہاں انسان نے دفن ہونا ہوتا ہے اور اس مٹی کو نطفہ میں ڈال دیتا ہے پس مٹی اور نطفہ سے انسان کی تخلیق ہوئی ہے(1)۔

عطاء کے قول کی دلیل رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔ جو بچہ پیدا ہوتا ہے اس کی ناف میں مٹی ضرور ہوتی ہے جس سے اس کی تخلیق ہوتی ہے پھر جب بڑھاپے کی عمر کو پہنچ جاتا ہے تو اس مٹی کی طرف اسے لوٹا دیا جاتا ہے جس سے اس کی تخلیق ہوئی تھی اور اسی مٹی میں اسے دفن کر دیا جاتا ہے۔ میں' ابوبکر اور عمر ایک مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں اور اسی ایک مٹی میں دفن ہوں گے(2)۔ اس حدیث کو خطیب نے ابن مسعود سے روایت کیا ہے اور فرمایا یہ حدیث غریب ہے۔ ابن الجوزی نے اس حدیث کو موضوعات میں نقل کیا ہے۔ شیخ محدث مرزا محمد الحارثی بدخشی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔ اس حدیث کے شواہد ابن عمر' ابن عباس' ابوسعید' ابوہریرہ سے مروی ہیں۔ یہ تمام احادیث ایک دوسرے کو تقویت دیتی ہیں اس لئے یہ حدیث کثرت طرق کی بناء پر حسن ہے اور اس حدیث کی تائید اس اثر سے بھی ہوتی ہے جو علامہ عینی رحمۃ اللہ علیہ نے شرح بخاری کتاب الجنائز میں محمد بن سیرین سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں اگر میں قسم اٹھاؤں تو میں اپنی قسم میں بالکل سچا ہوں گا اور مجھے کچھ تردد نہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی ﷺ' ابوبکر اور عمر کی تخلیق ایک مٹی سے فرمائی ہے(3) اسی طرح ابن عساکر نے عبداللہ بن جعفر سے روایت کیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اے عبداللہ تجھے مبارک ہو تو میری مٹی سے پیدا کیا گیا ہے اور تیرا باپ (جعفر) ملائکہ کے ساتھ آسمان میں اڑتا ہے(4) اسی طرح دیلمی نے مسند الفردوس میں اور ابن نجار نے نبی کریم ﷺ سے روایت کیا ہے فرمایا آزاد کرنے والے کا خمیر میری مٹی سے ہے(5) شاید یہ رسول اللہ ﷺ نے کسی غلام کو آزاد کرنے والے شخص سے فرمایا ہو۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ)
2۔ کنز العمال، جلد 11، صفحہ 565 (التراث الاسلامی)
3۔ عمدۃ القاری شرح صحیح بخاری، جلد 7، صفحہ 150 (ابن تیمیہ)
4۔ تاریخ ابن عساکر، جلد 27، صفحہ 261 (الفکر)
5۔ کنز العمال، جلد 10، صفحہ 317 (التراث الاسلامی)

ان مذکورہ بالا احادیث' اقوال سلف صالحین اور حضرت عطاء کی تاویل سے ظاہر ہوتا ہے کہ بعض لوگ کسی نبی کی مٹی سے پیدا ہوئے ہیں۔ صوفیاء کی اصطلاح میں اسے اصالۃ الطینہ کہتے ہیں۔ بلکہ بعض لوگ حضرت محمد ﷺ کی مٹی سے تخلیق ہوئے ہیں، اسے اصطلاح صوفیاء میں اصالۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔

میں کہتا ہوں اللہ تعالیٰ نے جس روز آسمانوں اور زمین کو تخلیق فرمایا تو زمین کے بعض اجزاء کو بعض افراد کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا اور بعض دوسرے اجزاء کو دوسرے لوگوں کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا۔ زمین کا وہ ٹکڑا جو اللہ تعالیٰ نے کسی نبی کی تخلیق کے لئے تیار فرمایا تھا، اس پر انوار و تجلیات اور برکات الٰہیہ کا نزول ہمیشہ سے ہوتا رہا جو تجلیات اس نبی کے ساتھ مختص تھیں حتیٰ کہ وہ مٹی اس قابل ہو گئی کہ اس سے نبی کے بدن مبارک کو تیار کیا جائے پھر وہ مٹی جو نبی کی تخلیق کے لئے تیار کی گئی تھی اس سے تخلیق نبی کا جسم مقدس تیار کرنے کے بعد ممکن ہے کچھ مٹی بچ گئی ہو اور وہ مٹی پھر دوسرے لوگوں کے لئے مادہ بن گئی ہو اور وہ غیر بھی اس سے مشرف ہو جیسا کہ حدیث میں وارد ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا اپنی پھوپھی کھجور کے درخت کی عزت کرو(1) کیونکہ یہ تمہارے باپ آدم کی بقیہ مٹی سے پیدا کی گئی ہے اور اللہ کے نزدیک کوئی درخت اس درخت سے افضل نہیں ہے جس کے نیچے حضرت مریم بنت عمران نے عیسیٰ علیہ السلام کو جنم دیا تھا۔ اپنی عورتوں اور اپنے بچوں کو تازہ کھجوریں کھلاؤ اور اگر یہ نہ ہوں تو چھوارے کھلاؤ۔ اس حدیث کو ابویعلی الموصلی نے اپنی مسند میں' بخاری نے اپنی تاریخ میں اور ابن حاتم' العقیلی' ابن عدی' ابن السنی اور ابونعیم نے الطب میں اور ابن مردویہ نے حضرت علی علیہ السلام سے روایت کیا ہے، ابن عساکر نے حضرت ابوسعید الخدری سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کھجور' انار اور انگور آدم علیہ السلام کی مٹی سے پیدا کئے گئے ہیں(2)۔ شیخ احمد مجدد الف ثانی نے اپنے مکتوب نمبر 99 جلد ثالث میں اصالۃ الکبریٰ کا دعویٰ کیا ہے۔ بعض لوگوں نے جہالت یا عناد کی وجہ سے حضرت کے اس دعویٰ کا انکار کیا ہے۔ ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو اولیاء اللہ سے عناد اور دشمنی رکھتا ہے اور ان کے متعلق حسن ظن نہیں رکھتا۔

؎ مرنے کے بعد تمہارے اجزاء کو بکھیرنے اور منتشر کرنے کے ساتھ ہم تمہیں لوٹائیں گے اور پھر قیامت کے روز تمہیں مرکب کر کے سابقہ صورتوں پر اٹھائیں گے اور تمہارے ان ڈھانچوں میں پھر سے روح لوٹا دیں گے۔

وَ لَقَدْ اَرَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا كُلَّهَا فَكَذَّبَ وَ اَبٰى ﴿۵۶﴾

"اور ہم نے دکھلا دیں فرعون کو اپنی ساری نشانیاں پھر بھی اس نے جھٹلایا اور ماننے سے انکار کر دیا ؎"

؎ یعنی موسیٰ علیہ السلام نے انہیں معجزات دکھائے لیکن اس کے باوجود وہ بدبخت انکار اور تکذیب پر مصر رہا۔ کلھا کی تاکید یا تو تمام اقسام کو شامل کرنے کے لئے یا ہر ہر فرد کو شامل کرنے کے لئے ہے کیونکہ یہاں اضافت عہد کے لئے ہے اور آیات سے مراد وہ نو نشانیاں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرمائی تھیں۔

قَالَ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى ﴿۵۷﴾

"کہنے لگا موسیٰ! کیا تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ نکال دو ہمیں اپنے ملک سے اپنے جادو کی طاقت سے ؎"

؎ قال کا فاعل فرعون ہے اور یہ کذب و ابی' سے بدل اشتمال ہے یا تاکید ہے اور استفہام تقریری ہے۔ ارضنا سے مصر کی زمین

1۔ تفسیر قاسمی، جلد 3، صفحہ 390 (بیروت) 2۔ کنز العمال، جلد 12، صفحہ 339 (التراث الاسلامی)

مراد ہے۔ اے موسیٰ آپ یہی چاہتے ہیں کہ تو ہمارے ملک پر غالب آ کر خود اقتدار سنبھالے۔

فَلَنَاْتِيَنَّكَ بِسِحْرٍ مِّثْلِهٖ فَاجْعَلْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَكَ مَوْعِدًا لَّا نُخْلِفُهٗ نَحْنُ وَ لَآ اَنْتَ مَكَانًا سُوًى ﴿۵۸﴾

''سو ہم بھی لائیں گے تیرے مقابلہ میں جادو ویسا ہی پس (اب) مقرر کرو ہمارے اور اپنے درمیان مقابلے کا دن نہ ہم پھریں اس سے اور نہ ہی تو پھرے جمع ہونے کی جگہ ہموار اور کھلی ہو ۱؎ ''

۱؎ ابوجعفر نے لا نخلفه کو جواب امر کی بناپر مجزوم پڑھا ہے کیونکہ اخلاف وعدہ میں ہوتا ہے، زمان اور مکان میں نہیں ہوتا اور یہاں مضاف محذوف ہے تقدیر اس طرح ہے مکان موعد۔ مکاناً محذوف مکان سے بدل ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مضاف موعد سے پہلے مقدر نہ ہو اور مکاناً مصدر یا اس فعل کی وجہ سے منصوب ہو جس پر مصدر دلالت کر رہا ہے۔ سوی کو ابن عامر، حمزہ، عاصم اور یعقوب نے سین کے ضمہ کے ساتھ پڑھا ہے اور باقی قراء نے سین کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ یہ دونوں لغتیں ہیں جیسا کہ عِدًى و عُدًى اور طوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جگہ ایسی ہو جو مسافت کے اعتبار سے ہمارے اور تمہارے درمیان برابر برابر ہو۔ سوی کی یہ تشریح قتادہ مجاہد نے فرمائی ہے۔ اور ابن عباس سے بھی یہی مروی ہے۔ کلبی کہتے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ زمین ہموار ہو(1)۔ ابوبکر، حمزہ اور کسائی نے اسے امالہ کے ساتھ پڑھا ہے اور ورش اور ابوعمرو نے اپنی اصل پر بین بین پڑھا ہے اور باقی قراء نے اپنے اصول پر فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

قَالَ مَوْعِدُكُمْ يَوْمُ الزِّيْنَةِ وَ اَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ ضُحًى ﴿۵۹﴾

''آپ نے فرمایا (تمہارا چیلنج منظور ہے) جشن کا دن تمہارے لئے مقرر کرتا ہوں۔ اور یہ خیال رہے کہ سارے لوگ چاشت کے وقت جمع ہو جائیں ۱؎ ''

۱؎ موعد سے پہلے مکان مضمر ہے، یعنی تمہارے لئے وعدہ کا وقت تمہارے میلہ اور جشن کا دن ہے یا یوم سے پہلے موعد مضمر ہے، یعنی موعدکم موعد یوم الزینة یا یہ معنوی حیثیت سے فرعون کے سوال کا جواب ہے کیونکہ جشن کا دن، مشہور مکان پر دلالت کرتا ہے جہاں لوگ اس روز جمع ہوتے ہیں۔ مجاہد، قتادہ، مقاتل اور سدی فرماتے ہیں ان کی عید کا ایک دن متعین تھا جس میں وہ زیب و زینت کرتے تھے اور ہر سال اس میں اجتماع کرتے تھے۔ بعض علماء فرماتے ہیں وہ نیروز کا دن تھا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں یہ عاشورہ کا دن تھا(2)۔ موسیٰ علیہ السلام نے مشہور میلہ کے دن کا تعین اس لئے فرمایا تا کہ حق کا علم بلند ہو اور باطل ساری دنیا کے سامنے رسوا اور ذلیل ہو۔ ضحی سے مراد چاشت کا وقت ہے۔ یہ اس لئے فرمایا تا کہ کسی قسم کا کوئی شبہ نہ رہے۔ وَاَنْ يُّحْشَرَ النَّاسُ کا عطف یوم پر ہے یا زینة پر ہے۔

فَتَوَلّٰى فِرْعَوْنُ فَجَمَعَ كَيْدَهٗ ثُمَّ اَتٰى ﴿۶۰﴾

''پھر فرعون واپس مڑا اور اکٹھا کیا اپنی فریب کاریوں کو پھر خود آیا ۱؎ ''

۱؎ یعنی فرعون نے اپنے جادوگروں کو جمع کیا تا کہ موسیٰ علیہ السلام پر غلبہ حاصل کرے اور پھر وقت مقرر پر مقابلہ کی جگہ پہنچ گیا۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ) 2۔ ایضاً

قَالَ لَهُمْ مُّوسٰى وَيْلَكُمْ لَا تَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا فَيُسْحِتَكُمْ بِعَذَابٍ ۚ وَ قَدْ خَابَ مَنِ افْتَرٰى ﴿۶۱﴾

’’فرمایا ان فرعونیوں کو موسیٰ نے کم بختو! نہ بہتان باندھو اللہ تعالیٰ پر جھوٹے [1] ورنہ وہ تمہارا نام ونشان مٹا دے گا کسی عذاب سے [2] اور (اس کا یہ اٹل قانون ہے) کہ ہمیشہ نامراد رہتا ہے جو افتراء بازی کرتا ہے [3] ‘‘

[1] امام بغوی فرماتے ہیں لھم کی ضمیر ان جادوگروں کے لئے ہے جنہیں فرعون نے مقابلہ کے لئے بلایا تھا اور ان کی تعداد بہتر 72 تھی اور ہر جادوگر کے ساتھ ایک رسی اور عصا تھا۔ حضرت کعب فرماتے ہیں چار سو تھے۔ بعض علماء نے ان کی تعداد 12000 بارہ ہزار لکھی ہے۔ بعض نے فرمایا اس سے بھی زیادہ تھے (1)۔ ویلکم ہلاکت کے معنی میں الزم کا مفعول به ہے، یعنی الزمکم اللّٰہ الویل ای الھلاک یا یہ فعل محذوف کا مصدر ہے۔ ای ھلکتم ھلاکا یا یہ حرف ندا کے حذف کے ساتھ منادی ہے ای ویلکم۔ یہ دعائیہ یا ندائیہ جملہ ہے اور کلام میں شروع ہونے سے پہلے منھی عنہ کے ارتکاب کی وجہ سے بری حالت کے اظہار کے لئے نہی کے مقدمہ کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ کذبا لا تفتروا کا مفعول مطلق ہے کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ اللہ کا شریک بنا کر اللہ پر کوئی جھوٹ نہ بولے۔

[2] فیسحتکم کو حفص، حمزہ اور کسائی نے یاء کے ضمہ اور حاء کے کسرہ کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے، جبکہ دوسرے قراء نے یاء اور حاء کے فتحہ کے ساتھ فعل مجرد سے پڑھا ہے۔ معنی دونوں کا ایک ہی ہے۔ اسحات نجد اور تمیم کی لغت ہے اور السحت حجاز کی لغت ہے۔ مقاتل اور کلبی فرماتے ہیں اس کا معنی فیھلککم (وہ تمہیں ہلاک کر دے گا) ہے۔ قتادہ نے اس کا معنی فیستاصلکم کیا ہے یعنی وہ تمہیں جڑ سے اکھیڑ دے گا (2)۔

[3] یقیناً نامراد ہوا وہ شخص جس نے بھی اللہ پر افتراء باندھا۔ واقعی اسی طرح ہے کہ فرعون نے اللہ پر افتراء باندھا اور فریب کیا تاکہ اس کا اقتدار اور سیاست کا سکہ ہمیشہ چلتا رہے اور اس کی باطل خدائی کا ڈنکا بجتا رہے لیکن اس کی ہزار حیلہ سازیوں کے باوجود اس کو کچھ فائدہ نہ ہوا (انجام کار رسوا و ذلیل ہو کر اس دنیا سے دفع ہو گیا)

فَتَنَازَعُوْٓا اَمْرَهُمْ بَيْنَهُمْ وَ اَسَرُّوا النَّجْوٰى ﴿۶۲﴾

’’پس وہ جھگڑنے لگے اس کام کے متعلق آپس میں اور چھپ چھپ کر مشورے کرنے لگے [1] ‘‘

[1] فرعون اور اس کے بلائے ہوئے جادوگر موسیٰ کلیم اور ہارون علیہما السلام کی بھرے مجمع میں آمد اور جرأت و بے باکی دیکھ کر سرگوشی کرنے لگے اور جھگڑنے لگے کہ ان پاکبازوں کے ساتھ مقابلہ کرنا ٹھیک بھی ہے یا نہیں (کہیں ایسا نہ ہو کہ لینے کے دینے پڑ جائیں) محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی گرجدار آواز میں پوری جرأت اور استقامت سے یہ فرمایا ویلکم لا تفتروا علی اللّٰہ کذبا تو وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے یہ کسی جادوگر کا قول وکلام نہیں ہے (3) النجوی اسم ہے یا مصدر ہے۔ اس کا معنیٰ سرگوشی کرنا ہے۔ اس کا اصل معنی کسی بلند جگہ پر علیحدہ ہونا ہے۔ زمین کے اونچے اور بلند حصے کو اس کی بلندی کی وجہ سے نجوہ کہتے ہیں۔ بعض علماء فرماتے ہیں اس کی اصل النجاۃ ہے جس کا معنی الخلاص ہے، یعنی ایسا مشورہ اور معاونت جس میں نجات اور خلاصی ہو۔ کلبی کہتے ہیں انہوں نے آپس میں سرگوشی کی کہ اگر موسیٰ علیہ السلام ہم پر غالب آ گئے تو ہم اس کی اتباع کریں گے (4)۔

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 220 (التجاریہ) 3۔ ایضاً 4۔ ایضاً

قَالُوْٓا اِنْ هٰذٰىنِ لَسٰحِرٰنِ يُرِيْدٰنِ اَنْ يُّخْرِجٰكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهِمَا وَ يَذْهَبَا بِطَرِيْقَتِكُمُ الْمُثْلٰى ﴿۶۳﴾

”وہ ایک دوسرے کو کہنے لگے بلاشبہ یہ دو جادوگر ہیں یہ چاہتے ہیں کہ نکال دیں تمہیں [1] تمہارے ملک سے اپنے جادو کے زور سے اور مٹا دیں تمہاری (تہذیب وثقافت کے) مثالی طریقوں کو [2]“

[1] باہمی تنازع اور جھگڑا کے بعد ان کا مشورہ اس بات تک پہنچا کہ جادوگر ہیں اور ہمیں اپنے ملک سے دیس نکالا دے کر خود مسند اقتدار پر براجمان ہونا چاہتے ہیں اور ہماری ساری تہذیب وثقافت کو ختم کر کے نئے طور طریقے نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ حقیقتاً یہ قول فرعون کا ہے باقی سب چاروناچار اس کے ساتھ اس بات پر متفق ہو گئے تھے۔ پہلے بھی گزر چکا ہے کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کو گفتگو کے دوران یہ بھی کہا تھا کہ اَجِئْتَنَا لِتُخْرِجَنَا مِنْ اَرْضِنَا بِسِحْرِكَ يٰمُوْسٰى (اے موسیٰ تم اس لئے ہمارے پاس آئے ہو کہ ہمیں ہمارے ملک سے اپنے جادو کے ذریعے ملک بدر کر دو) اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کے تنازع کا سورۂ مؤمن میں بھی تذکرہ کیا ہے۔ وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ ..... اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿﴾ تک اسی تنازع کا تذکرہ ہے۔

ابن کثیر اور حفص نے هذان سے پہلے ان کو نون تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ یہ نون مخففہ من مثقلہ ہے اور لساحران پر لام یہ فرق بتانے کے لئے ہے کہ یہ ان نافیہ ہے اور لام بمعنی الا ہے (یعنی یہ دونوں نہیں ہیں مگر جادوگر) ابن کثیر نے هذان کے نون کو بھی مشدد پڑھا ہے۔ باقی قراء نے ان کو مشددہ پڑھا ہے' ابوعمرو نے هذان کو ان کے اسم کی حیثیت سے اصل کے مطابق هذين پڑھا ہے، باقی قراء نے هذان پڑھا ہے۔ ان (مشددہ) کے بعد هذان کو خلاف اصل پڑھنے کی توجیہات میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہشام بن عروہ عن ابیہ عن عائشہ کی سند سے مروی ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں یہ کاتب کی غلطی ہے لیکن یہ قول درست نہیں ہے اور اجماع کے مخالف ہے (اس لئے قابل غور ہی نہیں ہے) بعض علماء فرماتے ہیں ابو الحارث بن کعب' خثعم اور کنانہ قبائل کی لغت پر ہے کیونکہ وہ تثنیہ کو حالت رفعی' نصبی اور جری میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں، وہ الف کو علامت تثنیہ بناتے ہیں اور تثنیہ کا اعراب تقدیری کہتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں اتاني الزيدان' رايت الزيدان' مررت بالزيدان اسی طرح یہ مذکورہ قبائل یاء ساکن ماقبل مفتوح کو تثنیہ میں الف کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں كسرت يداه و ركبت علاه اصل میں يديه اور عليه تھا۔ اسی طرح اسماء ستہ مکبرہ جب ی متکلم کے علاوہ کسی دوسرے اسم کی طرف مضاف ہوں تو ان کو الف کے ساتھ پڑھتے ہیں مثلاً شاعر کہتا ہے۔

اِنَّ اَبَاهَا وَاَبَا اَبَاهَا قَدْ بَلَغَا فِي الْمَجْدِ غَايَتَاهَا

بعض علماء فرماتے ہیں ان کا اسم ضمیر شان محذوف ہے اور هذان لساحران ان کی خبر ہیں۔ تقدیر عبارت اس طرح ہوگی انه هذان لساحران۔ بعض علماء فرماتے ہیں یہ ان بمعنی نعم (ہاں) ہے اور اس کا مابعد مبتدا اور خبر ہیں۔

روایت ہے کہ ایک بدو اونٹنی پر سوار ہو کر عبداللہ بن الزبیر کے پاس کچھ مانگنے کے لئے آیا لیکن آپ نے اسے کوئی چیز نہ دی بدو کہنے لگا اللہ لعنت کرے اس اونٹنی پر جو مجھے سوار کر کے تیرے دروازے پر لے آئی ہے۔ آپ نے جواب فرمایا ان و صاحبها (ہاں اس کے مالک پر بھی اللہ لعنت فرمائے) تو یہاں آپ نے ان بمعنی نعم استعمال فرمایا ہے(1) امام بیضاوی فرماتے ہیں لیکن ان آخری

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریۃ)

دوصورتوں میں مبتدا کی خبر پر لام کا دخول لازم آئے گا حالانکہ یہ بغیر ضرورت کے خبر پر لام داخل نہیں کیا جاتا (بلکہ یہ لام مبتدا کی موصوفیت کی تاکید کے لئے وضع کیا گیا ہے) بعض علماء خبر پر لام کے دخول کے اعتراض کے جواب میں فرماتے ہیں کہ یہ اصل میں ان هذان لهما ساحران ہے یا (ان بمعنی نعم) کی صورت میں نعم هذان لهما ساحران ہے، یعنی اصل میں خبر پر لام داخل نہیں ہے بلکہ مبتدا مقدر پر لام داخل ہے۔ اس میں ضمیر شان کو حذف کیا گیا ہے اور هما کو بھی حذف کیا گیا ہے۔ لیکن امام بیضاوی فرماتے ہیں یہ جواب درست نہیں ہے کیونکہ جو اسم لام ابتداء سے مؤکد ہواسے حذف کرنا مناسب نہیں ہے (1) (کیونکہ حذف' تاکید سے جو غرض مقصود ہے اس کے منافی ہے)

۳۔ من ارضكم سے مراد مصر ہے۔ مثلی' امثل کی تانیث ہے' اس کا معنی افضل ہے۔ ابن عباس نے طريقتكم المثلى کا معنی' قوم کے اشراف اور سرکردہ لوگ کیا ہے۔ مثلاً کہا جاتا ہے۔ هو لاء طريقة قومهم یعنی وہ لوگ قوم کے سردار ہیں' شعبی نے حضرت علی سے یہ معنی نقل کیا ہے کہ یہ دونوں شخص لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرنا چاہتے ہیں۔ قتادہ فرماتے ہیں۔ اس زمانہ میں بنواسرائیل نفری اور مال کے اعتبار سے زیادہ تھے۔ تو اللہ کے دشمن فرعون نے (بنواسرائیل کو بھڑ کانے کے لئے) کہا کہ یہ دونوں حضرات سب لوگوں کو اپنا تبع اور پیروکار بنانا چاہتے ہیں (2) فرعون نے یہ بات موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کے بعد کی تھی جب آپ نے اسے کہا کہ ارسل معی بنی اسرائیل (بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دے) بعض علماء فرماتے ہیں طريقتكم المثلى سے مراد ہے اس نے طریقہ اور دین بنالیا، یعنی اس نے قوم کے دلوں میں نفرت پیدا کرنے کے لئے یہ کہا کہ یہ دونوں تمہاری معاشرتی قدروں اور تمہارے دین کو مٹانا چاہتے ہیں جس پر تم عرصہ دراز سے کاربند ہو۔ اس مفہوم کی تائید اس ارشاد سے بھی ہوتی ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ نے فرعون کی طرف سے حکایت فرمایا ہے۔ اِنِّیْۤ اَخَافُ اَنْ یُّبَدِّلَ دِیْنَكُمْ (مجھے اندیشہ ہے کہ تمہارے دین کو بدل دے گا) يريدان کا جملہ هذان کی دوسری خبر ہے یا ساحران کی ضمیر سے حال ہے یا جملہ مستانفہ ہے۔

فَاَجْمِعُوْا كَیْدَكُمْ ثُمَّ ائْتُوْا صَفًّا ۚ وَ قَدْ اَفْلَحَ الْیَوْمَ مَنِ اسْتَعْلٰى ﴿۶۴﴾

''پس یکجا کرلو اپنی حیلہ سازیوں کو ۱؎ پھر آؤ پرے باندھے ہوئے ۲؎ اور کامیاب ہوگا آج وہ گروہ جو (اس مقابلہ میں) غالب رہا ۳؎''

۱؎ ابوعمرو نے اجمعوا کو همزه وصلی اور میم مفتوح کے ساتھ مجرد فعل سے پڑھا ہے یہ قرأت فَجَمَعَ كَيْدَهٗ کے مطابق ہے، جب کہ باقی قراء نے ہمزہ قطعی اور میم مکسور کے ساتھ باب افعال سے پڑھا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں جمع اور اجمع دونوں کا معنی ایک ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اس کا معنی ہے تم اتفاق رائے کرلو۔ پختہ عزم کرلو اور اختلاف نہ کرو تاکہ تمہارے معاملہ میں گڑبڑ نہ ہو۔

۲؎ صف مصدر ہے، اس کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز کو خط مستوی پر بنانا جیسے لوگ یا درخت لائن میں سیدھے کھڑے کئے جاتے ہیں۔ یہاں مصدر بمعنی اسم فاعل ہے۔ یعنی صف بستہ ہوکر آؤ، اکٹھے ہوکر ہمارے مقابلہ میں آؤ کیونکہ یک زبان اور اتفاق رائے سے آنا دیکھنے والوں کے دلوں میں زیادہ ہیبت ڈالتا ہے۔ مقاتل اور کلبی نے یہی تشریح لکھی ہے۔ اس کی نظیر قرآن میں بھی ہے فرمایا اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (بیشک اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے ان (مجاہدوں) سے جو اس کی راہ میں جنگ

1۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 634 (العلمیہ) 2۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریہ)

کرتے ہیں پرا باندھ کر گویا وہ سیسہ پلائی دیوار ہیں۔ صَفًا ترکیب نحوی کے اعتبار سے اور اس معنی کے اعتبار سے ایتوا کے فاعل سے حال ہوگا۔ ابوعبیدہ جو لغت کے امام ہے وہ فرماتے ہیں الصف کا معنی المجمع ہے۔ جائے نماز کو الصف اسی معنی کے اعتبار سے کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ متعین جگہ پر آجاؤ(1)۔

۳؎ آج وہی کامیاب ہوگا اور مطلوب پالے گا۔ جو غالب آئے گا یہ جملہ معترضہ ہے، یعنی ماقبل اور مابعد کلام سے لفظی یا معنوی کوئی تعلق نہیں ہے۔

قَالُوْا یٰمُوْسٰۤی اِمَّاۤ اَنْ تُلْقِیَ وَ اِمَّاۤ اَنْ نَّكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَلْقٰی ﴿۶۵﴾

''جادوگر بولے اے موسیٰ! کیا پہلے آپ پھینکیں گے یا ہم ہو جائیں پہلے پھینکنے والے ۱؎''

1۔ جادوگر جب مقررہ جگہ پہنچے تو نبی کا پاس ادب کرتے ہوئے یا اپنے فریب و دجل کی بڑائی کا اظہار کرتے ہوئے اور اپنی کامیابی پر وثوق اور اعتماد کی بناء پر کہا اے موسیٰ (علیہ السلام) کیا تم اپنا عصا پہلے ڈالو گے یا ہم پہلے رسیاں ڈالیں۔ ان موصول حرفی دونوں مقامات پر اپنے صلہ سے مل کر مضمر فعل کی وجہ سے محل نصب میں ہے یا مبتدا محذوف کی خبر ہونے کی بنا پر مرفوع ہے۔ پہلی صورت میں تقدیر عبارت اس طرح ہوگی۔ اِخترِ امّا القائک اولاً و اما کوننا اول من القی اور دوسری ترکیب کے اعتبار سے تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا مر الذی حان حینہ اما القائک اولا و اما کوننا اول الملقین۔

قَالَ بَلْ اَلْقُوْا ۚ فَاِذَا حِبَالُهُمْ وَ عِصِیُّهُمْ یُخَیَّلُ اِلَیْهِ مِنْ سِحْرِهِمْ اَنَّهَا تَسْعٰی ﴿۶۶﴾

''آپ نے فرمایا نہیں تم ہی (پہلے) پھینکو ۱؎ پھر کیا تھا یکا یک ان کی رسیاں اور ان کی لاٹھیاں آپ کو یوں دکھائی دینے لگیں ان کے جادو کے اثر سے جیسے وہ دوڑ رہی ہوں ۲؎''

۱؎ موسیٰ علیہ السلام نے ادب کے مقابلہ میں ادب پیش کرتے ہوئے فرمایا پہلے تم اپنے جادو کا مظاہرہ کر و یا اس لئے آپ نے انہیں پہلے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ڈالنے کو کہا کیونکہ آپ کو ان کے جادو کی کوئی پرواہ نہیں تھی اور چونکہ انہوں نے اپنی کلام میں پہلے اللہ تعالیٰ کی طرف میلان کا اظہار کیا تھا، اس لئے آپ نے ان کو مزید مائل و قائل کرنے کے لئے انہیں ایسا پہلے کرنے کو کہا اور ان کی کلام میں زیادہ بلاغت ہے بنسبت اس کلام کے جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے بیان کی گئی ہے۔ آپ نے انہیں فرمایا جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ظاہر کرو اور اپنی کوشش سے جادو کو مضبوط کر لو کیونکہ آپ کو معلوم تھا کہ باطل کے مغرور سر پر حق کا ایک ہی کوڑا برسے گا اور اس کا سارا نشہ اور تکبر کافور ہو جائے گا اور حق کا علم اپنی پوری بلندی پر لہرائے گا۔

۲؎ عصیُّ اصل میں عصوو تھا، دونوں واؤ یا سے بدل کر ادغام ہو گئیں اور پھر صاد کو یاء کی مناسبت سے کسرہ دے دیا گیا۔ اس کلام میں حذف ہے تقدیر عبارت اس طرح ہے فالقوا حبالھم و عصیھم فاذا حبالھم الخ یعنی انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں پھینکیں تو ان کی رسیاں دوڑتے ہوئے سانپ نظر آنے لگیں۔ اذا ظرف زمان ہے اور مفاجاۃ کے فعل کے ساتھ منصوب ہے اور جملہ اسمیہ کی طرف مضاف ہے۔ حبالھم و عصیھم مبتداء ہے اور مابعد خبر ہے اور ضمیر عائد یا تو یخیل کی ضمیر ہے یا انھا کی

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 221 (التجاریۃ)

ضمیر ہے اور یہ جملہ ابتدائیہ ہے۔ یخیل کو ابن ذکو ان نے تاء کے ساتھ پڑھا ہے اس بناء پر کہ اس میں ضمیر مرفوع حبالا و رعصی کی طرف راجع ہے۔ انھا تسعی یخیل کی ضمیر سے بدل اشتمال ہے۔ باقی قراء نے یاء کے ساتھ یخیل پڑھا ہے۔ اور اس قرأت پر انھا تسعٰی لیخیل کا نائب الفاعل ہوگا۔ اس واقعہ میں ہے کہ جب انہوں نے اپنی رسیاں پھینکیں تو لوگوں کی نظر بندی کر لی۔ موسیٰ علیہ السلام اور لوگوں کو یوں محسوس ہونے لگا کہ زمین سانپوں سے بھر گئی ہیں جو ادھر ادھر دوڑ رہے ہیں۔

فَاَوْجَسَ فِيْ نَفْسِهٖ خِيْفَةً مُّوْسٰى ﴿۶۷﴾

''موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دل میں کچھ خوف محسوس کیا ۱؎''

۱؎ خیفۃً میں تنکیر تعلیل کے لئے ہے، یعنی آپ کے دل میں کچھ وحشت سی آئی۔ الوجس کا اصل معنی آہستہ آواز ہے۔ قاموس میں ہے الوجس الفزع یقع فی القلب او السمع من صوت او غیرہ(1) یعنی وجس کا معنی وہ گھبراہٹ ہے جو دل میں واقع ہوتی ہے یا اس کا معنی آواز وغیرہ کا سننا ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں بشری تقاضا پر آپ نے یہ گمان کیا شاید یہ پھنکارنے اور دوڑنے والے سانپ ان کی طرف آرہے ہیں۔ مقاتل فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام کو اپنا کچھ خوف نہ تھا، صرف آپ کو اپنی قوم کا خوف تھا کہ کہیں معاملہ ان پر خلط ملط نہ ہو جائے اور کہیں یہ میرے بارے میں شک میں نہ پڑ جائیں اور اتباع سے گریز کریں(2) اس جملہ کا عطف فاذا حبا لھم پر ہے۔

قُلْنَا لَا تَخَفْ اِنَّكَ اَنْتَ الْاَعْلٰى ﴿۶۸﴾

''ہم نے فرمایا (اے کلیم!) مت ڈرو یقیناً تم ہی غالب رہو گے ۱؎''

۱؎ یہ جملہ خوف سے نہی کی علت اور غلبہ کے ثبوت کے لئے ذکر کیا گیا ہے۔ استیناف' حرف تحقیق اور ضمیر فعل خبر کی تعریف اور لفظ علو (جو ظاہری غلبہ پر دلالت کرتا ہے) اور پھر صیغہ اسم تفضیل لگا کر جملہ کو مؤکد کیا گیا ہے۔

وَ اَلْقِ مَا فِيْ يَمِيْنِكَ تَلْقَفْ مَا صَنَعُوْا ؕ اِنَّمَا صَنَعُوْا كَيْدُ سٰحِرٍ ؕ وَ لَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى ﴿۶۹﴾

''اور زمین پر پھینک دو جو (عصا) تمہارے داہنے ہاتھ میں ہے یہ نگل جائے گا جو انہوں نے کاریگری کی ہے ۱؎ انہوں نے جو کاریگری کی ہے وہ تو فقط جادو کا فریب ہے ۲؎ اور نہیں فلاح پاتا جادوگر جہاں بھی وہ جائے ۳؎''

۱؎ الق کا عطف لا تخف پر ہے۔ اللہ تعالیٰ نے صراحۃً یہ نہیں فرمایا کہ ڈنڈا زمین پر پھینکو مبہم فرمایا جو کچھ تیرے ہاتھ میں ہے زمین پر پھینکو۔ اس کی وجہ یا تو ان جادوگروں کی رسیوں اور لاٹھیوں کی تحقیر کرنے کے لئے ہے، یعنی آپ ان کی رسیوں اور لاٹھیوں کی پرواہ نہ کریں اور اپنے ہاتھ کی چھڑی پھینکیں یا ان کی بڑائی کی وجہ سے ایسا ابہام فرمایا، یعنی تم ان جسموں کی کثرت اور بڑائی کو خاطر میں نہ لاؤ کیونکہ جو آپ کے ہاتھ میں ہے اس کا اثر ان سب سے زیادہ ہے۔

تلقف کو حفص نے لام کے سکون سے تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے لام کو فتحہ اور ق کو مشدد پڑھا ہے۔ اصل میں یہ تتلقف باب تفعل تھا، ایک تاء کو حذف کیا گیا ہے۔ تاء مضارع تانیث اور خطاب دونوں کا احتمال رکھتی ہے۔ تانیث کی

1۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 792 (التراث الاسلامی)

صورت میں ضمیر کا مرجع عصا ہوگا اور خطاب کی صورت میں فعل کی نسبت سبب کی طرف ہوگی۔ ابن ذکوان نے حال یا استیناف کی بناء پر مرفوع پڑھا ہے، جب کہ دوسرے قراء نے جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔

۲۔ اِنَّ کے بعد ما یا تو موصول ہے یا مصدریہ ہے ساحر فاعل کے وزن پر ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے حمزہ اور کسائی نے سحر سین کے کسرہ اور بغیر الف کے مصدر کے طور پر پڑھا ہے۔ کید سحر میں اضافت بیانیہ ہے یا تقدیر عبارت اس طرح ہے کید ذی سحر مضاف کو حذف کیا گیا ہے یا ساحر کو سحر مبالغہ کے لئے کہا گیا ہے۔ ساحر سے مراد جنس ساحر ہے۔

۳۔ ساحر کبھی کامیاب نہیں ہوتا جہاں بھی جائے۔ ابن عباس فرماتے ہیں جادو زمین کے کسی خطہ میں سعادت مند نہیں ہوتا۔ بعض فرماتے ہیں اس کا معنی یہ ہے کہ وہ جب بھی حیلہ سازی کرتا ہے کامیاب نہیں ہوتا(1)۔ ابن ابی حاتم اور ترمذی نے جندب بن عبداللہ البجلی سے روایت فرمایا ہے، فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا جب تم جادوگر کو پاؤ تو اسے قتل کر دو پھر آپ ﷺ نے آیت لَا يُفْلِحُ السَّاحِرُ حَيْثُ اَتٰى تلاوت فرمائی فرمایا جہاں بھی ہو امن میں نہیں ہوتا(2)۔ اِنَّمَا صَنَعُوْا کا جملہ تلقف کی تعلیل کے محل میں ہے۔

فَاُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ هٰرُوْنَ وَ مُوْسٰى ۝

''پس گرا دیئے گئے جادوگر سجدہ کرتے ہوئے انہوں نے (برملا) کہہ دیا (اے لوگو! سن لو) ہم ایمان لے آئے ہیں ہارون اور موسیٰ کے رب پر ۱۔''

۱۔ اس کلام میں اختصار ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے۔ فالقیٰ موسیٰ عصاہ فصارت ثعباناً ، یعنی موسیٰ علیہ السلام نے اپنا عصا ڈالا تو وہ بڑا سانپ بن گیا اور کچھ جادوگروں نے اپنی مہارت سے جادوگری کی تھی، اس کو نگل گیا۔ جادوگر پہچان گئے کہ یہ جادو کی کرشمہ سازی نہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ پس اس معرفت وعرفان نے انہیں اللہ کے حضور سربسجود ہونے پر مجبور کر دیا۔ وہ اپنی جادوگری سے توبہ کرتے ہوئے یا آیات الٰہیہ کو دیکھ کر ان کی عظمت کا اظہار کرتے ہوئے سجدہ ریز ہو گئے اور برسر محفل کہہ دیا ہم تو موسیٰ اور ہارون کے رب پر صدق دل سے ایمان لے آئے ہیں۔ ہارون اور موسیٰ کے درمیان واؤ مطلق جمع کے لئے ہے۔ ہارون کو پہلے ذکر کرنے میں سورۂ اعراف اور شعراء کی آیات کے ساتھ تعارض کی کوئی دلیل نہیں ہے جہاں موسیٰ علیہ السلام کا ذکر پہلے ہارون کا ذکر بعد میں ہے۔ یہاں ہارون کی تقدیم آیت کے سرے ملانے کے لئے ہے۔ قالوا امنا کا جملہ اُلْقِيَ السَّحَرَةُ سُجَّدًا سے بدل اشتمال ہے یا اس کی تاکید ہے۔

قَالَ اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ اِنَّهٗ لَكَبِيْرُكُمُ الَّذِيْ عَلَّمَكُمُ السِّحْرَ ۚ فَلَاُقَطِّعَنَّ اَيْدِيَكُمْ وَ اَرْجُلَكُمْ مِّنْ خِلَافٍ وَّ لَاُوصَلِّبَنَّكُمْ فِيْ جُذُوْعِ النَّخْلِ ۫ وَ لَتَعْلَمُنَّ اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى ۝

''فرعون (کو یارائے ضبط نہ رہا) بولا تم تو ایمان لا چکے تھے اس پر اس سے پہلے کہ میں نے تمہیں (مقابلہ کی) اجازت دی وہ تو تمہارا بڑا (گرو) ہے جس نے تمہیں سکھایا ہے جادو (کافن) ۱۔ تو میں قسم کھاتا ہوں کہ میں کاٹ ڈالوں گا تمہارے ہاتھ پاؤں یعنی ایک طرف کا ہاتھ ایک طرف کا پاؤں اور سولی چڑھاؤں گا تمہیں کھجور کے تنوں پر ۲۔ اور تم

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریہ) 2۔ الدر المنثور، جلد 4، صفحہ 541 (العلمیہ)

خوب جان لوگے کہ ہم میں سے کس کا عذاب شدید اور دیرپا ہے ۳؎ ''

۱؎ قال کا فاعل فرعون ہے۔ امنتم کو حفص نے خبر کے طور پر اور باقی قراء نے استفہام انکاری کے طور پر پڑھا ہے۔ اور امنا کا صلہ لام اس لئے استعمال فرمایا کیونکہ اس میں اتباع کا معنی پایا جاتا ہے (ایسی صورت کو علماء تضمین کہتے ہیں) موسیٰ کلیم تمہارا استاد ہے اور تم سب اس کے شاگرد ہو، ایمان تو تم میرے کہنے سے پہلے بھی لا چکے تھے۔ اس کا غلبہ ایک استاد اور لیڈر کی حیثیت سے ہوا ہے، نبوت کی وجہ سے یہ غلبہ نہیں ہے، اس نے خود تمہیں یہ جادو سکھایا اور تم نے جو کچھ کیا اس کی موافقت میں کیا یہ جملہ معترضہ ہے۔

۲؎ اس نے کہا میں تمہارا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ دوں گا۔ من ابتدائیہ ہے اور لا قطعن کے متعلق ہے۔ یا یہ ظرف مستقر ہے اور مصدر محذوف قطعاً کی صفت ہے۔ یعنی کاٹنا ایسا ہوگا کہ ہر عضو دوسرے عضو کے مخالف ہوگا۔ یعنی دائیں بائیں میں اختلاف ہوگا، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں ہوگا۔ یا من ایدیکم وار جلکم سے حال ہے۔ فی جذوع النخل فرمایا ہے حالانکہ مقام کے تقاضا کے مطابق علی ہونا چاہئے تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں مصلوب کے صلیب میں پوری طرح فٹ آنے کو تشبیہ دی گئی ہے اس چیز سے جو کسی برتن میں فٹ آتی ہے، یہاں اس نے کھجوروں سے سولی دینے کا ذکر کیا کیونکہ وہ لمبی ہوتی ہیں اور ان پر لٹکایا ہوا بندہ دور سے نظر آتا ہے۔

۳؎ اس وقت تمہاری آنکھیں کھلیں گی کہ رب موسیٰ پر ایمان لانے پر میں سخت اور دائمی عذاب دیتا ہوں یا موسیٰ کا رب ایمان نہ لانے پر زیادہ سخت عذاب دیتا ہے۔

قَالُوْا لَنْ نُّؤْثِرَكَ عَلٰى مَا جَآءَنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَ الَّذِيْ فَطَرَنَا فَاقْضِ مَآ اَنْتَ قَاضٍ ؕ اِنَّمَا تَقْضِيْ هٰذِهِ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَاؕ

''انہوں نے کہا (اے فرعون) ہمیں اس کی قسم جس نے ہمیں پیدا کیا ہم ہرگز ترجیح نہیں دیں گے۔ تجھے ان روشن دلیلوں پر جو ہمارے پاس آئی ہیں ۱؎ پس (ہمارے بارے میں) جو فیصلہ تو کرنا چاہتا ہے کردے (ہمیں ذرا پرواہ نہیں) ۲؎ تو صرف اس (فانی) دنیوی زندگی کے بارے میں ہی فیصلہ کرسکتا ہے ۳؎ ''

۱؎ البینٰت سے مراد واضح معجزات ہیں مثلاً ید بیضا اور عصا اور بعض علماء فرماتے ہیں البینٰت سے مراد دلالات ہیں، ان کی دلالات میں سے یہ تھا کہ انہوں نے کہا اگر موسیٰ جادوگر ہیں پھر ہماری رسیاں اور لاٹھیاں کیا ہیں۔ بعض فرماتے ہیں البینٰت سے مراد تبیین اور علم ہے۔ امام بغوی نے قاسم عن ابی بردہ سے روایت کیا ہے، فرماتے ہیں جب وہ جادوگر تو بہ کرنے کے لئے سجدہ میں گرے تو اس وقت تک سر نہ اٹھایا۔ جب تک کہ جنت اور دوزخ کو دیکھ نہ لیا۔ یا جنتیوں کے ثواب اور ان کی رفیع منازل کو دیکھ نہ لیا۔ یہ سب کچھ دیکھ کر انہوں نے فرعون کو کہا ہم تجھے ترجیح نہیں دیں گے (1) الخ۔

۲؎ الذی سے پہلے واؤ عاطفہ ہے۔ اور اس کا عطف ماجاءنا پر ہے یا واؤ قسمیہ ہے اور ما موصولہ اپنے صلہ کے ساتھ فاقض کا مفعول بہ ہے۔ یا یہ معنی کہ تو حکم دے تو حکم دینے والا ہے اس صورت میں اسم موصول مفعول مطلق ہوگا۔ اس معنی کے اعتبار سے مفعول بہ بنانا جائز نہیں ہے کیونکہ قضاء بمعنی حکم باء کے ساتھ متعدی ہوتا ہے اور یہاں بلہ کا حذف کرنا جائز نہیں ہے۔

۳؎ هذه الحياة الدنيا مضاف کے حذف کے ساتھ ظرف زمان ہے، یعنی تو نے جو کچھ کرنا ہے اس فانی اور عارضی زندگی میں کرنا ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریہ)

تیرا حکم اور تیری سلطانی عنقریب ختم ہو جائے گی۔ جو تیرے جی میں آتا ہے تو اسے کر گذر۔ اب ہم نے جو شراب حق کا جام لالہ فام نوش کیا ہے اسے تیری ان دھمکیوں کی ترشی کبھی نہیں اتار سکتی۔ بعض علماء فرماتے ہیں فرعون نے جو سولی چڑھانے اور ہاتھ پاؤں کاٹنے کی دھمکی دی تھی وہ اس نے پوری کی تھی اور سب سے پہلے ایسی سزا کا آغاز اس نے کیا تھا۔ یہ قول ابن جریر، ابن المنذر اور ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے نقل کیا ہے۔ بعض علماء نے لکھا ہے وہ اس کی دھمکی کو پورا نہ کر سکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اَنْتُمَا وَمَنِ اتَّبَعَكُمَا الْغٰلِبُوْنَ۔

إِنَّآ اٰمَنَّا بِرَبِّنَا لِيَغْفِرَ لَنَا خَطٰيٰنَا وَ مَآ اَكْرَهْتَنَا عَلَيْهِ مِنَ السِّحْرِ ؕ وَ اللّٰهُ خَيْرٌ وَّ اَبْقٰى ۝

''یقیناً ہم ایمان لائے ہیں اپنے رب پر تاکہ وہ بخش دے ہمارے لئے ہماری خطاؤں کو اور اس قصور کو بھی جس پر تم نے مجبور کیا ہے یعنی فن سحر ۱؎ اور اللہ تعالیٰ ہی سب سے بہتر ہے اور ہمیشہ رہنے والا ہے ۲؎''

۱؎ شراب حق سے مست ہو کر انہوں نے فرعون کی دھمکیاں سن کر کہا ہم تو اپنے پروردگار پر ایمان لے آئے ہیں تاکہ وہ ہمارے کفر و معاصی کو معاف فرما دے اور جس جادو پر تو ہمیں مجبور کرتا رہا اس کے گناہ پر بھی قلم عفو پھیر دے۔ یہ جملہ لن نؤثرک کے معنی کو پختہ کرنے کے لئے ہے۔ من السحر ما کا بیان ہے اور ضمیر مجرور سے حال ہونے کی بناء پر منصوب ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ یہ انہوں نے کیسے کہا ہے وما اکرھتنا علیہ (جس پر تو نے ہمیں مجبور کیا) حالانکہ وہ خود اپنی مرضی سے آئے تھے اور فرعون کی عزت کی قسم کھا کر انہوں نے کہا تھا کہ غلبہ ہمارا ہوگا۔ فرعون نے انہیں جادو سیکھنے پر مجبور نہیں کیا تھا۔ امام بغوی نے حضرت حسن سے روایت کیا ہے کہ فرعون لوگوں کو جادو سیکھنے پر مجبور کرتا تھا تاکہ جادو کی اصل باقی رہے، دنیا سے ختم نہ ہو جائے، اس نے ان لوگوں کو بھی ابتدا میں مجبور کیا تھا۔ مقاتل کہتے ہیں جادوگر بہتر تھے۔ دو قبطی تھے اور ستر بنی اسرائیل سے تھے۔ فرعون بنی اسرائیل کو مجبور کیا کرتا تھا کہ وہ جادو سیکھیں۔ تو ان کے قول ما اکرھتنا کا یہی مطلب ہے۔

عبد العزیز بن ابان کہتے ہیں کہ جادوگر نے فرعون سے کہا ہمیں پہلے موسیٰ کی زیارت کرا، جب وہ سویا ہوا ہو تو اس نے ان کو بلایا۔ موسیٰ علیہ السلام سو رہے تھے اور آپ کا ڈنڈا آپ کی حفاظت کر رہا تھا جادوگروں نے دیکھ کر کہا یہ جادو نہیں ہے کیونکہ جادوگر جب سوتا ہے تو اس کا جادو باطل ہو جاتا ہے لیکن فرعون نے انہیں مقابلہ پر مجبور کیا تو وما اکرھتنا کا یہی مفہوم ہے(1)۔

۲؎ انہوں نے کہا اللہ تعالیٰ تجھ سے بلکہ ساری مخلوق سے بہتر ثواب دینے والا ہے اسے جو ایمان لاتا ہے اور نیک اعمال کرتا ہے اور وہ تجھ سے اور ساری مخلوق سے دائمی عذاب دینے والا ہے اسے جو مجرم بن کر اس کی بارگاہ میں پیش ہوتا ہے۔ محمد بن اسحاق فرماتے ہیں یہ فرعون کے قول اَيُّنَآ اَشَدُّ عَذَابًا وَّ اَبْقٰى کا جواب ہے۔

إِنَّهٗ مَنْ يَّأْتِ رَبَّهٗ مُجْرِمًا فَإِنَّ لَهٗ جَهَنَّمَ ؕ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا وَ لَا يَحْيٰى ۝

''بیشک جو شخص بارگاہ الٰہی میں مجرم بن کر آئے تو اس کے لئے جہنم کا (شعلہ زار) ہے نہ وہ مر ہی سکے گا اس میں اور نہ وہ زندہ ہوگا ۱؎''

۱؎ یعنی جو کفر اور خداوند ذوالجلال کی نافرمانی کرتے ہوئے مرے گا تو اسے جہنم میں ڈالا جائے گا، جہاں نہ اسے موت آئے گی کہ وہ

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 222 (التجاریہ)

عذاب سے چھٹکارا پالے اور نہ اس میں اس کے لئے کچھ خوشگوار زندگی ہوگی۔

وَ مَنْ یَّاْتِهٖ مُؤْمِنًا قَدْ عَمِلَ الصّٰلِحٰتِ فَاُولٰٓىٕكَ لَهُمُ الدَّرَجٰتُ الْعُلٰى ﴿۷۵﴾

"اور جو شخص حاضر ہوگا بارگاہ الٰہی میں مومن بن کر اس حال میں کہ اس نے عمل بھی نیک کئے ہوں تو یہ وہ (سعادت مند) ہیں جن کے لئے بلند درجات ہیں [1]"

[1] قالون، ابوجعفر اور یعقوب نے یاته کو وصل میں همزه کے کسرہ کو اختلاس کے ساتھ پڑھا ہے اور ابوشعیب نے سکون کے ساتھ اور باقی قراء نے اشباع کے ساتھ پڑھا ہے۔

قد عمل الصالحت' مومناً کی ضمیر سے حال ہے۔ العلیٰ جمع ہے علیا کی۔

جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ وَ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا مَنْ تَزَكّٰى ﴿۷۶﴾

"یعنی سدا بہار باغات رواں ہیں جن کے نیچے نہریں وہ (خوش نصیب) ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ ہے جزاء ان کی جنہوں نے (اپنا دامن ہر آلائش سے) پاک رکھا [1]"

[1] جنت عدن' الدرجات سے بدل ہے یا عطف بیان ہے خالدین فیها لهم میں ضمیر مجرور سے حال ہے اور اس میں عامل اسم اشارہ کا معنی ہے یا الاستقرار ہے۔ مَنْ تزکیٰ سے مراد وہ نفوس ہیں جو گناہ اور کفر کی آلودگی سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں کلبی کہتے جو اپنے نفس کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور کلمہ طیبہ لا اله الا الله پڑھتے ہیں(1)۔ امام احمد' ترمذی' ابن ماجہ اور ابن حبان نے صحیح سند کے ساتھ حضرت ابوسعید الخدری سے اور طبرانی نے جابر بن سمرہ سے اور ابن عساکر نے ابن عمر اور حضرت ابوہریرہ سے روایت کیا ہے کہ تمام صحابہ فرماتے ہیں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا بلند درجات پر فائز اہل جنت کو نیچے والے ایسے دیکھیں گے جیسے تم آسمان کے افق پر چمکنے والے ستارے کو دیکھتے ہو' ابوبکر اور عمران بلند درجات والوں میں سے ہیں(2) امام احمد اور بخاری و مسلم نے حضرت ابوسعید سے اور ترمذی نے ابوھریرہ سے مرفوعاً نقل کی ہے کہ اہل جنت' بلند غرفات اور محلات والوں کو اس طرح دیکھیں گے جیسے تم مشرق و مغرب کے افق پر غروب ہونے والے ستارے کو دیکھتے ہو اور یہ اتنی دوری اور بلندی ان کے مراتب میں فرق کی وجہ سے ہوگی۔ صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ پھر انبیاء کی منازل کو تو کوئی دوسرا نہیں پا سکے گا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کیوں نہیں قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے وہ لوگ جو اللہ پر صدق دل سے ایمان لائے اور اس کے رسولوں کی تصدیق کی(3) (وہ انبیاء کے ساتھ ہوں گے) یہ تینوں آیات جادوگروں کے کلام ہونے کا بھی احتمال رکھتی ہیں کہ یہ ان کے قول وَاللّٰهُ خَیْرٌ وَّ اَبْقٰی کی علت ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ابتدائی کلام بھی ہو سکتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کی تصدیق فرما رہا ہے۔

وَ لَقَدْ اَوْحَیْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ۙ۬ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِیْ فَاضْرِبْ لَهُمْ طَرِیْقًا فِی الْبَحْرِ یَبَسًا ۙ لَّا تَخٰفُ دَرَكًا وَّ لَا تَخْشٰى ﴿۷۷﴾

"اور ہم نے وحی بھیجی موسیٰ (علیہ السلام) کی طرف کہ راتوں رات لے چلئے میرے بندوں کو (مصر سے) (راہ میں سمندر حائل ہو) تو عصا کی ضرب سے ان کے لئے سمندر میں خشک راستہ بنا لیجئے نہ تمھیں پیچھے سے پکڑے جانے کا ڈر

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (التجاریۃ) 2۔ معجم کبیر، جلد 2، صفحہ 254 (العلوم والحکم) 3۔ صحیح بخاری، جلد 1، صفحہ 416 (وزارت تعلیم)

ہوگا اور نہ کوئی اور اندیشہ لے۔"

لہ جب اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قوم کو ہلاک کرنے اور بنی اسرائیل کو اس کی قید سے آزاد کرنے کا ارادہ فرمایا تو موسیٰ علیہ السلام کو فرمایا کہ بنی اسرائیل کو راتوں رات مصر سے لے چلئے۔ اس جملہ کا عطف وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلَيْكَ مَرَّةً أُخْرَىٰ پر ہے۔ اس میں خطاب سے غیبۃ کی طرف التفات ہے۔ ما ضرب کا معنی یہاں اجعل ہے اور یہ عربوں کے اس قول سے ہے ضرب له من ما له سهماً (اس نے فلاں کے لئے اپنے مال سے حصہ مقرر کیا) یا یہ فاتخذ من ضرب اللبن سے ہے۔ (جب کوئی اینٹیں بنانے کا کام کرے) میں کہتا ہوں تقدیر کلام اس طرح بھی ممکن ہے فاضرب بعصاک البحر یکن طریقاً (یعنی اپنا عصا سمندر پر مارو تو راستہ ہو جائے گا) (پہلی دونوں صورتوں میں جب کہ فاضرب 'اجعل' اتخذ کے معنی میں ہو تو طریقاً مفعول به بنے گا اور مفسر کی تقدیر پر یکن محذوف کی خبر بنے گا) یبساً مصدر ہے اور طریقاً کی صفت کے طور پر ذکر کیا گیا ہے۔ جمہور قراء نے لا تخاف کو مرفوع پڑھا ہے۔ اور یہ جملہ اضرب کے فاعل سے حال یا طریقاً کی صفت ثانی کی حیثیت سے منصوب ہے۔ معنی یہ ہوگا تم سمندر پر ڈنڈا مارو دراں حالانکہ تم دشمن کے پکڑے جانے سے امن میں ہو اور سمندر میں ڈنڈا مار کر ایسا خشک راستہ بناؤ جو دشمن کے پکڑنے سے محفوظ ہے۔ حمزہ نے لاتخف یعنی جزم کے ساتھ نہی کا صیغہ پڑھا ہے یا جواب امر کی بناء پر مجزوم پڑھا ہے۔ لا تخشیٰ مستقل کلام ہے۔ اور اس کا عطف لا تخاف پر ہے اور اس کے آخر میں الف حمزہ کی قرأت پر اطلاق کے لئے ہے جیسے تظنون باللّٰہ الظنونا میں ہے یا یہ لاتخف کے فاعل سے حال ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے حکم الٰہی کے مطابق سمندر پر عصا مارا تو وہ پھٹ گیا اور اللہ تعالیٰ نے زمین کو بالکل خشک کر دیا اور وہ سب اس میں سے صحیح وسلامت گذر گئے۔

فَأَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ بِجُنُودِهِ فَغَشِيَهُم مِّنَ الْيَمِّ مَا غَشِيَهُمْ ﴿٧٨﴾

"پھر فرعون نے ان کا تعاقب کیا اپنے لشکروں سمیت پس چھا گئیں فرعونیوں پر سمندر کی (تند موجیں) جیسا کہ چھا گئیں ان پر لے"

لہ فاتبعهم محذوف کلام پر معطوف ہے۔ یعنی فاسری موسیٰ بقومه فاتبعهم بجنوده میں باء بمعنی مع ہے۔ یعنی جب فرعون کو خبر ہوئی کہ موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو رات کو لے کر نکل گئے ہیں تو اس نے اپنے لشکر کے ساتھ ان کا پیچھا کیا۔ بعض علماء فرماتے ہیں اتبع باب افعال ہے۔ لیکن بمعنی افتعال ہے اور باء تعدیہ کے لئے ہے۔ بعض علماء نے باء کو زائدہ لکھا ہے یعنی اس کے لشکر نے پیچھا کیا اس آخری تاویل کی بناء پر فرعون کی اپنی ذات کے نکلنے پر کوئی دلیل نہ ہوگی حالانکہ وہ خود بھی نکلا تھا۔ الیم کا معنی سمندر ہے۔ اور اس سے پہلے من بیانیہ یا تبعیضیہ ہے یہ ما غشیهم سے حال ہے۔ اس کلام میں مبالغہ ہے کہ ان پر سمندر کی موجیں اس طرح چھائیں کہ جن کی کیفیت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ غشیهم میں ضمیر منصوب فرعون اور اس کے لشکریوں کے لئے ہے۔ بعض علماء فرماتے ہیں پہلی ضمیر فرعون اور اس کے لشکر کے لئے ہے اور دوسری موسیٰ علیہ السلام اور آپ کی قوم کے لئے ہے۔ یعنی فرعون اور اس کے لشکر پر وہ سمندری موجیں چھا گئیں اور وہ سب کے سب غرق ہو گئے اور موسیٰ علیہ السلام اور ان کی قوم پر نہ چھائیں پس وہ نجات پا گئے۔

وَأَضَلَّ فِرْعَوْنُ قَوْمَهُ وَمَا هَدَىٰ ﴿٧٩﴾

"اور گمراہ کر دیا فرعون نے اپنی قوم کو اور نہ دکھائی انہیں سیدھی راہ لہ"

لے اس آیت کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ فرعون نے دین میں اپنی قوم کو گمراہ کیا اور انہیں سیدھی راہ نہ دکھائی، اس صورت میں اس کے قول وَمَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ کی تکذیب اور اس کا استہزاء ہے۔ یا یہ معنی کہ سمندر میں اس نے ان کو گم کر دیا اور خود بھی نجات نہ پا سکا۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ قَدْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ عَدُوِّكُمْ وَ وٰعَدْنٰكُمْ جَانِبَ الطُّوْرِ الْاَيْمَنَ وَ نَزَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَ السَّلْوٰى ۝

''اے بنی اسرائیل (دیکھو!) ہم نے بچا لیا تمہیں تمہارے دشمن سے اور ہم نے تم سے وعدہ کیا (کوہ) طور کی دائیں جانب کا اور ہم نے اتارا تم پر من وسلویٰ لے''

لے یا تو یہ خطاب ان بنی اسرائیل کو ہے جو عہد نبوی ﷺ میں موجود تھے اور ان کے آباء پر کئے جانے والے احسان کا تذکرہ کیا گیا ہے لیکن یہ سورت مکی ہے اور مکہ میں خطاب بنی اسرائیل سے نہیں قریش سے تھا۔ یا یہ خطاب ان سے ہے جن کو اللہ نے فرعون کو ہلاک کرنے کے بعد نجات عطا فرمائی تھی۔ اس صورت میں قلنا مقدر ہوگا اور یہ ایک سائل کے جواب میں ہے جو کہتا ہے کہ نجات کے بعد ان کے ساتھ کیا ہوا تھا۔ تو فرمایا ہم نے کہا اے بنی اسرائیل الخ۔ پہلی تقدیر کے اعتبار سے کم ضمیر سے پہلے مضاف محذوف ہوگا، یعنی ہم نے تمہارے آباء کو نجات دی۔ عدو سے مراد فرعون ہے جانب الطور ظرفیت کی بناء پر منصوب ہے۔ الا یمن جانب الطور کی صفت ہے اس کی وجہ ادنیٰ مناسبت ہے۔ کیونکہ وہ پہاڑ موسیٰ علیہ السلام کی دائیں جانب تھا ورنہ پہاڑ کی تو کوئی دائیں یا بائیں جانب نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے ہم کلام ہوئے، تورات عطا کرنے کا وعدہ کیا تھا اور فرمایا اپنی قوم کے چیدہ چیدہ ستر آدمی ساتھ لے آؤ ملابست اور قریبی تعلق کی بناء پر وعدہ کی نسبت لوگوں کی طرف کی گئی ہے حالانکہ وعدہ صرف موسیٰ علیہ السلام سے ہوا تھا۔

كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَ لَا تَطْغَوْا فِيْهِ فَيَحِلَّ عَلَيْكُمْ غَضَبِيْ ۚ وَ مَنْ يَّحْلِلْ عَلَيْهِ غَضَبِيْ فَقَدْ هَوٰى ۝

''کھاؤ ان پاک چیزوں سے جو ہم نے تم کو عطا کی ہیں اور اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا ورنہ اترے گا تم پر میرا غضب اور وہ بدنصیب اترتا ہے جس پر میرا غضب تو یقیناً وہ گر کر رہتا ہے لے''

لے قول کی تقدیر کے ساتھ کلوا نزلنا کے فاعل سے حال ہے۔ یا یہ جملہ مستانفہ ہے طیبات سے مراد لذائذ یا حلال چیزیں ہیں۔ مِنْ بیانیہ یا تبعیضیہ ہے۔ حمزہ اور کسائی نے انجیتکم و واعدتکم اور ما رزقتکم، یعنی واحد کا صیغہ پڑھا ہے اور باقی قراء نے بطور تعظیم نون اور الف کے ساتھ پڑھا ہے اور نزلنا میں کوئی اختلاف نہیں ہے کیونکہ وہ الف کے ساتھ لکھا ہوا ہے۔ لَا تَطْغَوْا کا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو میں نے تمہیں مال و دولت عطا کیا ہے اس کو استعمال کر کے شکر میں کوتاہی نہ کرنا اور اسراف، کنجوسی، تکبر اور حقدار کو حق عطا نہ کر کے حد سے تجاوز نہ کرنا۔ کسائی اور اعمش نے یحل کو حلہ کے ضمہ کے ساتھ اور من یحلل کو لام کے ضمہ کے ساتھ باب نصر ینصر حلول سے مشتق کر کے پڑھا ہے جس کا معنی نزول ہے۔ باقی قراء نے یحل کی حاء کو اور یحلل میں لام کو کسرہ کے ساتھ باب ضرب یضرب سے پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ حَلَّ الدین سے مشتق ہوگا۔ جس کا معنی قرض کی ادائیگی کا واجب ہونا ہے۔ یعنی جس پر غضب الٰہی کا کوڑا برسے گا وہ آگ کے گڑھے میں گرے گا۔

وَ اِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَ اٰمَنَ وَ عَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی ﴿۸۲﴾

''اور میں بلاشبہ بہت بخشنے والا ہوں اسے جو توبہ کرتا ہے اور ایمان لاتا ہے اور نیک عمل کرتا ہے بعد ازاں ہدایت پر مستحکم رہتا ہے [1]''

[1] فرمایا جو شرک سے توبہ کرے، اللہ اور اس کے رسول جو کچھ لے کر آئے اس پر ایمان لائے اور اللہ کریم نے جو احکام دیئے ہیں ان پر عمل پیرا ہو اور پھر ہدایت پر قائم و دائم رہے تو میں اللہ اس کے پہلے سارے گناہوں کو بخشنے والا ہوں۔ ثم اھتدی کے معنی میں اختلاف ہے، عطاء نے ابن عباس سے یہ نقل کیا ہے کہ وہ ایمان لانے اور نیک عمل کی توفیق اللہ کریم کی طرف سے سمجھے۔ قتادہ اور سفیان الثوری فرماتے اسلام کو لازم پکڑے رکھے اور اس پر ہی اسے موت آئے۔ الشعبی مقاتل اور کلبی کہتے ہیں اس نے جان لیا کہ اس عمل کا مجھے ثواب ملے گا۔ زید بن اسلم فرماتے ہیں اس نے علم سیکھا تاکہ اسے یہ معلوم ہو جائے کہ کیسے عمل کرتا ہے۔ الضحاک فرماتے ہیں۔ وہ ہدایت مذکورہ پر مستحکم رہا۔ سعید بن جبیر فرماتے ہیں پھر وہ سنت اور جماعت پر قائم رہا (1) میرے نزدیک اس کا یہ معنی کہ پھر اسے اللہ کے قرب کی راہ ملی جو بلا کیف ہے اور قرب کے بلند مدارج تک پہنچنے کا راستہ ملا۔

وَ مَاۤ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ یٰمُوْسٰی ﴿۸۳﴾

''اور کس وجہ سے تم جلدی آگئے اپنی قوم سے اے موسیٰ [1]''

[1] یہ موسیٰ علیہ السلام کو خطاب ہے اور بنی اسرائیل کے خطاب انجینا کم پر معطوف ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے ستر افراد منتخب فرمائے تاکہ وہ آپ کے ساتھ طور پر چلیں اور تورات لے آئیں۔ موسیٰ علیہ السلام رب کریم کے شوق و محبت میں ان کو چھوڑ کر پہلے طور پر پہنچ گئے اور انہیں فرمایا کہ تم میرے پیچھے پہاڑ پر آ جانا۔ موسیٰ علیہ السلام کے جلدی پہنچنے پر اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ سے پوچھا کہ جلدی کیسے آ گئے (2)۔ میں کہتا ہوں یہ سوال بطور تقریر ہے جیسے محبوب محب کو انتہائی جذب و شوق کی کیفیت میں دیکھ کر پوچھتا ہے آپ کیسے آئے اور محبوب کی غرض یہ ہوتی ہے کہ محب اپنے عشق و شوق کا اظہار کرے۔ لیکن ساتھیوں کو چھوڑ کر آنے کی وجہ سے کچھ انکار بھی فرمایا۔ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو امروں کی طرف سے جواب دیا اور انکار کے جواب کو مقدم فرمایا کیونکہ وہ اہم تھا۔

قَالَ هُمْ اُولَآءِ عَلٰۤی اَثَرِیْ وَ عَجِلْتُ اِلَیْكَ رَبِّ لِتَرْضٰی ﴿۸۴﴾

''عرض کی وہ یہ ہیں میرے پیچھے اور میں جلدی جلدی تیری بارگاہ میں اس لئے حاضر ہو گیا ہوں میرے رب کہ تو راضی ہو جائے [1]''

[1] موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے میرے پروردگار وہ مجھ سے چند ہی قدم پیچھے ہیں۔ میرے اور ان کے درمیان کچھ زیادہ مسافت نہیں ہے، وہی تھوڑا سا فاصلہ جو عام طور پر قافلہ کے افراد میں ہوتا ہے۔ عجلت کا عطف ھُمْ اُوْلَاۗءِ پر ہے۔ یا قد مقدر کے ساتھ حال ہے۔ الیک سے مراد وہ مکان ہے۔ جس پر اللہ نے ان پر تجلیات ڈالنے اور کلام کا شرف بخشنے کا وعدہ فرمایا تھا رب اصل میں یا ربی تھا۔ بعض علماء فرماتے ہیں لترضی کا مطلب یہ ہے کہ تیرے حکم کو جلدی پورا کرنا اور تیرے عہد کو نبھانا تیری رضا کے حصول کا باعث بنتا ہے، اسی لئے میں نے جلدی کی۔ میں کہتا ہوں لترضی کا مطلب یہ ہے کہ تیری غایت محبت اور ملاقات کے اشتیاق اور

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 223 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً

تیری کلام کو سننے کے ذوق کی وجہ سے میں نے جلدی کی جیسا کہ محبوب کی ملاقات کے وقت کی قربت کا تقاضا ہے اور یہ محبت وشوق تیری رضا کا مقتضی ہے۔

وعدہ وصل چوں شود نزدیک آتش عشق تیز گردد

جب وصل ووصال کا وعدہ نزدیک آتا جاتا ہے، عشق کی آگ مزید تیز تر ہوتی جاتی ہے۔

قَالَ فَإِنَّا قَدْ فَتَنَّا قَوْمَكَ مِنْۢ بَعْدِكَ وَ أَضَلَّهُمُ السَّامِرِيُّ ﴿۸۵﴾

''ارشاد ہوا کہ ہم نے تو آزمائش میں مبتلا کر دیا تمہاری قوم کو تمہارے (چلے آنے کے) بعد[1] اور گمراہ کر دیا ہے انہیں سامری نے[2]''

[1] فتن سے مراد آزمائش میں ڈالنا یا گمراہ کرنا ہے، یعنی ہم نے بچھڑے کے اظہار کے ساتھ انہیں آزمایا کہ یہ اس کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں۔ یا یہ معنی کہ ہم نے انہیں بچھڑے کی عبادت کی وجہ سے گمراہ کر دیا۔ اگر یہ سوال کیا جائے کہ فانا قد فتنا عجلت الیک پر مرتب ہے۔ تو ظاہر کلام کا تقاضا یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا جلدی آنا فتنہ کا سبب بنا کیونکہ فاء سببیہ ہے۔ تو اس میں سببیت کی وجہ کیا ہے؟

میں کہتا ہوں شاید یہ وجہ ہو کہ انبیاء علیہم السلام کو مخلوق خدا کی دو طرح سے ہدایت کرنے کے لئے بھیجا جاتا ہے، ایک ظاہراً وہ انہیں اسلام کی دعوت دیں اور اسلامی احکام سے انہیں آگاہی بخشیں۔ دوسرا باطناً کہ مخلوق کو اللہ کی طرف اس طرح کھینچنا کہ وہ باقی سب مخلوق سے کٹ جائیں اور ان کے دلوں پر ایمان اور معرفت کے نور کا فیضان فرمائیں تاکہ ایمان کے لئے ان کے سینے کھل جائیں اور حق کو حق اور باطل کو باطل دیکھیں اور یہ کام اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک کہ انبیاء کرام پوری توجہ مخلوق خدا کی طرف نہ فرمائیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام شوق دیدار الٰہی میں طور پر جلدی آ گئے تو ان کی باطنی توجہ امت سے کٹ گئی جس کی وجہ سے امت فتنہ اور ضلال میں مبتلا ہو گئی (اس لئے فاء نا کی فاء کو سببیہ بنانا درست ہے اور اس کلام کو عجلت پر مرتب کرنا بھی صحیح ہے)

اسی وجہ سے بعض صوفیاء فرماتے ہیں الولایة افضل من النبوة۔ بعض علماء نے صوفیاء کے اس قول کی یہ تفسیر کی ہے کہ نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہے۔ فرمایا ولایت کے نبوت سے افضل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ولایت کا مقتضیٰ ہر وقت یاد الٰہی میں مستغرق رہنا اور ہر لحہ اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ رہنا ہے جب کہ نبوت کا مقتضیٰ یہ ہے کہ وہ مخلوق کی طرف متوجہ رہے (یعنی ان کی ظاہری و باطنی صفائی میں مصروف رہے) لیکن تحقیق وہ ہے جو حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے، وہ فرماتے ہیں نبوت مطلقاً ولایت سے افضل ہے کیونکہ ولایت تجلیات صفاتیہ سے عبارت ہے، جب کہ نبوت تجلیات ذاتیہ سے معنون ہے، اس لئے کہاں ذات اور کہاں صفات ان کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں نبوت اور ولایت ہر ایک کے لئے عروج اور نزول ہے۔ صوفی مرتبہ عروج میں اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ کمال حاصل کرے اور مرتبہ نزول میں مخلوق کی طرف متوجہ ہوتا ہے تاکہ مخلوق کی تکمیل کرے (یعنی ناقصوں کو کامل بنائے اور کاملوں کو راہنما بنائے) لیکن ولایت کی نسبت میں ولی کا عروج صفات کی طرف ہوتا ہے ذات کی طرف نہیں ہوتا (یعنی وہ صرف صفات کی سیر کرتا ہے ذات تک اس کی رسائی نہیں ہوتی (جب کہ نبی کا عروج ذات کی طرف ہوتا ہے) اور ولی نزول کے وقت مبدء فیض کی طرف متوجہ ہوتا ہے مخلوق کی طرف کلیۃً متوجہ نہیں ہوتا۔ اور نبوت نزول کے وقت بالکلیہ مخلوق کی طرف متوجہ ہوتی ہے۔ اس حالت میں وہ ظاہراً اللہ تعالیٰ سے اپنے آپ کو منقطع

دیکھتا ہے اور یہ کیفیت اس کے لئے انتہائی شاق اور گراں ہوتی ہے، انتہائی مشقت اور تنگی میں ہوتا ہے۔ لیکن حقیقت میں وہ اس کیفیت میں اللہ سے منقطع نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی طرف بھی متوجہ ہوتا ہے۔ اس کا سینہ گنجینہ ان دونوں جہتوں کا جامع ہوتا ہے بلکہ جب وہ اللہ تعالیٰ کے اذن اور اس کے حکم سے ہی مخلوق کی طرف متوجہ ہے تو حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہے۔ اسی وجہ سے اس سیر کو سیر اً من اللہ باللہ کہا جاتا ہے۔ فانی فی الوصال عبید نفسی و فی الھجران مولیٰ للموالی۔ میں وصال میں اپنے نفس کا ایک ادنیٰ غلام ہوتا ہوں اور ہجر میں سرداروں کا سردار ہوتا ہوں۔ ہم نے سورۂ اَلَمْ نَشْرَحْ میں فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا ۙ اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا کی تفسیر کے تحت اس مسئلہ کو پوری شرح وبسط سے لکھا ہے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تورات عطاء کرنے اور وعدہ پورا کرنے کے بعد فرمایا ہو کہ اپنی قوم کے پاس جاؤ۔ ہم نے اسے آزمائش میں ڈال دیا ہے۔

۳۔ اللہ تعالیٰ نے فتنہ اور ضلال کی نسبت اپنی طرف کی کیونکہ ضلالت خود ہی اس نے ان میں پیدا فرمائی تھی اور سامری میں اضلال کا فعل بھی خود اس نے پیدا فرمایا تھا۔ اور سامری کی طرف اضلال کی نسبت فرمائی کیونکہ اضلال کا کسب اس نے کیا تھا اور اس نے لوگوں کو بچھڑے کی پوجا کی طرف بلایا تھا۔ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ چھ لاکھ افراد بچھڑے کی عبادت میں مبتلا ہوئے تھے، صرف بارہ ہزار افراد اس گمراہی سے بچے تھے(1)۔ قاموس میں ہے کہ سامری یہ کرمان کا کافر تھا یا بنی اسرائیل کا سردار تھا اور سامرجگہ کی طرف منسوب ہے(2) امام بیضاوی فرماتے ہیں بنی اسرائیل کے ایک قبیلہ کی طرف منسوب ہے جسے سامرہ کہا جاتا تھا۔ اس سامری کا اصل نام موسیٰ بن ظفر تھا اور یہ منافق تھا(3)۔

فَرَجَعَ مُوْسٰۤى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۚ قَالَ یٰقَوْمِ اَلَمْ یَعِدْكُمْ رَبُّكُمْ وَعْدًا حَسَنًا ۚ اَفَطَالَ عَلَیْكُمُ الْعَهْدُ اَمْ اَرَدْتُّمْ اَنْ یَّحِلَّ عَلَیْكُمْ غَضَبٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَخْلَفْتُمْ مَّوْعِدِیْ ﴿۸۶﴾

"(یہ سنتے ہی) لوٹے موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کی طرف غضبناک اور افسردہ خاطر ہو کر فرمایا اے میری قوم! کیا وعدہ نہیں کیا تھا تم سے تمہارے رب نے بہت عمدہ وعدہ ۱؎ تو کیا طویل مدت گذر گئی ہے اس وعدہ پر (اور تم اس کے ایفاء سے مایوس ہو گئے) یا تم یہ چاہتے ہو کہ اترے تم پر غضب تمہارے رب کی طرف سے اس لئے تم نے توڑ ڈالا میرے ساتھ کیا ہوا وعدہ ۲؎ "

۱؎ چالیس دن پورے کرنے اور تورات لینے کے بعد موسیٰ علیہ السلام قوم کے فعل پر بڑے غصہ اور اضطراب میں واپس پلٹے۔ وعداً مصدر کی بناء پر منصوب ہے یا مفعولیت کی بناء پر منصوب ہے اس بناء پر کہ وعدہ بمعنی الموعود ہے۔

۲؎ افطال میں استفہام انکاری ہے۔ اور فاء عاطفہ ہے۔ اور عطف محذوف کلام پر ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہے اتاتوھم بمصاحبتی ایاکم فامنتم باللہ وحدہ وعدتمونی ان تکونوا بعدی علی ذالک فطال علیکم العھد۔ تمام قراء نے یحل کو باب ضرب یضرب سے حاء کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا تمہاری حماقت کی بھی کوئی حد ہے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (التجاریۃ) 2۔ القاموس المحیط، جلد 1، صفحہ 577 (التراث العربی)
3۔ تفسیر بیضاوی مع حاشیہ شیخ زادہ، جلد 5، صفحہ 648 (العلمیۃ)

کہ تم نے ایسے کام کا ارادہ کیا ہے جو غضب الٰہی کا موجب ہے اور میرے ساتھ جو تم نے ایمان پر ثابت قدم رہنے اور میرے احکام کی بجا آوری کا وعدہ کیا تھا، اسے تم نے پس پشت ڈال دیا۔

قَالُوْا مَآ اَخْلَفْنَا مَوْعِدَكَ بِمَلْكِنَا وَ لٰكِنَّا حُمِّلْنَآ اَوْزَارًا مِّنْ زِيْنَةِ الْقَوْمِ فَقَذَفْنٰهَا فَكَذٰلِكَ اَلْقَى السَّامِرِيُّ ﴿٨٧﴾

''کہنے لگے نہیں توڑا ہم نے آپ سے کیا ہوا وعدہ اپنے اختیار سے [1]۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ ہم پر لاد دیئے گئے تھے بوجھ قوم (فرعون) کے زیورات سے [2]۔ سو ہم نے (سامری کے کہنے پر) انہیں پھینک دیا [3]۔ اسی طرح سامری نے بھی (اپنے حصہ کے زیور) پھینک دیئے [4]۔''

[1] ملکنا کو نافع، ابوجعفر اور عاصم نے میم کے فتحہ کے ساتھ پڑھا ہے، حمزہ اور کسائی نے میم کے ضمہ کے ساتھ اور باقی قراء نے میم کے کسرہ کے ساتھ پڑھا ہے۔ ملکت الشی کے مصدر میں یہ ساری لغتیں موجود ہیں، یعنی جب انسان اللہ کی طرف کسی مصیبت یا فتنہ میں مبتلا ہوتا ہے، اپنے آپ کا کچھ مالک و مختار نہیں ہوتا۔ قاموس میں بھی یہی معنی لکھا ہے۔

[2] حملنا کو نافع، ابن کثیر اور حفص نے حاء کے ضمہ اور میم کے کسرہ اور تشدید کے ساتھ مجہول کا صیغہ پڑھا ہے۔ ابوعمر، حمزہ، کسائی، یعقوب اور ابوبکر نے حاء کے فتحہ اور میم کی تخفیف کے ساتھ پڑھا ہے اوزاراً سے مراد بوجھ ہیں۔ من زینۃ القوم اوزار کی صفت ہے۔ یہ وہ زیورات تھے جو شادی کے بہانے فرعونیوں سے بنی اسرائیل نے عاریۃً لیئے تھے اور یہ اس رات لئے تھے جس رات مصر سے کوچ کرنے کا ارادہ تھا۔ عبد بن حمید، ابن ابی حاتم نے ابن عباس سے اسی طرح روایت کیا ہے۔ امام بغوی فرماتے ہیں ان زیورات کو انہوں نے اوزار (بوجھ) اس لئے کہا تھا کیونکہ وہ انہوں نے عاریۃً لئے تھے اور پھر واپس نہیں کئے تھے (1)۔ بعض علماء فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے جب فرعونیوں کو غرق کیا تو سمندر نے ان کے زیورات باہر پھینک دیئے تھے اور بنی اسرائیل نے اٹھا لیئے تھے اور یہ مال غنیمت تھے اور اس زمانہ میں مال غنیمت کا استعمال حلال نہیں تھا، اس وجہ سے انہوں نے ان زیورات کو اوزار کہا۔

[3] امام بغوی فرماتے ہیں انہوں نے اپنے زیورات ایک گڑھے میں پھینکے تھے، یہ مشورہ انہیں سامری نے دیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی واپسی تک ان زیورات کو اس گڑھے میں پھینک دو۔ سدی فرماتے ہیں یہ بات انہیں حضرت ہارون نے فرمائی تھی کہ مال غنیمت حلال نہیں اس لئے ایک گڑھا کھودو اور اس میں تمام زیورات پھینک دو۔ موسیٰ علیہ السلام واپس تشریف لائیں گے جو چاہیں گے حکم فرمائیں گے (2)۔

[4] سامری کے پاس جو زیورات تھے وہ اس نے بھی پھینک دیئے۔ سعید بن جبیر نے ابن عباس سے روایت کیا ہے کہ ہارون علیہ السلام نے آگ جلائی اور فرمایا جو کچھ تمہارے پاس فرعونیوں کے زیورات ہیں اس میں پھینک دو، تو تمام نے پھینک دیئے۔ پھر سامری کے پاس جو جبرئیل امین کے گھوڑے کے پاؤں کی مٹی تھی وہ اس نے پھینکی۔ قتادہ فرماتے ہیں کچھ مٹی اس نے اپنے عمامہ میں رکھ لی تھی (3)۔

فَاَخْرَجَ لَهُمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ خُوَارٌ فَقَالُوْا هٰذَآ اِلٰهُكُمْ وَ اِلٰهُ مُوْسٰى ۙ فَنَسِيَ ﴿٨٨﴾

''پھر سامری نے بنا نکالا ان کے لئے بچھڑے کا ڈھانچہ جو گائے کی طرح ڈکارتا تھا پھر سامری اور اس کے چیلوں نے

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 224 (التجاریۃ) 2۔ ایضاً 3۔ ایضاً

کہا (اے فرزندان یعقوب) یہ ہے تمہارا خدا اور موسیٰ کا خدا پس موسیٰ بھول گئے [1]''

[1] اخرج کا فاعل سامری ہے۔ لھم ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہیں۔ جسداً عجلاً سے بدل ہے له خوار عجلاً کی صفت ہے سامری اور اس کے چیلوں نے کہا موسیٰ السلام اس خدا کو یہاں چھوڑ کر طور پر تلاش کرنے گئے ہیں یا یہ معنی کہ موسیٰ علیہ السلام پہلے جس ایمان پر قائم تھے وہ انہوں نے ترک کر دیا ہے اور اللہ کا انکار کر دیا ہے۔

اَفَلَا يَرَوْنَ اَلَّا يَرْجِعُ اِلَيْهِمْ قَوْلًا ۙ وَّ لَا يَمْلِكُ لَهُمْ ضَرًّا وَّ لَا نَفْعًا ﴿۸۹﴾

'' کیا ان احمقوں نے یہ بھی نہ دیکھا کہ یہ بچھڑا ان کی کسی بات کا جواب بھی نہیں دے سکتا اور نہ اختیار رکھتا ہے ان کے لئے کسی ضرر کا اور نہ نفع کا [1]''

[1] استفهام انکاری ہے اور جملہ محذوف کلام پر معطوف ہے، تقدیر عبارت اس طرح ہوگی الا ینظرون فلا یرون یا تقدیر عبارت اس طرح ہوگی اقروا بالوهيتها فلا يعلمون هذا الحمقاء (یعنی کیا انہوں نے اس بچھڑے کی الوہیت کا اقرار کیا یہ احمق اتنا بھی نہیں جانتے) ان لا یرجع میں ان مخففہ من مثقلہ ہے، اس کا اسم ضمیر شان محذوف ہے۔ یعنی انه لا يرجع ذالک العجل یعنی وہ تو ان کی بات کا جواب ہی نہیں دیتا اور نہ ان سے ابتداء کلام کرتا ہے۔ پس جب وہ ان سے کم درجہ ہے تو انہوں نے اسے کیسے اپنا معبود بنا لیا؟ نہ تو وہ انہیں کچھ نفع دے سکتا ہے اور نہ نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع ونقصان ان سے روک سکتا ہے پھر یہ عبادت کا مستحق کیسے بن گیا ہے؟ امام بغوی نے لکھا ہے کہ بعض علماء فرماتے ہیں حضرت ہارون علیہ السلام سامری کے پاس سے گذرے، وہ بچھڑے کا ڈھانچہ تراش رہا تھا۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے؟ سامری نے کہا میں ایک ایسی چیز بنا رہا ہوں جو نفع دے گی، نقصان نہ دے گی، آپ میرے لئے دعا فرمائیں۔ حضرت ہارون نے دعا فرمائی اے اللہ اسے اپنی خواہش کے مطابق وہ عطاء فرما۔ پس سامری نے بچھڑے کے منہ میں جبرئیل کے گھوڑے کے پاؤں سے لگی مٹی ڈالی تو وہ بیل کی طرح ڈکارنے لگا۔ یہ حضرت ہارون کی دعا سے سب کچھ ہوا تھا لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک آزمائش تھی جس سے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو آزمایا تھا(1)۔

وَ لَقَدْ قَالَ لَهُمْ هٰرُوْنُ مِنْ قَبْلُ يٰقَوْمِ اِنَّمَا فُتِنْتُمْ بِهٖ ۚ وَ اِنَّ رَبَّكُمُ الرَّحْمٰنُ فَاتَّبِعُوْنِيْ وَ اَطِيْعُوْۤا اَمْرِيْ ﴿۹۰﴾

'' اور بے شک کہا تھا انہیں ہارون نے (موسیٰ کی واپسی سے پہلے) اے میری قوم تم تو فتنہ میں مبتلا ہو گئے اس سے اور بلاشبہ تمہارا رب تو وہ ہے جو بے حد مہربان ہے پس تم میری پیروی کرو اور میرا حکم مانو [1]''

[1] لقد الخ محذوف قسم کا جواب ہے اور یہ جملہ وَ لَقَدْ اَوْحَيْنَاۤ اِلٰى مُوْسٰۤى ۙ اَنْ اَسْرِ بِعِبَادِيْ پر معطوف ہے۔ حضرت ہارون نے فرمایا اے میری قوم تمہیں بچھڑے کے ذریعے آزمائش میں ڈالا گیا ہے کہ تم توحید پر ثابت قدم رہتے ہو یا گمراہ ہو جاتے ہو۔ تمہارا پروردگار رحمٰن ہے، تمہارا اپنا وجود اور اس کی نشوونما کے لئے یہ رنگارنگ کائنات اس کی رحمت بے پایاں کا اثر ہے، اسی پر ثابت قدم رہو اور بچھڑے کی عبادت سے انکار میں میرے حکم کی اطاعت کرو۔ فاتبعونی پر فاء سببیہ ہے۔ کیونکہ اس کا ماقبل مابعد کا سبب ہے۔

قَالُوْا لَنْ نَّبْرَحَ عَلَيْهِ عٰكِفِيْنَ حَتّٰى يَرْجِعَ اِلَيْنَا مُوْسٰى ﴿۹۱﴾

1۔ تفسیر بغوی، جلد 4، صفحہ 225 (التجاریہ)